

خواتین اور بچوں کے لیے اپنی طرف کا پہلا ماہنامہ

خواتین کا جامع سہ ماہی

اپریل 2019

ساگر نمبر

<https://reading.caretofun.net/>



نظمیں غزلیں

- 232 مبارک صدیقی غزل
233 فیاض وید غزل
232 سیاس گل نظم
233 جمیل الدین عالی غزل

رنگارنگ پہول

- 234 شگفتہ خواہ رنگارنگ سلسلہ
250 واصفہ سہیل خیریں ویریں

میری بیاض سے

- 237 خالدہ جیلانی آپ کی بیاض سے

پکوان

- 254 خالدہ جیلانی موسم کے پکوان
253 تبسم بشیر آپ کا باور کی خانہ

نفسیات

- 256 عدستان نفسیاتی اور ادبی تجزیں

ناول

- 208 عیو احمد الف
168 نسو احمد صالم

کمال ناول

- 106 عینہ زید الٹی دلی دھار
34 نعیم ناز ڈرامے بازار

ناولٹ

- 80 منگت سیمہ مات
146 انشین نعیم اکرم بکرم

افسانے

- 67 عارفہ تنویر خواب خواہش زندگی
102 استغفریہ خواہش جواب

- 140 عطیہ خالد خجالہ
163 عطاغ شیخ انوکھے رویے

- 198 سحر ساجد سیرہ

- 12 مسیر کہنی سنتی
13 اداوت کرن کرن روشنی
242 نادر خاتون ہمارے نام

آپ سے کیا پردہ

- 18 انشاجی ہمیں تم پہ گمان

خاتون کی فائری

- 252 امت الصبور میری ڈائری سے

مجموع سے ملے

- 238 شایین رشید باتیں انجم فیاض سے

انٹرویو

- 24 رانو دستک بہار کی
19 شایین رشید راحت جیس سے ملاقات
31 سید حمید میری خواہش

- 258 بیوٹی بکس بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور

اپریل 2019

جلد 46 نمبر 12

قیمت 70 روپے

خداوند کرامت کا پتہ: خواجہ ڈاکٹر، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر اور دواغ: ان حسن پرہنگ بریس سے مجبور کرنا شروع کیا۔ مقام: 91-1 بلاک 40، قصبہ آہار، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

ماہنامہ خواجہ ڈاکٹر اور ادارہ خواجہ ڈاکٹر کے تحت شائع ہونے والے راج ماہنامہ شائع ہوتا ہے کہ ان میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ خواجہ ڈاکٹر ہیں۔ کسی بھی فرد اور ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی شکل میں ڈیجیٹل یا فزیکل شکل میں کاپی یا نقل یا دوبارہ شائع یا ہر طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ کا نقل یا ہر طرح کے استعمال ممنوع ہے۔

تو مجھے جو ذرا کچھ بھی راجہ سیریں اور جنگ لڑا تھے۔ انگوٹھیں لگا لی تھیں اور لہجہ جہاں آپ کے سامنے ہے۔ قسمت کے لمحات کا تو قصہ ہی نہیں رہا۔ سارا وقت انٹر نیٹ کی وی پیمنٹوں، فون پر بات چیت اور دیگر سرگرمیوں کی غمزدہ حالت میں گزرتا رہا۔ لیکن آج سے نصف صدی قبل کی دنیا کا قصہ تو مجھے اس وقت بہت بخیر ملتا ہے، مگر انٹر نیٹ نہ رہا بلکہ ذرا ایسے وقت تک تک کہ جلتا تھا۔ خواہش کی دنیا اور انجی عہد میں درہم پار کی دنیا سے لاکھوں کی آبادیوں تک عہد و قیاس۔ ان میں تخلیقی صلاحیتیں تو کم تھیں لیکن انہیں سامنے لانا اور دنیا سے منوانے کے لیے لڑنا تو کسی کوئی ذریعہ نہ تھا۔

غواہین کے گھمبیراں میں نکلتے تھے لیکن وہ وقت کے تقاضوں سے کم ہو چکا تھا۔
عمو وراثت مناصب کے خاہن کا تخت کا اڑا لیا اور ان کے خوش فہم خود تھاکر ایک ایسا بجا و حرف تبریع، طبع
اور وقت گزاری کے لیے نہ ہو۔ بلکہ تبریع کے ساتھ ساتھ کم عمر لڑکیوں کو زندگی کی چٹائیوں اور حقیقتوں سے بھی روشناس
کرا سکے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور احسان ہے کہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ خواتین ڈائجسٹ نے خواتین میں صرف مطالعہ کا شوق ہی نہیں بیدار کیا بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارا اور سامنے لائے گئے فریضہ سر انجام دیا۔ خواتین ڈائجسٹ کا سالانہ نمبر جس خدمت ہے۔

[illegible]

کے سواں دن۔ وہ دن بھی بڑا دلچسپ رہا۔ اس دن اور پندرہویں دن میں ہم اپنی قاریں اور اصحابیت ہم اپنی قاریں کا بھی مشاعرہ ادا کر دیے۔ یہ مشاعرہ ہماری قاریوں ہمارا انڈیا تھا۔ ہمیں بہت ذہین اور اصحابیت قاریوں کا سامنا ملا۔ ان کے ذہن کا رخ کتب خانہ کی چابی تھانہ کی زینت اور ملا حیت کے گواہ تھے۔ محمود باغن صاحب، محمود باغن فیصل، محمود خاں اور ہماری بہت سی معتمدین جو آج ہمارے ساتھ تھیں، ان کے لیے دُعا کی معذرت۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں ملگے رکھے۔ آمین۔

آپ کی پسندیدہ معتقد سمیرا کا مکمل ناول اس ماہ شاف میں ہو سکا۔ ان کا ناول آٹھ ماہ ماراگر ممبران میں شاف ہو گا
ان شاء اللہ۔

۱۔ اثنی واک دھار۔ غیر سیدہ یا مکمل ناول، ۲۔ ڈولے باز۔ غیر باز یا مکمل ناول،
۳۔ عیرو احمد اور نیر احمد کے ناول، ۴۔ گیمت سہا اور افشین نعم کے ناول،
۵۔ عریبا۔ عاشقہ خیر، عطیہ نالہ اور عزت عزیز خاں عفاف شیخ کے ناول،
۶۔ آپ کا لینڈ وہ معجزہ راحت ہمیں سے ملاقات، ۷۔ دستک بہار کی۔ سالگرہ منہ کا خصوصی سروس،
۸۔ کلن کرنا درختی۔ امامت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، ۹۔ باقیں، اعم فیاض سے،
۱۰۔ نفسانی اندواج، فحش اور دیگر متعلق سلسلہ شامل ہیں۔
سالگرہ منہ کے بارے میں خط لکھ کر اپنی رائے سے مزور فرمائیے گا۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور احووری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور یرمگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

७५)

نکاح کی طاقت رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ شادی کر لے اس کی وجہ سے نظر چھپی رہتی ہے اور جسم (بدکاری) سے محفوظ رہتا ہے اور جسے (نکاح) کی طاقت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ، خواہش کو چلنے دیتا ہے۔“

فوائد مسائل: 1-

گزرے وقتوں کی یاد سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آپ پہلے ازدواجی زندگی گزار رہے تھے اور اطمینان و مسرت کا وقت گزار رہا تھا، اب پھر آپ کو شادی کی ضرورت ہے تاکہ آپ کو دوبارہ وہی خوشی و رعبی اطمینان و سکون حاصل ہو جس کا حصول شادی کے بغیر ممکن نہیں۔

2- شادی شدہ زندگی میں میاں بیوی کی عمر میں تفاوت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ اگر چنی ہوئی عورت کا عمر مرد اس قابل ہو کہ اپنی بیوی کی طری ضروریات خوش اسلوبی سے پوری کر سکے تو بیڑ عمر مرد کم عمر عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔

3- تین افراد میں سے دو افراد کو تیسرے سے الگ رکے بات چیت کرنا منع ہے لیکن اگر تیسرے آدمی

نکاح کی فضیلت

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔ "میں منیٰ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں الگ لے گئے، میں پاس بیٹھا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا۔

”کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ میں ایک کنواری لڑکی سے آپ کی شادی کروادوں جس سے آپ کو گزرتے وقت کی کچھ باتیں یاد آجائیں؟“

جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ حضرت عثمان بن رضی اللہ عنہ کو اس کے سوا اور کوئی کام نہیں جس کے لیے وہ انہیں الگ لے گئے تھے (تو مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں حاضر ہوا تو وہ فرما رہے تھے۔

”اگر آپ نے یہ بات کہی تو (اچھی بات ہی ہے کیونکہ) رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”اے جو انوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص

کی دل شکنی کا اندیشہ نہ ہو تو بعض حالات میں اس کی منعکاش ہے، ویسے بھی مذکورہ بالا واقعہ میں دونوں کے الگ ہو جانے کے باوجود حضرت علقمہ رحمۃ اللہ اتنے دور نہیں تھے کہ ان کی بات چیت نہ کن سکیں۔

4- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس وقت نکاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس لیے انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ لڑکی والوں سے رابطہ قائم کیا جائے، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی، خیر خواہی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فرمادیا کہ نکاح واقعی ایک اہم اور مفید چیز ہے۔

5- نکاح کی طاقت رکھنے کا مطلب جنسانی طور پر نکاح کے قابل ہونا اور مالی طور پر بیوی کے لازمی اخراجات پورے کرنے کے قابل ہونا ہے۔ موجودہ معاشرے میں رائج رسم درود اچ پر کیے جانے والے بے جا اخراجات کی طاقت مراد نہیں۔ معاشرے سے ان فضول رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

6- نکاح کا سب سے بڑا فائدہ گناہ کی زندگی سے حفاظت اور جنسی خواہشات کی جائز ذریعے سے تکمیل ہے۔ نکاح کرتے وقت یہ مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے دوسرے فوائد خود ہی حاصل ہو جائیں گے۔

7- فحاشی سے بچاؤ اسلامی معاشرے کی ایک اہم خوبی ہے، اس کے حصول کے لیے ہر جائز ذریعہ اختیار کرنا چاہیے اور فحاشی کا ہر راستہ بند کرنا چاہیے۔

8- اسلامی شریعت کی یہ خوبی ہے کہ یہ انسان کی فطرت کے مطالبات کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کے حصول کے جائز ذرائع مہیا کرتی ہے۔

9- روزہ رکھ کر انسان نامناسب خیالات اور جذبات کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے فطری خواہش بھی بے لگام نہیں ہوتی، اس لیے اگر کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کی شادی میں کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے اور جذبات میں بھجان پیدا کرنے والے ماحول، اس قسم کے لڑچر کے مطالعے، جذبات انگیز نعیمات سننے اور فلمیں وغیرہ دیکھنے سے پرہیز کرے

تاکہ جوانی کا جوش، گناہ میں ملوث نہ کر سکے۔

نکاح سنت ہے

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”نکاح میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقے پر عمل نہیں کرتا اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔ شادیاں کیا کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی بنا پر دوسری امتوں پر فخر کروں گا، جو (مالی طور پر) استطاعت رکھتا ہو، وہ (ضرور) نکاح کرے اور جسے (رشتہ) نہ ملے، وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ خواہش کو دہل دیتا ہے۔“

فوائد و مسائل:-

1- نکاح میرا طریقہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل دعیال والی زندگی گزارنا اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کا طریقہ ہے کہ ان کے ہاں غیر شادی شدہ زندگی گزارنا اور بزم خوش عبادت و ریاضت میں مشغول رہنا افضل اور قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔

2- نکاح کا ایک روحانی فائدہ یہ بھی ہے کہ اولاد کی صحیح تربیت کر کے انہیں اسلامی معاشرے کے مفید ارکان بنانا بھی ایک اہم دینی خدمت ہے اور دوسروں کو اچھے کاموں کی ترغیب دلانے سے خود سیدھی راہ پر گامزن رہنا آسان ہو جاتا ہے۔

3- مسلمانوں کے لیے اولاد کی کثرت شرعاً مطلوب ہے لہذا اس کے لیے کوشش کرنا یعنی نکاح کرنا اور ازواجی تعلقات قائم رکھنا بھی شرعاً محسن ہے۔

4- نکاح روحانی ترقی میں رکاوٹ نہیں۔

محبت رکھنے والوں کے لیے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”آپس میں محبت رکھنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔“

فوائد و مسائل:-

1- دو خاندانوں میں دوستانہ تعلقات ہوں تو

انہیں قائم رکھنے اور مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے سے رشتہ لینا دینا چاہیے۔

2- کسی مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جائے تو باخارجہ تعلقات قائم کرنے کے بجائے نکاح کا جائز تعلق قائم کر لینا بہتر ہے تاہم اس میں نکاح کی دیگر شرائط، یعنی عورت کے سرپرست کی اجازت، حق مهر، ایجاب و قبول اور گواہوں کی موجودگی وغیرہ کا پایا جانا ضروری ہے۔

بے نکاح رہنا منع ہے

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بے نکاح رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اجازت دے دیتے تو ہم لوگ فحشی ہو جاتیں۔“ بخاری۔

فوائد و مسائل:-

1- حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ عبادت کا بہت شوق رکھتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ نکاح کر کے بیوی بچوں کے معاملات میں مشغول ہوئے سے نقلی عبادات، یعنی نقلی نماز روزے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں، اس لیے بہتر ہے نکاح نہ کیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بے نکاح رہنے کی اجازت نہ دی۔

2- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بوجھتے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے کیونکہ ممکن ہے ایک کام بظاہر نیکی کا ہو اور بہت اچھا معلوم ہوتا ہو لیکن شریعت کی رو سے وہ صحیح نہ ہو۔

3- بدعت بھی بظاہر نیکی ہوتی ہے لیکن اس کے ظاہری نیکی ہونے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ خلاف سنت کام کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو، اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

4- اللہ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ہندو جوگیوں یا عیسائی راہبوں کی طرح حلال

چیزوں سے بھی پرہیز کیا جائے بلکہ کھانے، پینے اور دیگر معاملات میں شرعی ہدایات پر عمل کرنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نکاح رہنے سے منع فرمایا۔

فوائد و مسائل:-

1- بے نکاح رہنے کو نیکی سمجھنا غلط ہے، خواہ یہ تصوف کے نام پر ہو یا قلندر کی کے نام پر یا کسی اور نام سے۔

2- نکاح تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

3- انبیاء کرام نورانی مخلوق نہیں بلکہ اشرف المخلوقات ہیں۔ اس لیے وہ نکاح بھی کرتے تھے اور ان کی اولاد بھی ہوتی تھی۔

خاندان پر بیوی کے حقوق

حضرت حکیم بن معاویہ اپنے والد حضرت معاویہ (ابن حنیہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

”خاندان پر عورت کا کیا حق ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جب کھانا کھائے تو اسے بھی کھائے، جب پکڑا اپنے تو اسے بھی پہنائے، چہرے پر نہ مارے، اسے برا بھلا نہ کہے اور گھر ہی میں (اس سے) علیحدگی اختیار کیے رکھے۔“

فوائد و مسائل:-

1- اسلام نے معاشرے کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ہر فرد کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا ہے۔ ان کو پیش نظر رکھ کر معاشرے میں امن قائم کیا جاسکتا ہے۔

2- جس طرح مردوں کے حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ ۲: ۲۲۸)

ترجمہ: ”اور دستور کے مطابق عورتوں کے لیے

مردوں پر دیئے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں۔“

3- گھر میں امن و سکون قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں۔

عورت کی بنیادی ضروریات، یعنی خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ مہیا کرنا مرد کا فرض ہے۔

4- مرد کو حق حاصل ہے کہ عورت کو غلطی پر مناسب تنبیہ کرے۔

5- اگر معمولی تنبیہ کا اثر نہ ہو تو معمولی ہی جسمانی سزا بھی دی جاسکتی ہے لیکن چہرے پر مارنا منع ہے۔

لا یضرب کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ڈانٹنے وقت نامناسب الفاظ استعمال نہ کرے، جیسے عربوں میں

رواج تھا کہ وہ کہتے: "بح اللہ و بھک" اللہ تیرے چہرے کو بچ کر دے۔ "یا فبحک اللہ" اللہ تجھے بد صورت کر دے۔" اس طرح کی گالی اور بددعا سے

ایعتاب کرنا چاہیے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ چہرے پر نہ مارے، زور سے مارنے سے چہرے پر نشان پڑ جائے گا اور چہرہ بد صورت ہو جائے گا، اس لیے

فرمایا کہ اسے بد صورت نہ بناوے۔

6- تنبیہ کے لیے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے وقتی طور پر بول چال بند کرنا جائز ہے لیکن بیوی کو گھر سے نکال دینا یا خود سے کسی دن کے لیے باہر چلے جانا

مناسب نہیں۔ گھر میں دونوں کی موجودگی سے ناراضی جلد دور ہو جانے کی امید ہوتی ہے۔

عورتوں کے حقوق

حضرت محمد بن احمد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے۔ (اس دوران میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد و ثناء کی اور وعظ و نصیحت فرمائی (اس میں آپ نے کئی باتیں ارشاد فرمائیں) پھر فرمایا۔

”عورتوں کے بارے میں خبر کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ تمہیں ان پر اس کے سوا کوئی اختیار نہیں۔“ (یہ کہ وہ واضح ہے

شرعی کا کوئی کام کریں، اگر وہ ایسی حرکت کریں تو ان سے بستروں میں الگ ہو جاؤ اور انہیں بارہا شکن سخت پلائی نہ ہو۔) (اس تنبیہ کے نتیجے میں) اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگ جائیں تو ان پر (خفی کرنے کی) راہ تلاش نہ کرو یقیناً تمہاری عورتوں پر تمہارا حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔

تمہاری عورتوں پر تمہارا حق تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر اسے نہ بٹھائیں جس (کے گھر میں آنے) کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھر میں اس فرد کو آنے کی اجازت نہ دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ سنو! تم پر عورتوں کا حق ہے کہ ان کے لباس اور خوراک کے بارے میں ان سے اچھا سلوک کرو۔“

فوائد و مسائل:

1- وصیت تاکیدی نصیحت کو کہتے ہیں جس پر عمل کرنا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ”وصیت قبول کرو“ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں۔ بہت سے صحابہ کرام جو حجۃ الوداع میں حاضر تھے، ان کے لیے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وہ آخری ملاقات ہو کیونکہ اس سے تین ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس واد فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے لیے یہ خطبہ واقعی آخری نصیحت (وصیت) بن گیا۔

2- خطاب اگر حجۃ الوداع میں حاضر ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا گیا تھا، تاہم یہ حکم قیامت تک آنے والے تمام مومنوں کے لیے ہے۔

3- مرد کو چاہیے کہ بیوی کے اخلاق و کردار کی نگرانی کرے، تاہم بلاوجہ مشکوک و شبہات میں مبتلا رہنا درست نہیں، جب تک کوئی واضح مشکوک صورت سامنے نہ آئے۔

4- واضح ہے حیاتی سے مراد ایسی حرکات ہیں جن پر روک ٹوک نہ کرنے سے بدکاری تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ زنا کا ارتکاب ہو جانے کی صورت میں دوسرے احکام ہیں جو قرآن وحدیث میں اپنے

مقام پر مذکور ہیں۔

5- جب محسوس ہو کہ عورت اپنی غلطی پر پشیمان ہے اور اصلاح پر آمادہ ہے تو اس سے معمول کے تعلقات قائم کر لینے چاہئیں اور بار بار گزشتہ غلطیوں کا طعنہ نہیں دینا چاہیے۔

6- بعض اوقات صورت حال اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ جسمانی سزا ناگزیر ہو جاتی ہے لیکن یہ اصلاح کی کوشش کا آخری درجہ ہے، جہاں تک ممکن ہو، معاملات کو اس مرحلے پر نہیں پہنچنے دینا چاہیے۔

7- اگر جسمانی سزا ضروری محسوس ہو تو اس میں بھی نرمی کا پہلو مد نظر ہونا چاہیے یعنی صرف اس حد تک سختی کی جائے یا سزا دی جائے جو تنبیہ کے لیے ضروری ہو، اس سے زیادہ نہیں کیونکہ مقصود اصلاح ہے، غصہ نکالنا یا بدلہ لینا نہیں۔

8- مہمانوں کی تکریم ضروری ہے لیکن اگر کوئی ایسا شخص آتا ہے جسے خاوند اچھا نہیں سمجھتا تو عورت کو چاہیے کہ خاوند کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے اسے اجازت دینے سے معذرت کر لے یا کہہ دے کہ مرد گھر میں نہیں، پھر آجایے گا۔

9- ناپسندیدہ شخص کو بستر پر نہ بٹھانے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے غیر مردوں سے ناجائز تعلقات استوار کرنے کی راہ ہموار نہ کی جائے۔ ان سے نرم لہجے میں ٹپس ٹپس کر بات کرنے کے بجائے سنجیدگی سے مختصر بات کر کے فارغ کر دیا جائے۔

ابام خطابی فرماتے ہیں۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی مردوں کو کپ شپ کے لیے اپنے پاس گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں، جیسے عرب میں یہ رواج تھا اور اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد اس سے منع کر دیا گیا۔“ (حاشیہ سنن ابن ماجہ از محمد نواد عبد الباقی)۔ ہمارے ہاں دیہات میں، جہاں پردے کا اہتمام نہیں کیا جاتا اب بھی یہ صورت حال موجود ہے جو شرعی طور پر ممنوع ہے۔

10- بعض علماء نے فرمایا کہ عورت اپنے محرم رشتہ داروں کو بھی خاوند کی اجازت کے بغیر گھر میں نہ

آنے دے لیکن زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاوند کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ عورت کے محرم مردوں پر پابندی لگائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے رضاعی چچا کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”وہ تمہارا چچا ہے، اسے آنے کی اجازت دو۔“

لباس اور خوراک کے بارے میں اچھا سلوک یہ ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اچھا لباس اور مناسب خوراک مہیا کرے لیکن ایسے لباس سے منع کرنا چاہیے جو شریعت کی تعلیمات کے مطابق نہ ہو۔

شوہر کی خوشنودی

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے۔

”جو عورت اس حال میں فوت ہوئی کہ اس کا خاوند اس سے خوش تھا تو وہ جنت میں جائے گی۔“

بہترین عورت

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”دنیا (عارضی) فائدے کی چیز ہے اور دنیا کے ساز و سامان میں نیک عورت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔“

فوائد و مسائل:

1- دنیا کی چیزوں سے حلال طریقے سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔ ترک دنیا جائز نہیں۔

2- دنیا کی چیزیں اس انداز سے استعمال کرنی چاہئیں کہ آخرت میں فائدہ حاصل ہو۔

3- نیک عورت ایک بڑی نعمت ہے کیونکہ وہ دنیا کے معاملات میں بھی اچھی مشیر ثابت ہوتی ہے، اچھی شریک حیات ہوتی ہے اور آخرت کے معاملات میں بھی خاوند سے تعاون کرتی ہے۔ اس طرح دونوں کو بلند درجات حاصل ہو جاتے ہیں۔

4- نیک مرد بھی عورت کے لیے ایک ایسی ہی نعمت ہے۔

راحت جگہ کی تلاش

شاہین رشید

مزاج کی ہم آہنگی نے زندگی کے سفر کو آسان کر دیا۔ پھر ہماری زندگی میں بنی جیسی "رحمت" بھی آگئی۔ ایجوکیشن کے ذکر کے بغیر میری زندگی ناممکن ہے۔ بڑی ہو رہی ہے تو لگتا ہے کہ پہلی بنی جارہی ہے۔

میری بیٹی ماشاء اللہ 13 برس کی ہو گئی ہے۔ آٹھویں کلاس میں پڑھتی ہے۔ اور میں جس مہینے میں پیدا ہوئی وہ شاعروں کا پسندیدہ مہینہ ہے میں 6 دسمبر کو پیدا ہوئی۔ اور میں اکتا مہینے یا اگست بڑی میں ایم اے کرنا چاہ رہی تھی۔ تو میں جب "بی ایڈ" کر رہی تھی تو ہمارے ایک پروفیسر نے مشورہ دیا کہ "بیٹا آپ کو اردو میں ایم اے کرنا چاہیے۔ ان ہی کے کہنے پر میں نے "ایم اے اردو کیا۔"

والدین اپنے بچوں کے نام رکھنے میں بہت چوڑی ہوتے ہیں یا تو بہت چھان بین کے بعد رکھتے ہیں یا جو فریڈ چل رہا ہوتا ہے رکھ لیتے ہیں۔ آپ کے نام کا کیا پیک گراؤنڈ ہے؟

"تاریخ بتاتی ہے کہ جس دن میں پیدا ہوئی تھی اس دن مغل کے کسی تھانے دار کے گھر میں لاہور سے ایک بچی سہمان آئی تھی جو کہ بہت پیاری اور کیوتھی تھی، جب اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے راحت جنیں بتایا تو باجیوں نے بڑے پیار سے اور بڑے اہتمام سے میرا نام "راحت جنیں" رکھ دیا۔ میں آج بھی ان کو چھٹری ہوں کہ اگر اس زمانے میں ہمارے گھر میں فی دی ہوتا تو یقیناً میرا نام "راحت کاظمی" رکھا جاتا۔"

"قلم سے آپ کا رشتہ کتنا پرانا ہے کب اور اک ہوا کہ آپ لکھ سکتی ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ اور اک ہمیں بعد میں ہوا تھا

خواتین ڈائجسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آج فی دی پڑھتے بھی ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں ان میں تقریباً اسی فیصد رائٹرز خواتین ڈائجسٹ کی لکھاری ہیں۔ ان ہی مصنفین میں راحت جنیں بھی شامل ہیں جو کہ کامیاب ڈراما سیریلز لکھ چکی ہیں اور حال ہی میں ان کا سیریل "تاوان" اختتام پذیر ہوا ہے۔

"کیا حال ہیں راحت صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"بہت اچھی لکھاری ہیں جو بھی لکھا"

وہ سب ہی پسند کیا گیا۔ جو آپ کو پڑھتے ہیں اور جو آپ کے ڈرامے دیکھتے ہیں آپ کے بارے میں جانتا بھی چاہتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے تو آپ اپنا جی بیک گراؤنڈ بتائیے؟

"جب بھی کوئی مجھ سے میری جائے پیدائش کے بارے میں سوال پوچھتا ہے تو میری نظروں کے سامنے ساجد وال والا وہ گھر گھوم جاتا ہے۔ نہر کا ٹیل عبور کرتے ہی سبز دروازہ اور کھڑکیوں والا سفید گھر اس کے سامنے تین "دیم" اور کچھ چین کے درخت تھے۔ کیونکہ اس وقت آبادی اتنی نہیں تھی۔ ابا سرکاری ملازم ہیں اور امی گھریلو خاتون، ہم چھ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ میرا نمبر پانچواں ہے اور بھائی مجھ سے بڑا ہے۔ اسی کو بہت شوق تھا کہ ان کی اولاد پڑھے لکھے، ابا نے بھی سب وسائل فراہم کیے۔ میں نے "جی" سے "ایم اے" تک کی ساری تعلیم ساجد وال سے حاصل کی۔ 2005ء میں میری شادی ہوئی اور میں "چھپو وطنی" آگئی۔ اسلم صاحب نمبر دار زمین دار اور سیاست دان ہیں۔

ہمیں تم پر گمان و حسرت تھا

انشائی

ہمیں تم پر گمان و حسرت تھا، ہم لوگوں کو رسوا کیا تم نے ابھی فصل لگوں کی نہیں گزری، کیوں دامن چاک سیاتم نے

اس شہر کے لوگ بڑے ہی سخی، بڑا مان کریں درویشوں کا برقم سے تولتے برہم ہیں، کیا ان کے مانگ لیا تم نے؟

کن راہوں سے ہو کر آئی ہو، کس گلی کا سندس لائی ہو ہم بارہا میں خوش خوش بیٹھے تھے، کیا کر دیا اے کہ صبا تم نے

غم عشق میں کاری دوائے دُعا، یہ ہے روگ کُشن یہ ہے درد بڑا ہم کرتے جو اپنے سے ہو سکتا، کبھی ہم سے بھی کچھ نہ کہا تم نے

جو قیس غریب تھے ان کا جنوں بھی کہتے ہیں ہم سے رہا ہے فزول ہمیں دیکھ کے ہنس تو دیا تم نے، کبھی دیکھے ہیں اہل وفا تم نے؟

اب رہو ماندہ سے کچھ نہ کہو، لو تھی شاد رہو، آباد رہو بڑی دیر سے یاد کیا تم نے، بڑی دُور سے دی ہے صدا تم نے

اک بات کہیں گے انشائی، تمہیں رشتہ کہتے عمر ہوئی تم ایک جہاں کا علم پٹھے، کوئی میرا شعر کہا تم نے

اور لکھنا ہم نے پہلے شروع کر دیا تھا۔۔۔۔۔ کہانیاں پڑھنے اور کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔۔۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے بھائی عمران سریر اور انسپٹر جشد سریر لے کر آیا کرتے تھے اور ہماری ایک چھوٹی بیٹھک ہوا کرتی تھی جہاں ہم چھپ چھپ کر پڑھا کرتے تھے اور نوائے وقت اخبار کے ساتھ بچوں کا ایک ایڈیشن آیا کرتا تھا ”پھول اور کلیاں“ کے نام سے وہ بھی ہم بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔۔۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن اچانک ہی آنی نے کہا کہ ”یہ بچہ بھی تو لکھتے ہیں تو ہم کیوں نہیں لکھ سکتے۔ ہم بھی لکھ کر دیکھتے ہیں“ پھر ہم نے اپنی ہوم ورک کا پی سے پرچے بھاڑے اور جلدی جلدی ایک کہانی لکھ کر چھپنے کے لیے بھیج بھی دی۔ اور بالکل بھی نہیں پتا تھا کہ اگلے دو ہفتوں میں وہ کہانی چھپ بھی جائے گی۔۔۔۔۔

”لکھنے کا ہنر دورے میں ملا؟ حوصلہ افزائی ہوئی؟“

”شور کوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ریت کے ٹیلوں پر بیٹھ کر چاندنی راتوں میں شاید میری ماں نے کہانیاں لکھری تھیں۔ کیونکہ ہمیں ہمیشہ سے لگتا ہے کہ ہم بہنوں میں لکھنے کی صلاحیت ماں کی طرف سے آئی۔۔۔۔۔ انہیں بہت شوق تھا کہ میری بیٹیاں پڑھیں لکھیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور کچھ بین کے دکھائیں۔۔۔۔۔ اور ہم انہیں جب بھی کچھ لکھتی تھیں۔ ای ابو بہت خوش ہوتے تھے، کوئی مابندی نہیں تھی بہت حوصلہ افزائی کی اور ہمارا نام دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔۔۔۔۔ ہم نے بھی اپنے ماں باپ سے چھپ کر نہیں لکھا بلکہ کہانیاں لکھ کر ہم پہلے انہیں سنایا کرتے تھے۔“

”افسانہ یا ناول کب لکھنا شروع کیا؟“

”میشرک میں جب تھی تو بچوں کے رسالوں میں کافی حد تک ہمارا نام بن چکا تھا، لوگ بہت اصرار سے اور بہت پیار سے ہماری تحریر شائع بھی کر رہے تھے۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ پہلا افسانہ میں نے بہت

کے لیے لکھا تھا اور لکھنے کے بعد جب خود پڑھا تو مجھے لگا کہ کچھ کسر باقی ہے اور یہ شائع نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ پھر ایک سال تک میں نے کچھ نہیں لکھا اور پڑھنے پر زیادہ زور دیا۔“

”پھر ڈائجسٹ تک رسائی کیسے ہوئی؟“

”ہمارے گھر میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ آیا کرتے تھے اور ہم بہت اہتمام اور شوق سے پڑھا کرتے تھے اور ہماری خواہش تھی کہ ہم ان ڈائجسٹوں میں لکھیں۔۔۔۔۔ ان دنوں عاصم علی ان ڈائجسٹوں میں لکھا کرتی تھیں تو بڑی خواہش تھی کہ ان کے جیسا نہ صرف لکھیں بلکہ ان کے ساتھ میرا نام بھی آئے۔ تو پہلی تحریر شعاع کے لیے لکھی ”اک کی سی رہ گئی ہے۔“ اور اللہ کا شکر کہ وہ بھیجے کے ایک ماہ بعد ہی شائع ہو گئی پھر دوسرا افسانہ خواتین ڈائجسٹ کے لیے لکھا ”بھی چاہتوں کو ثبات ہے۔“ وہ بھی جلدی ہی شائع ہو گیا۔ یوں ان دونوں ڈائجسٹوں میں میری ایٹری ہو گئی۔

”کچھ معاوضہ یا اعزاز یہ بھی ملا؟ یا یہ خوش تھی کہ ڈائجسٹ میں نام آ گیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ لکھنے کا ”اعزاز“ یہ بھی ملتا ہے، سہ پہر کا وقت تھا چا چا جی آئے ہوئے تھے گاؤں سے اور ڈائیکے نے جب مجھے بارہ سو کا منی آرڈر دیا تو میری مٹی مگر گئی تھی سو سو اور دس دس کے نوٹوں سے اور چا چا جی کہہ رہے تھے کہ ”اوہ راحت تو امیر ہو گئی ہے“ اور مجھے واقعی لگ رہا تھا کہ میں بہت امیر ہوئی ہوں۔“

”بھی احساس ہوا کہ جو رائٹر لکھ رہی ہیں میں ان جیسا یا ان سے اچھا لکھ سکتی ہوں؟“

”نہیں، ایسا احساس بھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ بلکہ مجھے ہمیشہ یہی لگا کہ سب رائٹر مجھ سے زیادہ اچھا لکھتی ہیں اور جن دنوں میں نے لکھنا شروع کیا ان دنوں ڈائجسٹ میں اتنی بھی ہوئی اور اتنی بہترین رائٹر لکھ رہی تھیں کہ یہ سوچنا کہ میں ان سے بہتر لکھ سکتی ہوں نا ممکن ہی تھا۔ بس یہ خواہش تھی کہ ان کے درمیان نہیں چھوٹا موٹا منا سامنا ہمارا بھی آ جائے۔۔۔۔۔ ہاں میری

خواہش تھی کہ میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد جیسا لکھوں لیکن جب میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان کے جیسا نہیں لکھ سکتی۔“

”بھی کسی نے فرمائش کر کے آپ سے ناول لکھوایا؟ اور بھی ہانڈی جلی یا دوپٹہ جلا پلاٹ سوچتے ہوئے؟“

”جی بالکل کچھ ناؤں ایسے ہیں جو فرمائش کر کے لکھوائے گئے تھے اور کچھ ناؤں ایسے بھی تھے جو میں نے حقیقی کرداروں پر لکھے تھے۔۔۔۔۔ ہانڈی تو بھی نہیں جلی۔۔۔۔۔ البتہ دودھ کا کڑا ابل جاتا ہے۔“

”لکھنے کا بہترین نام آپ کے لیے کون سا ہے؟ اور پلاٹ کی آمد کب ہوئی ہے؟ اور کہاں ہوئی ہے۔ نماز میں یا دوش روم میں؟“

”بہتے ہوئے“ ”بھی آمد ہے۔ کہیں بھی اور کسی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ میرے ساتھ ایک بار ایسا ہوا ہے کہ میرا ایک ناول ہے ”سفر تمام ہوا“ جو کہ مجھے ذاتی طور پر بھی بہت پسند ہے۔ اس کا پلاٹ نماز کے دوران ذہن میں آیا اور نہ صرف پلاٹ بلکہ پورا کا پورا آئیڈیا آغاز سے لے کر انجام تک سب میرے ذہن میں آیا۔۔۔۔۔ اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نماز کی آخری رکعت پڑھ رہی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر میں نے نماز کو دوبارہ پڑھا اور اللہ سے بہت معافی بھی مانگی کہ دنیاوی کام ہے اور پتا نہیں کس طرح میرے ذہن میں آ گیا۔۔۔۔۔ تو ہو جاتا ہے ایسا۔۔۔۔۔ اور جہاں تک لکھنے کے نام کی بات کر رہی ہیں تو اگر کہانی ذہن میں پتا نہ ہے تو میں کسی بھی وقت کسی جگہ پر لکھ سکتی ہوں لی دی دیکھتے ہوئے بھی لکھ لکھتی ہوں۔ ویسے زیادہ تر دل یہ چاہتا ہے کہ جب گھر میں سکون ہو اور مجھے کوئی بھی ڈسٹر ب کرنے والا نہ ہو اس وقت لکھوں خواہ کوئی بھی نام ہو۔“

”افسانوں اور ناولوں میں جو ہر دو آپ رائٹر ڈکھاتی ہیں کیا اصل زندگی میں آپ کو ایسا ہیر دلا؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ میری زندگی میں آنے والا میرا شوہر، میرے لائف پارٹنر میں وہ ساری

خصوصیات شامل ہیں جو میں اپنے ہیر وز کے لیے لکھا کرتی تھی۔۔۔۔۔ خوش مزاج، سادہ مزاج، عزت کرنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔۔۔۔۔ اگر میں کسی فلمی ہیر کو ذہن میں لائے بغیر ان کا حلیہ پتاؤں تو چھ فٹ سے لگتا ہوا قد اور کبھی موچکوں تلے سرکراتے لب اور کانٹن کے کلف لگے پڑے۔۔۔۔۔ میں نے بھی بھی بانی فانی ہیر نہیں دکھائے بلکہ عام زندگی میں ہمارے گھروں میں موجود ہمارے بھائی، باپ جیسے ہوتے ہیں اور میرے ہیر و سادہ مزاج ہوتے ہیں۔“

”اگلی آپ نے ذکر کیا نماز میں پلاٹ آنے کا۔۔۔۔۔ تو وہ کون سا ناول تھا جو نماز پڑھنے کے دوران مکمل ہوا آپ کے ذہن میں؟“

”میرے اس ناول کا نام ”سفر تمام ہوا“ تھا اور ”رجیا“ ایک نیم پاگل لڑکی کا کردار تھا۔۔۔۔۔ اس ناول کو بہت لوگوں نے پسند کیا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اسٹیل آپ نے اس ناول کی تعریف کے لیے مجھے دوبار فون کیا تھا۔“

”لی دی کی طرف آ جائیں آپ۔۔۔۔۔ لی دی تک رسائی کیسے ہوئی بلانی لکھنا یا خود لکھیں؟“

”آپ مجھے کم ہمت کہہ سکتے ہیں یا اتنا پرست کہ میں خود سے تو کہہ ہی نہیں سکتی تھی کہ میں ڈراما لکھنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ ایک دن ”ہم لی دی“ کی طرف سے ایک لیٹر ملا کہ ہم آپ کے ناول ”زرد موسم“ پر ڈراما سیریل بنانا چاہتے ہیں۔ آپ ہم سے رابطہ کریں۔۔۔۔۔ پھر پتا چلا کہ ”زرد موسم“ کے لیے مجھے دو سال سے ڈھونڈا جا رہا تھا مگر میرا کالیکٹ نمبر نہیں مل رہا تھا۔“

”پہلا سیریل تو ”زرد موسم“ تھا۔ اس کے علاوہ کیا لکھا اور کیا لکھ رہی ہیں؟“

”جی۔۔۔۔۔ پہلا سیریل ”زرد موسم“ تھا اس کے بعد ہم لی دی سے ہی ”کرب“ ”کچھ نہ ہو“ اور تادان تو حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ جو کے لیے ”ساری بھول ہماری“ اسے پلس کے لیے ”بیگا گئی“ اور اسے آروانی کے لیے ”میرے ہم نوا“ اور ”شکوہ نہیں کسی سے“ ”آن ایر ہوا آج کل آن ایر کوئی نہیں ہے البتہ دو

پروجنک انڈر پروفیشن ہیں۔ بہت زیادہ نہیں لکھ رہی۔ بس اتنا ہی لکھتی ہوں جس سے میں مطمئن رہوں اور یہ نہیں کہوں گی کہ میں نے کوئی سپر ہٹ ڈرامے دیے ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے جتنا بھی لکھا اور جتنا بھی آن ایئر آیا اسے لوگوں نے بہت سراہا۔

”ڈراموں میں آپ رائٹر مسائل کو اچھوتوں کو بڑی مہارت سے حل کر لیتی ہیں۔ عام زندگی میں کیا صورت حال ہے؟“

”لکھنے میں اور عام زندگی میں فرق ہے اور تھوڑا نہیں بہت فرق ہے۔ قلم آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے زندگی کو آپ جو چاہیں موڑ دے دیں۔ عام زندگی میں آپ صرف کوشش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد فیصلہ قسمت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اللہ نے اتنی صلاحیت دی ہے کہ میں چیزوں کو ہینڈل کر لیتی ہوں مگر برداشت اور تحمل کے ساتھ تو اُزن کے ساتھ۔ تو پھر چیزیں میرے حق میں ہو جاتی ہیں۔ الحمد للہ۔“

”رائٹر بہت محنت سے لکھتی ہیں۔ لوگ دیکھتے بھی شوق سے ہیں ڈراموں کی کہانیاں بھی لوگوں کو یاد رہ جاتی ہیں۔ مگر رائٹر کا نام کسی کو بلکہ اکثریت کو معلوم نہیں ہوتا۔ تو افسوس ہوتا ہے؟“

”ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے عام قاری بھی بھی بھی رائٹر کا نام نہیں دیکھتا۔ ہماری کہانیاں عام طور پر مشہور ہوتی ہیں ہمارے کرداروں کی وجہ سے، اسی طرح ڈراموں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ کردار یاد رہ جاتے ہیں۔ کہانی یاد رہ جاتی ہے مگر رائٹر ذہن میں نہیں ہوتا۔ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں رائٹر کی اس حوالے سے شاید اتنی دیکھو نہیں ہے کیونکہ ناظرین میں ہماری گھریلو خواتین زیادہ ہیں ان کے پاس اتنا نام نہیں ہوتا کہ ڈراما ختم ہونے پر رائٹر کا نام بھی دیکھیں۔ نہیں افسوس نہیں ہوتا کیونکہ کردار اگر پاؤں پر ہو رہے ہوتے ہیں تو وہ بھی ہمارے

”اکثر رائٹر کہتی ہیں کہ ڈراما سیریل کا معاوضہ بہت اچھا ملتا ہے۔ ایک رائٹر نے کہا کہ اتنا اچھا ملا کہ میں نے اپنی گاڑی خرید لی۔ آپ کیا کہیں گی؟“

”جی۔۔۔۔۔ بالکل ایسا ہے، معاوضہ اچھا ملتا ہے اور لوگ دینی گاڑی لے رہے ہیں۔ اب میری اس بات پر کوئی ہنسنا چاہے تو کھل کر ہنسے کہ لوگ گاڑی لیتے ہیں مگر میں نے اپنی چٹائی بے منٹ (ڈراما سیریل کی) سے ”بھینس“ لی تھی۔“

”ناشاء اللہ اتنا نام ہے۔ اتنا اچھا لکھتی ہیں۔

سسرال والوں نے یا میاں صاحب نے آپ کی تحریروں کو پسند کیا؟ آپ کی حوصلہ افزائی کی؟“

”اس سے زیادہ حوصلہ افزائی کیا ہوگی کہ کبھی کسی نے لکھنے سے منع نہیں کیا۔ میرے میاں صاحب نے میرا ایک ہی ناول پڑھا تھا ”سفر قیام ہوا“ اور اسے انہماک سے پڑھا کہ میں پریشان ہوئی کہ ان کو کیا ہو گیا ہے اور پڑھ کر کہا کہ بہت کمال کا لکھا ہے۔ میری زندگی میری تحریروں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ سب لوگ پسند کرتے ہیں۔ حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور فخر کرتے ہیں اس بات پر کہ راحت بہت اچھا لکھتی ہے۔“

”ڈراموں میں زیادہ تر رونی دھوتی، مار لکھائی، مظلوم عورت ہی دکھائی جاتی ہے۔ کیوں؟“

”شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کا رونا بکنا ہے میں نے عام زندگی میں دیکھا ہے کہ عورت رونی کم ہے رولائی زیادہ ہے میری تو بہت کوشش ہوتی ہے کہ میں عورتوں کو رونا ہوا یا رونا ہوانہ دکھاؤں، نادان میں مریح کا کردار ایک آئینڈل کردار تھا میرا، جس میں لڑکی حالات کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ بڑی محنت کے ساتھ، صبر کے ساتھ اور بغاوت بھی نہیں کر رہی، حوصلے کے ساتھ لڑ رہی ہے اور میں تو خود چاہتی ہوں کہ خواتین کے ایسے کردار سامنے آئیں جس میں بغاوت نہ دکھائیں بلکہ وہ کچھ دکھائیں جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ ہماری

زیادہ رونے دھونے والے ڈرامے۔۔۔۔۔ میں ویسے بھی نہیں دیکھتی کہ گھر کی ٹینشن سے اٹھ کر آپ ڈراما دیکھنے بیٹھ جاؤ اور اس میں بھی رونا دھونا چل رہا ہو تو بہت ٹینشن ہوتی ہے۔ میں تو رائٹر سے اور محنت والوں سے کہوں گی کہ خدا را عورت کو اتنا مظلوم نہ دکھائیں۔ کیونکہ عورت اتنی مظلوم نہیں ہے۔ ماشاء اللہ بہت طاقت ور ہے، زندگی کے ہر میدان میں آگے جا رہی ہے۔ عورت کی اصل شخصیت دکھائیں کہ وہ آج کل کتنا کچھ کر رہی ہے زندگی کے ہر میدان میں۔“

”کچھ نئی سوال۔۔۔۔۔ گھر کے کاموں سے کتنا لگاؤ ہے، کھانا وغیرہ پکا لیتی ہیں؟“

”میں بنیادی طور پر Home ward (گھریلو) ہوں، گھر میں رہنا، اسے سنا، کھانا پکانا مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ باپ لکھنے کی اتنی شوقین نہیں ہوں۔ جب شادی نہیں ہوئی تھی تو گھر میں کھانا شوق سے پکاتی تھی سب کو کھلاتی تھی اب سسرال میں بھی میں بہت شوق سے کھانا پکاتی ہوں سب بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ الحمد للہ سب کچھ بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ خواہ کسی دھوت کا اہتمام ہو یا گھر کی عام دال روٹی اور چٹنی ہو۔ میری بیٹی میرے ہاتھ کی پکی بریانی بہت شوق سے کھاتی ہے۔ ایک فرمائش کر کے ہوائی ہے۔ اکثر کہتی ہے کہ ماما آپ رائٹر نہ ہوتیں تو بہت اچھی شیف ہوتیں تو الحمد للہ گھر کا ماحول ایسا ہے کہ ایک روایتی بیٹھک ہے جہاں لوگ آتے ہیں۔ ناشائستہ کے وقت بھی آتے ہیں دوپہر کے وقت بھی آ رہے ہوتے ہیں۔ کھانا کھلا کر اچھا لگتا ہے۔ برکت بھی ہوتی ہے۔“

”لکھنا، گھر سنبھالنا، سسرال کو دیکھنا، ان ساری باتوں میں گھر کو کس طرح سچ کر رہی ہیں؟ گھر ڈسٹرب تو نہیں ہوتا؟“

”میرے لیے میرا گھر میرے رشتے میرے شوق سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ جب بھی مجھے محسوس ہوا کہ میرے اس شوق کی وجہ سے میرا گھر ڈسٹرب ہو رہا ہے یا میرے سالانہ ایوارڈ سے

ڈسٹرب ہو رہے ہیں، یا میری بیٹی پریشان ہو رہی ہے تو میں نے لکھنا بہت کم کر دیا تھا۔۔۔۔۔ قواب میں عموماً اسی وقت لکھتی ہوں جب میں اپنے گھر کے سارے فرائض پورے کر لیتی ہوں، میاں کو پورا ٹائم دے دوں میری یہ عادت ہے کہ جب میری بیٹی یا میرے میاں صاحب گھر آ جاتے ہیں تو پھر بہت کم لکھتی ہوں یا بہت مجبوری ہو تو لکھتی ہوں ورنہ نہیں۔ گھر سچ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گھر میں سب بہت کو آ رہے ہیں۔“

”بھی ایسا ہوا کہ آپ کے ڈراما کو خراب کر دیا گیا، مطلب آپ نے جو چاہا وہ نہیں ہوا؟“

”نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ جو لکھا وہ ہی شوٹ ہوا، کیونکہ ہمیشہ اچھے لوگوں کے ساتھ کام کیا۔“

”کھیلوں سے اور سیاست سے کتنا لگاؤ ہے؟“

”مجھے کرکٹ سے تھوڑا بہت لگاؤ ہے اور آخری بار وہ والا کرکٹ ورلڈ کپ دیکھا تھا جو پاکستان نے جیتا تھا۔ باقی کھیلوں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ سیاسی لگاؤ کے لیے میرے میاں کافی ہیں۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے نو بجے کا خبر نامہ دیکھ لیتی ہوں۔“

”آ خر میں کچھ کہنا چاہتی گی؟“

”بالکل کہنا چاہوں گی۔۔۔۔۔ میرے اکثر قارئین مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے لکھنا کیوں چھوڑا۔۔۔۔۔ لکھنا نہیں چھوڑا البتہ وقفہ لمبا ضرور ہو گیا ہے۔ کوئی اپنا گھر بھی بھول سکتا ہے۔ واپس تو مجھے آنا ہی ہے لکھنا بھی ہے۔۔۔۔۔ بس آپ کے توسط سے ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ جو چیزیں میں نے اس میں سال کی عمر میں لکھی تھیں۔ وہ اب شاید اس عمر میں لکھنا مشکل ہو جائے۔ عمر بھی بدل گئی ہے جراثیم بھی بدل گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر میری تحریروں میں ایسی کوئی کی خصوص ہو تو اسے محبت کے ساتھ قبول کر لیں۔“ (راحت! آپ کے قارئین بھی وقت کے سفر میں آگے بڑھیں تو آپ لکھیں یقیناً وہ آپ کو اس انداز میں بھی پسند کریں گے)۔

آپ کی پُر غلوس رفاقتوں میں ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔ خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں اپنی قارئین کا پُر غلوس تعاون حاصل ہے۔ ہماری قارئین ہماری حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ہمیں اسے قیمتی مشوروں سے نوازی ہیں۔ ہماری خواہش ہوتی ہے، خاص نمبروں میں اپنی قارئین کا مختصر سائنکارف شامل کریں جس سے ان سے منسلک رشتے، ان کے روز و شب کا احوال اور پر سچے سے ان کا تعلق سامنے آئے۔

حسب روایت اس بار بھی سروے شامل ہے۔ سوالات یہ ہیں.....!!

(۱) خواتین ڈائجسٹ کب سے پڑھ رہی ہیں؟ خواتین ڈائجسٹ سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟

(۲) آپ کی روزمرہ روٹین کیا ہے، گھر کی ذمہ داریوں، بچوں، تعلیم اور جواب کی مصروفیات کے دوران مطالعے کا وقت کیسے نکالتی ہیں؟

(۳) اپنا پسندیدہ شعر لکھیں۔

آئیے دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے ان سوالوں کے کیا جواب دیے ہیں۔

دستک پہلاریگی

ادوار

ہو جاتا ہے، اب کبھی کبھی یاد رہتا ہے۔

دل کا نقش نہ دھندلا سا بھی منظر
میں نے سمجھا تھا، تیرے دل پر حکومت کی ہے
صائمہ کل..... مردان

رسالہ آیا تو پرسوں ہے مگر چونکہ بچوں کے سالانہ امتحانات ہو رہے ہیں تو ایسے میں میری ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ (بچے ماشاء اللہ بڑی کلاسوں میں اور پوزیشن ہولڈر ہیں) تو آبی مصروفیت کی وجہ سے رسالہ ابھی کھولا۔ سرسری نظر دوڑائی تو سروے کے سوالات پر نظر پڑی۔ یاد رہے اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ آج ہم نے آپا (نند) کی پوری فیملی کی دعوت کی تھی (پچھلے ماہ سب سے چھوٹے بچے کی شادی ہوئی ہے) صبح سے بچن میں ایک لگی تھی مگر میں ویلپ کرانے والا کوئی نہیں ہے۔ بچے اسکول اور خان صاحب (بخاری خدا) آفس میں۔ البتہ بچے "سراس" نے سبزی بنانے میں کافی ویلپ کی۔ اللہ انہیں زندگی دے۔ قصہ مختصر مہمانوں کو دعوت کھلا کر چکن سمیٹا۔ دونوں چھوٹوں جھان اور سفیان کو سلا کر نماز پڑھی اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی

فرخندہ انجم..... لاہور

(۱) آپ کو خواتین ڈائجسٹ کی عمر میں ایک اور سال آگے جانے کی مبارک۔ میں خواتین 1980ء سے پڑھ رہی ہوں تب میں نے جاب شروع کی تھی۔ بک اشال پر خواتین ڈائجسٹ دیکھا، خرید لیا اور آج تک پڑھ رہی ہوں، میں نے ہمیشہ خود خریدا مگر میں ڈائجسٹ پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

(۲) پہلے آفس جانا مگر جاب چھوڑ دی۔ اب لاہور کی بی او جاتے ہوئے (حیثین لینے کے لیے) سب سے پہلے خواتین اور شعاع خریدتے ہیں۔ بڑا پیٹا شادی شدہ ماشاء اللہ۔ چھوٹا بی بی ایچ ڈی کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اس کی جلد شادی کر دینی ہے، کھانا خود بناتی ہوں کیونکہ مجھے اور میری بی بی جان کو کام کرنے کی عادت ہے۔ سارا دن مصروفیت میں گزار جاتا ہے، رسالے پڑھنے کی عادت رات کو ہے۔ رات دیر تک رسالے پڑھتا، دیر سے سوتا مگر جلدی اٹھتا، یہ سب اپنی زندگی کے معمول ہیں۔

(3) شاعری سے پرانا لگاؤ ہے۔ ہر اچھا شعر کبھی یاد

حالات تک چھلکے سے برا حال ہے مگر یہ چھلکے تو سروے کے جوابات لکھ کر ہی دور ہوگی۔

(1) خواتین سے پہلا تعارف؟ اس کے لیے تھوڑا پیچھے جانا پڑے گا۔ ماضی کے درپچوں میں جھانکا تو ایک چودہ پندرہ سال، آٹھویں جماعت کی طالبہ سفید بونفٹ فارم اپنے دو چچاں آگے ڈالے، بریک میں خواتین میں ہم نظر آئی تھی۔ تب کہانی صح سے سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ اشعار، لطیفہ اور احوال ذریں شوق سے پڑھتی تھی۔

باقاعدہ تعارف فرحت اشتیاق کے "بن روئے آسم" کی بدولت ہوا۔ اور یہ بات ہے 2005 کی۔ جب اتوار بازار سے پرانا رسالہ خریدا اور بن روئے کی قسط پڑھی۔ بس یہی اس نے تو ہمیں خطی، دیوانہ، پاگل سب کچھ کر دیا تھا۔ پھر کیا تھا جناب اتوار بازار جا کر جتنے رسالے خرید سکتی تھی، خرید لیے مگر جتنا جتنا پڑھتے گئے، اتنی ہی طلب بڑھتی گئی۔

پہلے بھل تو خان صاحب ناراض ہوئے پڑھنے پر، مگر جب خود اس میں احادیث اور اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا انٹرویو پڑھا تو جب سے لے کر آج تک ہر ماہ باقاعدگی سے خواتین اور شعاع لا کر دیتے ہیں۔

(2) روزمرہ کی روٹین وہی ہے جو کہ ہر ماؤں وائف کی ہوتی ہے۔ بچوں کو دیکھنا، مگر سنبھالنا، کھانا پکانا اور روزمرہ کے دیگر کام۔

بچہ کی اذیتوں کے ساتھ اٹھ جاتی ہوں، نماز اور صبح و عبادت کے بعد بچن کا رخ کرتی ہوں۔ خان صاحب اور بچوں کو ناشور اور کچن بکس بنا کر دیتی ہوں۔ جب بچے اسکول اور خان صاحب آفس کے لیے نکل جاتے ہیں تو میں اور بچے (ماس) ل کر ناشور کرتی ہیں چونکہ آج کل ٹھنڈ ہے تو نو ساڑھے نو تک ہم کمرہ میں ہی ہوتے ہیں۔ دونوں چھوٹے (جھان، سفیان) کو کارٹون لگا کر خود جلدی جلدی کرے گا پچھلا واسیٹ لگی ہوں اور آدھا پون گھنٹے کے لیے رسالہ پڑھ لیتی ہوں پھر اگر دن میں سفیان سو جائے تو رسالہ پڑھ لیتی ہوں ورنہ رات کا انتظار رہتا ہے جب ہم ہوتے ہیں اور خواتین ہوتا ہے (اب کہی دیکھ لیں، بدن چھلکے سے پورے مگر سروے میں شامل ہونے سے خود کو دک نہیں بنائے)۔

(3) شعر کے بارے میں کہوں گی کہ.....

کبھی تم بھی ہم بھی تھے آشنا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جی کسی زمانے میں ہمارے پسندیدہ اشعار کی ایک لمبی لسٹ ہوا کرتی تھی لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس لیے یہاں پر "الف" کا ایک چھوٹا سا مگر معمول جملہ تحریر کرنا چاہوں گی جو کہ سیدھا دل میں اتر گیا۔

"اگر کھونے اور گوانے والی شے ہے ہی نہیں، جو کھو جائے، وہ پھر اتر نہیں۔ اگر سے پہلے کی آزمائش ہے۔"

طاہرہ یاسمین..... ٹیکسلا کینٹ

(1) خواتین ڈائجسٹ تب سے پڑھ رہی ہوں کہ ابھی میں نے شعور کی سیڑھی پر بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ چودہ سال کی عمر سے ہمارا ساتھ ہے، پچیس سال ہو گئے۔ اس دوران کبھی رابطہ مسلسل رہا، کبھی عرصہ دراز تک ٹوٹا رہا لیکن زندگی کی الجھنوں میں دوبارہ ملنے کے باوجود بھی اگر شامل نہ ہو سکے تو بھی ایک بھی ہمینہ ایسا نہیں گزرا جب ڈائجسٹ نہ پڑھا ہو اور میرے پاس اسے سالوں کے تمام خواتین و شعاع کے پرچے محفوظ ہیں۔

پہلا تعارف ایسے ہوا تھا کہ میری بی بی جان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر قسم کی معلوماتی اور تاریخی کتابیں لے کر آیا کرتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد میں نے ان کی چیزوں کو دیکھا تو ان میں سے مجھے ایک خواتین ڈائجسٹ ملا اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب ذوقی بھیا جان محفل ہوا کرتے تھے۔ میں نے پڑھا اور بہت اچھا لگا۔ مجھے خود بھی شوق تھا، بچوں کے اخبار اور بچوں کے رسالوں میں لکھتی رہتی تھی۔ بس اس کے بعد سے آپ سے وابستہ ہیں۔

یہ الگ کہانی ہے کہ رسالے کا حصول اس وقت کتنا مشکل ہوتا تھا اور بہت سے لوگ رسالہ پڑھنے کو برا سمجھتے تھے بلکہ بے راہ اور بدکردار تک کہا جاتا تھا۔ میں بھی نہیں تھیں جو اس محاذ پر لڑ سکتی تھیں، بہت سی باتیں خاص کر گاؤں میں رہنے والی خواتین میری بات کو بہتر سمجھ سکتی ہیں کہ گاؤں کے ماحول میں آج سے پچیس سال پہلے رسالہ پڑھنے والے کے کیا حالات ہوتے تھے۔ لیکن میں نے

ہمت نہیں ہادی اور آج وہی لوگ جب میری کوئی تحریر یا محفل میں میرا نام دیکھتے ہیں تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

(2) میری روزمرہ کی روٹین کافی ٹف ہے۔ شوہر بیمار ہیں میں جاب بھی کرتی ہوں۔ ساس امی بھی کافی عرصہ سے طبل ہیں اور چار بچوں کی ہر قسم کی ذمہ داریاں مجھ پر ہیں۔ جاب، گھر کا کام، بیماروں کا خیال رکھنا سب اپنی جگہ پر لیکن ان سب چیزوں کے باوجود میں جتنا بھی تنگی ہوئی ہوئی ہوں جب تک مطالعہ نہ کروں مجھے نیند نہیں آتی، سب کام ختم کر کے عشاء کی نماز پڑھ کر بستر پر جاتی ہوں تو مطالعہ کرتی ہوں۔

خواتین، شعاع و کرن کے علاوہ میں دینی اور تاریخی کتب بھی پڑھتی ہوں۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے اور لکھنے کا بھی دل کرتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ خواتین و شعاع میں میرے ناول چھپیں لیکن لکھنے کے لیے نام نہیں مل رہا لیکن مجھے اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ میری اس خواہش کو بہت جلد پورا کرے گا۔

اپنے لیے بھی ضرور وقت نکالنا چاہیے، زندگی کتنی ہی پریشان کن یا آزمائش بھری کیوں نہ ہو، وہ لحاظ میں اپنے لیے جیتی ہوں، جب خواتین و شعاع کے ساتھ ہوتی ہوں۔ وہ وقت میرا اور صرف میرا ہوتا ہے۔

(3) شعر تو بہت سارے پسند ہیں۔ ہر اچھے شاعر کا ہر شعر اچھا لگتا ہے۔ پھر بھی ایک شعر عرض ہے۔

چکر ہو جائے گا چھٹی، یہ آنکھیں خون روئیں گی
وہی بے فیض لوگوں سے بھا کر کچھ نہیں ملتا

باجرہ عمر ان..... لاہور

(1) جواب یہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ سے تعلق بہت پرانا ہے۔ ہوش سنھالتے ہی گھر میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی آمد دیکھی۔ باجی اور امی دونوں ہی مطالعے کی شوقین تھیں۔ رقیہ باجی کو گھر گشتی کے علاوہ ڈائجسٹ کی دنیا میں تم پایا۔ البتہ بذات خود اس کا مطالعہ اس وقت کیا جب میں فرسٹ ایئر میں تھی۔ باجی رسالہ اس شرط پر دیا کرتیں کہ ایک بھی بیج مڑنا یا خراب نہیں ہونا چاہیے۔ باجی نے کارڈن بھر کے سنے گھر خواتین ڈائجسٹ رکھے ہوئے تھے۔

اپنی شادی کے بعد میں خواتین ڈائجسٹ سے کافی

عرصہ دور رہی مگر گزشتہ چار سال سے ویکولر پڑھ رہی ہوں۔

(2) دوسرا سوال ایسا ہے کہ زندگی کی مصروفیات میں کھوئی ہوئی خاتون خانہ کو خود پر ایک نظر ڈالنے پر مجبور کر گیا ہے۔ روزانہ کی روٹین میں سب سے ضروری چیز نماز ہے۔ نماز کے اوقات کے دوران ہی عموماً کاموں کو ختم کر رکھا ہوتا ہے۔

نجر کی نماز اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد اپنے لیے ڈائننگ قہودہ تیار کرنا، اس کے بعد بچوں کے لیے ناشتہ بنانا ہوتا ہے۔ صبح آٹھ بجے کی خبریں سننا معمول کا حصہ ہے جس کے ساتھ چائے اور رسک کا ناشتہ کرنا عادت۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست کی خبروں پر نظر رکھنا، ان کے بارے میں ایک تجزیہ بنانا یہ بھی میرے معمول کا حصہ ہے۔

اس کے علاوہ موسم کا خیال جاننا میری اولین خواہش ہوتی ہے کیونکہ اس حساب سے کپڑوں کی سلیکشن اور کھانا پکانے کی چوائس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ آج واشنگ مشین لگے گی یا نہیں۔ بارش کی خبر مل جائے تو کپڑے ایک روز پہلے دھوئی ہوں۔

نوبے سے دس یا ساڑھے دس کا وقت سرتاج یعنی خان صاحب کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس دوران کوئی بھی دوسرا کام کرنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ بس خان صاحب کا ناشتہ، جو تے کپڑے..... نونون کال..... نہ ہی کوئی دوسری مصروفیت۔ گیارہ بجے سے دو بجے تک سخت ترین شیڈول ہوتا ہے، جس میں گھر کی صفائی، سترائی، کھانا پکانا اور اگر کپڑے دھونے ہوں تو ان سے بھی ہٹنا۔

ان سب کاموں کے دوران رشتے داروں (امی، باجی، نیا، سعدیہ، حرمک اور دوست ریحانہ اعجاز) کو کال کرنا..... خوب دل لگا کر کام بھی سرانجام دیا جاتا ہے اور ضروری ڈیٹا بھی منتقل ہو جاتا ہے۔

دو سے تین بجے تک کا وقت نماز، بچوں سے کپ شپ اور چٹ کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دل چاہے مطالعہ کرو اور دل چاہے تو آرام۔ شام کے کام الگ ہیں، چائے، برتن، رات کا کھانا اور پھر اچھی عادت کہ کچن مکمل طور پر صاف کر کے سونا۔ بھی بھی رات سونے سے پہلے بھی



مطالعہ کر لیتی ہوں، ورنہ عموماً یہ کام دوپہر میں کر لیتی ہوں۔

ایک شمارہ پڑھنے میں دو دن لگاتی ہوں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر بہت سا مواد پڑھتا رہتا ہوں۔ اس کے برآں فیکٹر لکھنا محبوب مشغلہ ہے۔ کچھ وقت ملے تو افسانے لکھتا اور ایک ناول بھی شروع کر رکھا ہے، اسے نایاب کرنا، زندگی مصروف ہی مصروف ہے۔

شام میں بیٹی کے لیے وقت بھی نکالتی ہوں۔ قرآن پاک سننا اور تعلیم میں مدد دینا ضروری غرض کے طور پر ادا کرتی ہوں کیونکہ بچوں کا حق ماں باپ پر سب سے پہلے ہے۔ اس کے علاوہ ایک اینڈر پرمہمانوں کو ملکہ کرنا اور اچھے مزے دار کھانے بنانا بھی پسندیدہ مشغلہ ہے۔

خزلیہ یوسف لاہور

(1) خواتین ڈائجسٹ اس وقت پڑھنا شروع کیا جب اس کے افسانے، ناول اکثر سریر سے گزر جاتے تھے۔ اسکول کا زمانہ تھا، شاید آٹھویں میں تھی۔ آج سے تقریباً چوبیس سال پہلے کی بات ہے۔ میری امی ڈائجسٹ پڑھتی تھیں تو پہلا تعارف امی کے ذریعے سے ہوا۔ ابو کی ریٹائرمنٹ کے بعد جب اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہوئے وہاں قریب ہی میری پہلی کاکہر بھی تھا۔ اس کی بڑی بہن خواتین، شعاع اور کرن بہت پڑھتی تھیں، وہی امی کو بھی پڑھنے کو دے دیتی۔ میں نے بھی تب ہی پڑھنا شروع کیا امی کچھ بھی نہیں کہتی تھیں، بس یہی کہ ابھی تمہاری عمر نہیں پڑھنے کی۔

(2) میں مکمل طور پر گھریلو خاتون ہوں۔ ایم اے کے دوران ہی شادی ہوئی پھر بی۔ اے، یوں تعلیم اور مہموری رہ گئی۔ 2014ء میں پڑھائی کا شغف سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے رکھا تھا۔ یوں 2016ء میں اسلامیات کے ماسٹر صاحب بھی بن گئے۔

بچوں کو اسکول چھوڑنے کی ذمہ داری میری ہے کہ اس وقت میان صاحب روزگار کے غموں میں اکیسے ہوتے ہیں۔ پہلے بچوں کو اسکول چھوڑ کر دو گھنٹے سو جاتی تھی لیکن اب پچھلے تین سالوں سے اس روٹین میں فرق یہ آیا ہے کہ سونے کے بجائے یہ دو گھنٹے مطالعے یا پھر لکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ دو سال پہلے بچوں کے ادب کے ادب میں قدم

رکھا اور الحمد للہ یہ سفر آج بھی جاری و ساری ہے۔ صبح کے وقت کے علاوہ رات کو بھی تقریباً دو سے ڈھائی گھنٹے یہی روٹین ہے۔ یہ دونوں اوقات میرے اوزیر میری کتابوں، قلم کے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ درمیان میں اگر وقت ملے تو وہ وقت سوشل میڈیا کا ہوتا ہے۔

آج کے سوشل میڈیا کی دور میں مطالعے کا مفہوم بہت بدل گیا ہے۔ اب مطالعے کا مطلب کتاب ہاتھ میں لے کر اگر پڑھتا ہے، وہیں اس کا مطلب کسی اچھی ویب سائٹ کا ورڈ کرنا، وہاں کی تحاریر زیر مطالعہ لانا بھی ہے۔ ویسے میری ذاتی رائے یہی ہے کہ جو مزہ کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنے میں ہے وہ اسکرین پر نہیں۔ جاب نہیں کرتی کہ ”اور بھی دکھ ہیں زمانے میں“۔

(3) پسندیدہ شعر کوئی ایک نہیں، بہت سارے ہیں۔ موڈ پر انحصار کرتا ہے کہ کب کوئی شعر، غزل دل کو چھو جائے اور اپنے حصار میں لے لے۔ آج کل شہباز علی نقوی کا ایک شعر پسندیدگی کی مسند پر برائے جان ہے۔

اجالا تھا، اجالا چار سو تھا
مگر دلی میں اترا تب ہی نہیں تھا
سحر خیم سحری..... مغل پوری

(1) خواتین ڈائجسٹ ستمبر 2016ء سے پڑھ رہی ہوں اور اب ہمیشہ پڑھوں گی۔

تعارف ایسے ہوا کہ مجھے خواتین ستمبر کا ٹاسکل بہت پسند آیا۔ ہاتھ میں پھولوں کا بکے لیے پھرتی مسکراتی ماڈل نے دل موہ لیا سو میں نے فوراً خرید لیا لیکن کبھی تاریخ پر نہیں مل پاتا تھا تو کبھی میں لیٹ ہو جاتی تو ختم ہو جاتا تھا لیکن جنوری 2017ء سے میں خواتین پر چکا حاصل کر رہی لی۔

(2) میری روٹین یہ ہے کہ صبح گیارہ بجے اٹھنا ایک بیجے تک ناشتہ کرنا (سلسلو) پھر اس کے بعد اپنا روم صاف کر کے خزانے سے رسالے پڑھنا گھر کی ذمہ داریاں مجھ پر کچھ خالص نہیں ہیں بس کبھی کبھی دل کیا تو کوٹنگ کر لیتی ہوں ورنہ میری کوئی لطف روٹین نہیں ہے۔

(3) شعر تو بہت سے اچھے لکھتے ہیں لیکن فی الحال کوئی ایک بھی دماغ میں نہیں آ رہا ہے۔ ہاں ایک شعر اپنی اور خواتین ڈائجسٹ کے دوستی پر لکھ سکتی ہوں۔

خواتین ڈائجسٹ



خواتین ڈائجسٹ



خواتین ڈائجسٹ



جب بھی آتا ہے تیرا نام، میرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں
شاہدہ ظفر..... ڈیرہ مستی، بہاولپور

(1) جب لفظوں کا مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا تو
ابو جان جو مطالعے کے بے حد شوقین ہیں، مختلف قسم کی
کتابوں کے علاوہ رسالے بھی لے کر آتے جو میں شوق
سے پڑھتی۔ ای ابو نے کبھی رسالے پڑھنے سے منع نہیں
کیا بلکہ جب کچھ بڑی ہوتی اور کہانیوں کی سمجھ آنے لگی تو
جو کہانی ابوکا اچھی لگتی اسے خاص طور پر پڑھنے کو کہتے اور یہ
والدین کا بخشنا ہوا اعتقاد ہے کہ ان کی نظروں میں سرخرو
ہیں۔ ماں باپ کی تربیت اچھے اساتذہ کی شگفت اور

ہماری ذہین مصنفین نے ہر جگہ ہماری رہنمائی کی، شکر یہ
خواتین ڈائجسٹ۔

مستقل قاری بنے ہیں ستمبر 2003ء سے، جب
بھری سعید کی ”قص جنوں“ پڑھی اور تاحال خواتین
ڈائجسٹ کے قاری ہیں اور تمام رسالے محفوظ ہیں کیونکہ
جب میری بیٹی ایمن ٹھوڑی بڑی ہو جائے گی تو اسے بھی
پڑھنے کو دوں گی۔

(2) میں باؤس دومن ہوں۔ فجر کی پہلی اذان کے
ساتھ بیدار ہوتی ہوں۔ نماز، قرآن پاک، وظائف سے
فارغ ہو کر ناشتہ بناتی ہوں، بچوں کو ناشتہ کروا کر اسکول
بھیجتی ہوں۔ اس کے بعد برتن دھوئے اور گھر کی صفائی
میں ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے کیونکہ مجھے ٹائم دیکھ کر کام
کرنے کی عادت ہے۔ اس طرح وقت کی بچت ہوتی
ہے۔ دوپہر کا کھانا بنانے سے پہلے میرے پاس دو گھنٹے
ہوتے ہیں مطالعے کے لیے۔ کھانا بنانے اور بچوں کو کھلا کر
ٹیوٹن بھیجتا۔

ظہر کی نماز کے بعد بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا
جو کہ دس بارہ کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ عصر اور مغرب کی
نماز کے بعد ہلکا چلاکارات کا کھانا نماز عشاء کے بعد پھر
مطالعہ کرتا، اسی پڑھنے کی لت نے دیر سے سونے کی
عادت ڈالی ہوئی ہے۔ کچھ تو ہم پڑھنے کے شوقین اور کچھ
اس لیے کہ میاں جی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر ہوتے
ہیں اور جی کئی مہینے کے بعد آتے ہیں۔

(3) رکتا بھی نہیں، ٹھیک سے چلتا بھی نہیں
یہ دل ہے کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں
اس عمر کے صحرا سے حیرت یاد کا بادل
کھلتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں
راہی حمید..... کوہاٹ، کے پی کے

(1) خواتین میں پانچویں کلاس سے پڑھ رہی ہوں
اور خواتین سے میرا تعارف اپنی امی کے ذریعے ہوا۔ میں
پانچویں کلاس میں کبھی میری اردو کافی اچھی تھی تو میں امی
کے رسالے لے کر اوپر چھت پر بنے اسٹور میں گرمیوں کی
لمبی دوپہروں میں چھپ کر پڑھتی تھی اور میری چھوٹی بہن
مجھے جن بھوکوں کی آواز سن کر ڈرائی رہتی تھی مگر وہ
مجھے ڈرانے میں کامیاب نہیں ہوتی تھی کیوں کہ میں رسالہ
پڑھنے میں اتنی گمن ہوئی تھی کہ مجھے پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

(2) میری روزمرہ روٹین تو کافی سی کہانی ہے، کہیں
آپ پور نہ ہو جائیں۔ ہم پانچ بہنیں ہیں اور ایک بھائی۔
میں سب سے بڑی ہوں۔ میری امی گرلز کالج پرائیویٹ
میں ٹیچنگ عطا کرتی ہیں اور ابو امی کالج میں چوکیدار ہیں تو وہ
دونوں صحت سات بچے ہی سے کالج چلے جاتے ہیں اور میں
نے پی ایس کیا ہوا ہے۔ میں گھر میں ہوتی ہوں۔ باقی
میری بہنیں اور بھائی پڑھ رہے ہیں اور مجھ سے چھوٹی بہن
پرائیویٹ اسکول میں چھپ رہے تو گھر کی ساری ذمہ داری
میری ہوتی ہے۔ گھر کی صفائی سے لے کر کھانا پکانا وغیرہ
اور امی کی کمپنیں کے لیے چاول اور چائے وغیرہ بنانا بھی
میری ذمہ داری ہے۔

ہمارا گھر اندر پردے کا پابند اور نمازی گھر اندر ہے یعنی
کہ ہم سب بہنیں برقع پہنتی ہیں اور نماز پابندی سے پڑھتی
ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آج کل کی مہنگائی کے دور میں برکت
ڈالی ہوئی ہے۔ گزارا اچھے طریقے سے ہو جاتا ہے اور
ویسے بھی اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے، اس کا شکر ادا کرنا
چاہیے۔

گھر میں ان تمام مصروفیات کے باوجود شاعر،
خواتین اور کرن پڑھنے کا وقت نکال ہی لیتی ہوں۔ میری

میری خواہش میرا خواب... دُعا ہے بس

سید احمد

مجھے چونکا دیا تھا۔ ان دنوں میں نے مارخام کی کہانی
بھی پڑھی تھی، جس سے میں بے انتہا متاثر ہوئی تھی۔
صرف متاثر ہونا کافی نہیں تھا تو میں نے شیطان پر
ایک کہانی لکھ دی۔ گرمی کی چٹیاں تھیں۔ میرے
بارے میں یقین رکھا جاتا تھا کہ میں کسی نہ کسی تخریبی
کام میں مصروف رہتی ہوں اس لیے مجھے ایک
عذر ”خطاب“ دیا گیا تھا۔

یہ خطاب میں آپ سے شیئر کر سکتی ہوں لیکن
مجھے ڈر ہے کہ پھر آپ مجھے اسی ”لقب“ سے پکارنے
لگیں گے۔ بس اس نام کا مطلب ایسا بندہ ہونا ہے
جو چند اچھے کام کرے اور باقی کا سب فساد، برباد
کرے۔ اور مایا کا رعبے۔

(وہ بے گھر والوں کو عادت ہوتی ہے چوٹی
کو ہاتھی بنانے کی اور میری بے شمار چوٹیاں ہاتھی بنی
ہیں۔)

جبہ میں نے شیطان کی کہانی لکھی تو میرے
لیے اسے پوسٹ کر دانا بہت عظیم قسم کا مسئلہ بن گیا۔
میں نے اپنی دس بیس کلاس فیلوز، آدھے اسکول،
پورے جہاں سے باتوں باتوں میں یہ معلوم کرنا چاہا
کہ اگر کسی جگہ کوئی چیز بھیجی ہو یعنی چند چیز تو کیسے
بھیجے جاسکتے ہیں۔ آپ مجھ ہی کیجئے ہوں گے کہ میں
گھر والوں سے مدد نہیں لے سکتی تھی کیونکہ میں پہلے
ہی بدنام تھی۔ دوسرا مجھے یہ خوف تھا کہ وہ اسے
پوسٹ کروانے کے بجائے کھولیں گے۔ پڑھیں
گے اور پھر پھر۔۔۔۔۔ ہاں وہی۔۔۔۔۔

نفسے دل ایسی، ویسی بھلیاں نہیں سہہ سکتے نا تو
میں اس شیطانی کہانی کوئی سے نئی جگہ چھپاتی رہتی تھی
کہ کوئی پڑھ نہ لے۔ گھر ایک ایسی جگہ ہوتی ہے
جہاں لگا ہر تالا، گھر کے ہر فرد کے ہاتھوں کل
جاتا ہے۔ زمین کھود کر بھی کچھ بدادوتا تو وہاں سے
بھی یہ ”خزانہ“ نکال لیتے ہیں۔

کائنات میں طاقت و در ترین قوت، محبت کی
قوت ہوتی ہے۔ اس کی وسعت بے کنار ہے اور
گہرائی بے انداز۔ الہام کی طرح یہ ہر اس دل پر
وارد ہو کر ہی رہتی ہے، جس کے لیے دل میں رکھی
جاتی ہے۔ محبت کا ایک ذرہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ وہ
پھیل پھول کر ”پھول“ ضرور کھلا دیتا ہے۔

آپ کی محبت کے پھول اور ان سے مہکتا
گلستاں مجھے عزیز ہے۔۔۔۔۔ آپ سب میرے عزیز
ہیں۔۔۔۔۔

میں آج تک کبھی کسی ایک بھی قاری کا شکریہ
ادا نہیں کر سکی۔ شکریہ اگر ایک لفظ ہوتا تو میں کہہ
دیتی۔ ایک بار میں ادا ہو جاتا تو میں ادا کر دیتی۔ لیکن
”شکر“ کا تسلسل تو مسلسل ہوتا ہے نا۔ اسے الفاظ
میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں عزیز رکھ کر، اعزاز دے
کر، محبت کی برابری پر لا کر شاید کچھ ادا لگی ہو سکے۔

پاکستان میں شاید یہ کوئی لڑکی ایسی ہوگی جس
نے خواتین ڈائجسٹ کا نام نہیں سنا ہوگا۔ پہلی بار میں
نے اس کا نام اسکول میں سنا تھا۔ میں دوسری کتابیں
پڑھتی رہی تھی لیکن میرے لیے ڈائجسٹ کا لفظ ہی نیا
تھا۔ اپنی کلاس فیلو کے بتانے پر میں نے پوچھا کہ یہ
کیا ہوتا ہے؟ تو اس نے کہا۔

”اس میں بہت سی کہانیاں ہوتی ہیں۔“
تو میں نے کہا کہ ”کیا تم مجھے ایک لاکر کھاسکتی
ہو۔“

اگلے دن وہ اپنے بیک میں رکھ کر لے آئی
تھی۔ یہ خواتین، شعاع میں سے کوئی ایک تھا۔ میں
نے اس چھوٹی سی کتاب کو ہاتھ میں لیا اور پوچھا۔
”بہت ساری کہانیاں ہیں اس میں؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں“۔ اس کا لایا ہوا ڈائجسٹ تو
میں نہیں پڑھ سکی تھی، لیکن آنے والے وقت میں کی
ایک ضرور پڑھ لیے تھے۔ کہانیوں کی نوعیت نے

تو میرا خزانہ..... یعنی وہ شیطان..... وہ یہاں وہاں دبا پڑا رہا.....

بہر حال میں وہ کہانی پوسٹ کروانے میں ناکام رہی۔ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ چونکہ میں نے مارخام کی کہانی پڑھی اور اس سے متاثر ہوئی ہوں تو یہ اس کے زیر اثر ہے۔ میں نے اس پر غور کیا۔ اس کیفیت نے مجھے سمجھا یا کہ تخلیق مستعار نہیں لی جاتی۔ اگر لی جائے تو وہ جھٹکتی نہیں ہوتی۔ میں نے ایک فیصلہ کیا، شیطان یعنی پیپر زنگالے اور ایک ایک کر کے جلا دیے اور میری انہیں چمپا کر رکھنے کی فینشن بھی ختم ہو گئی۔

تو میری پہلی کہانی..... آگ کے سپرد ہوئی۔ میں نے پاکستان میں ہونے والے مضمون نویسی کے ایک مقالے کے لیے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس پر بہت محنت کی، کتابیں پڑھیں، ریسرچ کی۔ اپنی طرف سے بی ایچ ڈی کیل کا مقابلہ لکھا کہ کسی میں ہمت ہے تو اس مضمون کے آگے جیت کر دکھائے۔

میں نے ہار کر دکھایا..... اس مقالے کو جیتنا تو دور کی بات، انہوں نے مجھے کال کر کے یہ تک بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میرا مضمون انہیں مل چکا ہے۔ اپنے دل کو ملی دینے کے لیے میں نے سوچ لیا کہ میں نے ایڈیٹر میں ہی ٹھیک نہیں لکھا تھا۔ میری رائٹنگ بھی تو خراب ہے، وہ بے چارے پڑھ نہیں سکے ہوں گے۔ ورنہ میرا مضمون تو نمبروں سے بھی اوپر آتا.....

وہ سو دس نمبر سے بھی نیچے گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ مضمون نہیں تھا، ”مجموعہ ہونگا“ نہیں تھا۔ پینل نے پہلا صفحہ پڑھنے کی کوشش کی ہوگی تو تین چار سطریں پڑھ کر سائیڈ پر رکھ دیا ہوگا اور زیر لب بڑبڑائے ہوں گے۔ ”مجھ سے بالاتر ہے۔“

لیکن خواتین ڈائجسٹ نے ایسا نہیں کیا۔ ”طواف عشق“ میں آمنہ، کسوہ کا نام سن کر کہتی ہے نا

کہ ”کہانی نہیں ہے تو شروع ہوئی تھی۔“ تو اصل کی کال بھی پکھائی ہی تھی کہ.....

”کہانی نہیں ہے تو شروع ہوئی تھی عزیز میرا..... بالکل نہیں ہے۔“

عزیزی میرا رائٹر نہیں تھی..... سنہی ابھی تک رائٹر ہی ہے..... میں سیکھ رہی ہوں، اور سیکھتی رہوں گی، یہ سگریٹ ختم نہیں ہوگا۔ لیکن میری خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ ادارے نے اس سفر کو میرے لیے آسان کیا ہے۔ مجھے سمجھایا اور پڑھایا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ ہر ایڈیٹر، ہر ادارہ خواتین ڈائجسٹ جیسا ہوتا ہے، لیکن آنے والے وقت میں میری خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہوتا۔

عزیزی ایک کہانی پر اصل نے مجھے ایک بہت پیاری بات سمجھائی اور کہا۔

”میرا اتم ایسی اس کہانی کو رسنے دو، ایسی کہانیاں دل بو جھل کر دیتی ہیں۔ ڈائجسٹ کو پڑھنے والے بہت سے قارئین پہلے سے ہی ان حالات کا سامنا کر رہے ہیں۔ کم سے کم ڈائجسٹ میں تو انہیں امید ملے..... ان کا دل ہلکا ہلکا ہو.....“

مجھے یہ بات بہت اچھی لگی اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی میں قارئین کو امید چاہیے۔ وہ کہانی تھی ”میں بنت جیلہ“ جسے بعد میں اصل نے شائع کر دیا تھا۔ ایسے ہی ایک بار اصل نے کہا کہ ”دیکھو اگر کسی پیاری پڑھ لکھتے ہیں تو بہت احتیاط سے لکھتے ہیں۔ تاکہ کوئی پیار پڑھے تو اسے ازبھی ملے، نہ کہ مایوسی..... وہ اپنی پیاری سے فائدہ کرے، دل چھوٹا نہ کرے۔“

وقت کے ساتھ ساتھ میں نے ریڈرز کو سمجھنا شروع کر دیا۔ میں نے جانا کہ دور گاؤں میں ایک عزیزی (محورث) رہتی ہے، اس کی ساری روٹی اور ہوا ”خواتین ڈائجسٹ“ ہے۔ وہ اس کی باتیں سنتی ہے، وہ اس سے باتیں کرتی ہے۔ یہ اس کے دل کی تسلی ہے۔ اس کے دکھوں کی ڈھارس ہے۔

اور بہت دور..... دور..... پھاڑوں پر ایک

لوکی رہتی ہے، اس کی ساری پرواز ”خواتین ڈائجسٹ“ ہے۔ یہ اگر اسے کچھ خواب دیتا ہے، تو کوشش اور جدوجہد کی نصیحتیں بھی کرتا ہے۔

یہ ڈائجسٹ..... یہ ان سب خواتین کی تسلی ہے..... ان کی امید، ان کا یقین، ان کی تعلیم ہے.....

اور تب میں نے جانا کہ یہ تو بہت بڑا پلیٹ فارم ہے۔ اتنا بڑا پلیٹ فارم کہ میں بیک وقت لاکھوں لوگوں سے مخاطب ہو سکتی ہوں۔ ان تک اپنی بات پہنچا سکتی ہوں۔ انہیں تسلی، امید یا پھر یقین دے سکتی ہوں۔ انہیں اپنے ساتھ پرواز پر لے جا سکتی ہوں۔ دیہات کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ، میں انہیں ہزاروں سال پیچھے کا سفر کروا سکتی ہوں۔ اونٹ بان کی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ، میں انہیں صحرا کی راتیں دکھا سکتی ہوں۔

یہ وہ لمحہ تھا..... جس لمحے میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ”تخلیق اور خلوق“ دونوں اگر ایک ہو جائیں..... تو پھر کمال ہوتا ہے..... اصل کہتی ہیں کہ یہ میرا ٹیلنٹ تھا جو میں رائٹر بنی۔

(میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ میرا تم میں خدا داد صلاحیت ہے۔ اصل)

میرا یہ ماننا ہے کہ میں نے ٹیلنٹ سے بھرے ہوئے لوگوں کو خواہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے کیونکہ انہیں پلیٹ فارم نہیں مل سکا۔ میں نے تاریخی کتابوں میں حیرتوں کو خاک ہوتے ہوئے پڑھا ہے کیونکہ ان کے پاس راہنما نہیں تھا۔ جاس نہیں تھا۔

ہر انسان ”ہیرہ“ ہے کیونکہ وہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی قابلیت رکھتا ہے لیکن ہر ”ہیرہ“ کو اسٹج کہاں میسر ہے؟

تو میں اپنے اس اولین اسٹج کا..... خواتین ڈائجسٹ کی موجودگی کا شکریہ کہتے نہ ادا کروں۔ اس نے پورا اسٹج میرے حوالے کر دیا۔ پردے اٹھا دیے..... اور اپنی داد اور تالیاں میرے لیے تیار

کر لیں..... قارئین کی محبت پر انہیں اپنے دل کے قریب کیسے نہ رکھوں۔ یہ خواتین ڈائجسٹ ہی ہے جس نے میرے پرندوں کو اپنے آسمان پر پرواز کی اجازت دی۔ یہ اس کے قارئین ہی ہیں جنہوں نے میرے گھوڑوں، اونٹوں، سانپلوں، پر سوار ہو کر جنگلوں، صحراؤں، زمانوں کا سفر میرے ساتھ ساتھ کیا۔

امیر، دیہات، دیہات، عزیز، امیر اور بھاء بھولو کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بوزن کے جگنو خواتین ڈائجسٹ کے آواز جنگل میں جھللائے تو قارئین نے بھی انہیں اپنی تسلیوں میں رکھا۔

آپ سب نے کہانیوں کی ہر صنف کو قبول کیا، میرا حوصلہ بلند کیا۔ انہیں عزیز رکھا۔ میں دنیا میں نہیں بھی، زندگی میں کتنی بھی ترقی کروں میں یہ بھی نہیں بھولوں گی کہ میرا اولین اسٹج ”خواتین ڈائجسٹ“ ہے۔ جو مجھے عزیز ہے اور جس کا ایک ایک قاری میرا ”عزیزی“۔

مجھ سے پوچھا گیا کہ میں آئندہ اپنے آپ کو کہاں دیکھتی ہوں تو میں کہہ نہیں سکی لیکن میں نے سوچا کہ.....

ہر دل میں تھوڑا سا..... کئی جانے والی ہزاروں داستانوں میں سے ایک داستان سا.....

سب مسافر ہیں اور سب کا ایک سفر ہے..... تو ہر سفر میں ایک ہم راہی سا..... ایک دوست..... ایک عزیز..... ایک جگنو.....

ایک خواب سا..... مجھے آپ کے ساتھ آپ کی زندگی میں موجود رہنا ہے۔ کتابوں کے ریک میں نہیں۔ آپ کی تعریف میں نہیں..... آپ کی محبت میں..... یہ میرا لالچ، میری خواہش، میرا خواب نہیں..... یہ میری دعا ہے بس..... آپ سب جو مجھ سے محبت کرتے ہیں..... یہ اس محبت کا جواب ہے بس.....

طرحے ساز

دن کی روشنی اور دھوپ پہ لیکا ایک ہی کالی گٹھا آ کر حملہ آور ہوئی تھی اور اپنے ہمراہ مٹی اور مٹی کی مہک لیے ٹھنڈی ہوا لائی تھی۔ گرد و غبار کا طوفان بے قابو ہوا اور پھر چمکتی گٹھا، بجلی بہت زور سے کڑکی تھی اور اس کے ساتھ ہی آسمان نے جیسے اپنے سارے دروازے کھول دیے تھے۔

پانی کی ایک بھاری اور گہری چادر آسمان سے زمین تک چیل گئی۔ بے تحاشا بارش لگا کر بوندیں،

مسلل تہی ہوئی چادر کے اس پار دیکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ کھڑکی سے اپنا ہاتھ باہر نکال کر اس نے پتیلی آسمان کی طرف کی۔ تراشہ برستی بوندوں نے بل بھر میں پتیلی کو بھگوا ڈالا۔ کتنی ہی دیر وہ یوں ہی کھڑکی پرستی بارش اور پتیلی کھلی کودتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کا ہاتھ پہلے ٹھنڈا ہوا، پھر رخ اور پھر دھیرے دھیرے پورا بازو سن ہونے لگا۔

کل رخ نے ہاتھ اندر کھینچا، پتیلی اور کلا کی سے پانی کے قطرے ٹپک کر فرش گیلیا کرنے لگے تھے۔ تولید سے ہاتھ پوچھ کر وہ پنگ پر بیٹھ گئی۔ اسی پنگ پر جس پہ اس کی ماں نے آخری سالیس لی ٹھیں۔ کتنی ہی دیر چار پانی کے کھر در سے بان پر انگلیاں پھیرتی رہی پھر اپنے منھ کے ہارے وجود کو لے کر لیٹ گئی۔

سر کے نیچے ایک پتلا سا گتہ تھا، جو کافی تھا۔ بستر اور چادر کے ٹکڑے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی، آنکھیں کھولے وہ پلپ کی پتلی مٹی روشنی میں چھت کی کڑیاں دیکھتی رہی، کتنی رہی۔ باہر ہونے والی چھا جوں برستی برسات کی آواز، بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک سنتی رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور آج رات نیند بڑی دیر اور مشکل سے آئی تھی کہ آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی۔

☆☆☆

صبح میٹروں نے ابھی اللہ اکبری کہا تھا کہ اس کی جڑی ہوئی پللیں یک دم ہی ایک دوسرے سے الگ ہوئی تھیں حالانکہ وہ بات گئے تک جاگنے کے بعد



بشکل ہی سوئی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے جی بھر کے نیند پوری کر لی ہو۔ آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وضو کر کے نماز پڑھ کے اس نے تلاوت شروع کی اور بہت دیر تک کرتی رہی۔ باہر پرندوں نے بھی رب العالمین کی حمد و ثناء میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ ان کی چوکار بڑی بلند آہنگ تھی۔ گل رخ کمرے سے نکل کر صحن میں گئی۔ رات گئے تک تیز برقی بارش اور آندھی کے آثار و سبب صحن میں ہر جگہ نمایاں تھے۔ بیش تر پانی اگر چہ پانی کے ذریعے نکل گیا تھا مگر کہیں کہیں پانی ابھی بھی کھڑا تھا۔ جہاں جہاں سے فرش اکھڑا ہوا تھا وہاں پانی جمع تھا۔ امروہ کے درخت سے گرے پتے مٹی اور پانی میں لت پت تھے۔ فضا میں تھوڑی سی خشکی کے ساتھ مٹی کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ امروہ کے اکلوتے درخت کے پاس آکر اس نے ٹہنیوں کی طرف نگاہ کی، جہاں پانی کے قطرے شاخوں اور چٹوں پر اتر چکے ہوئے تھے۔

ابا باہر نکلے تھے۔
”جی۔“
”چلتے کی تیاری کریں پھر؟ ناشتہ وہیں کر لیں گے اسٹیشن پر۔ گاڑی تو ویسے تو بجے کی ہے مگر رات بارش کی وجہ سے راستے خراب ہوں گے۔ نہ جانے اسٹیشن تک پہنچنے میں کتنا وقت لگ جائے۔“ ان کی بات معقول تھی۔ سمجھ میں آنے والی، گل رخ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں اپنا سامان لے لوں اور چائیاں خالہ کو دے دوں۔“ گل رخ دھیرے سے بولتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

سامان تھا ہی کیا ساتھ لے جانے کے لیے؟ دو چار جوڑی کپڑے اور ایک دو اور ضروری اشیاء اور کچھ قیمتی یادیں۔ اپنا چھوٹا سا سفری تھیلا اس نے رات میں ہی تیار کر لیا تھا۔ شاپر کے منہ پڑ بڑھ کر لگا کر

”بڑے ابا! چلیے۔“ مین گیٹ پر تالا لگا کر وہ مڑی۔

”ایک منٹ ٹھہرے، میں ذرا یہ چابی خالہ جان کو دے دوں۔“ گل رخ نے آگے بڑھ کر اگلا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے؟“ تیسری دستک پر خالہ بھائی کی خوابیدہ آواز اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔

”خالہ بھائی! میں ہوں گل رخ۔“ جب تک اس نے بتایا وہ دروازہ کھول چکے تھے۔

”ارے تم اس وقت کہاں؟ گاڑی تو نو بجے ہے نا۔“ اپنی خوابیدہ آنکھوں کو مٹاتے ہوئے وہ کچھ گڑبڑ سے گئے تھے۔

”راستہ خراب ہوگا، اس لیے جلدی نکل رہے ہیں۔ آپ یہ چابی رکھ لیں اور..... سب کو میرا سلام کہتے چھ۔“ گل رخ کی آواز بھاری ہونے لگی، حلق میں گولہ سا لٹک رہا تھا۔

”نہیں نہیں..... ایسے کیسے نہار منہ، خالی پیٹ جارہی ہو۔ اندر آؤ۔ بڑے ابا! آپ بھی اندر آ جائیں۔“

خالہ بھائی نے سر باہر نکال کر انہیں بھی دعوت دی پھر گل رخ سے مخاطب ہوئے۔

”بڑے ابا کو لے کر بیٹھک میں بیٹھو، میں اماں کو اور سارے کو اٹھاتا ہوں۔“ اسے حکم دے کر وہ واپس مڑ گئے تھے۔

”رہنے دیں خالہ بھائی! سب کی نیند خراب ہوگی پھر میں رات کو لیٹی کی سب سے۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“ بولتے ہوئے وہ اندر چلے گئے اور ذرا دیر میں ہی خالہ اور سارے بھابھی منہ پر پانی کے جھپکے مار کر اس کے پاس چلی آئیں۔

”تم آرام سے بیٹھو، میں ناشتہ بنا رہی ہوں۔ کر کے جانا۔“ سارے بھابھی نے اسے مخصوص تیز تیز لہجے میں کہا اور اس کا جواب سنے بغیر واپس مڑ گئیں۔

”بیٹھ جائیے بھائی صاحب! ناشتہ کر کے جائے گا۔“ خالہ اسٹیشن چھوڑ آئے گا آپ دونوں کو۔ اللہ

جتنے مرحومہ کو بہن بنایا ہوا تھا، گل تو میری بیٹی ہے۔ ایسے بھوکے پیٹ تو جانے نہیں دوں گی۔“

خالہ کے لہجے میں سچائی، حسد کی اور غلوں تھا۔ بڑے ابا متاثر ہوئے اور خاموش ہو گئے۔ باورچی خانے سے کھڑ پٹری کی آوازیں آرہی تھیں، ذرا دیر میں ہی فضا میں اٹھنے اور پر اٹھنے کی خوشبو پھیل گئی۔

کچھ دیر میں بیٹھک کی میز پر خالہ بھائی نے ناشتہ چمن دیا۔ پراٹھے اور بری مرچ، پیاز کے آلیٹ، اس کے بعد گرم گرم خوشبو دار چائے۔ ناشتہ سادہ اور مختصر تھا مگر اس میں گھر کے کینوں کا غلوں اور محبت شامل تھی۔

گل کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا نہ ہی بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر میزبانوں کا دل رکھنے کو اس نے دو چار لٹے کھالے۔

”خالہ بھائی! گھر میں تھوڑا بہت سامان ہے، اگر آپ رکھنا چاہیں تو رکھ لیجئے گا ورنہ کسی ضرورت مند کو دے دیجیے گا۔“ چائے پینے کے دوران گل نے انہیں مخاطب کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جاتے وقت خالہ اور بھابھی نے گلے لگا کر آئندہ کے اچھے وقت اور خوشیوں کی دعا کیں دیں۔ خالہ بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”رکھ لو، ضرورت ہو تو خرچ کر لیتا۔“ خالہ نے چلتے چلتے اس کی مٹھی میں کچھ نوٹ دبائے۔ وہ انکار کرتی رہی مگر اس کی سن کون رہا تھا۔

خالہ بھائی نے اپنی اسکوٹر پر باری باری دونوں کو اسٹیشن چھوڑ دیا تھا۔ چندہ منٹ کا راستہ تھا، آدھ گھنٹے بعد وہ بڑے ابا کے ساتھ اسٹیشن پر کھڑی تھی۔

چھوٹے سے شہر کا چھوٹا سا اسٹیشن، بھی ذرا خاموش اور سو یا سو یا سا تھا۔ پلیٹ فارم پر چند مسافر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ سامنے چائے والے کا اسٹال تھا، جہاں ایک آدمی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک کتا لیٹا ہوا آرام فرما رہا تھا۔ ٹرین آنے میں ابھی کچھ وقت تھا، گل رخ کی ہندھی بیچ رہی تھی اس

نے مٹھی کھولی۔ ہزار ہزار کے دونوٹ تھے۔ خالہ جان کی محبت پر گل رخ کا دل بھر آیا۔ وہ کوئی گئے رشتے دار تو نہ تھے، پڑوسی تھے اور مالک مکان۔ مگر بہت پر غلوں انسان اور انسانیت سے محبت کرنے والے۔

گل رخ کی امی جب آخری دو ماہ بالکل ہی بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں، انہوں نے ان دو ماہ کا کرایہ بھی نہیں لیا تھا۔

”ایسے ہی اچھے لوگوں کی نیکیاں اس دنیا میں جگہ جگہ ہنسی اور خوشی بن کر پھیلی ہوئی ہیں۔“ گل رخ نے وہ نوٹ اپنے برس میں رکھتے ہوئے سوچا۔

دور سے ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی پھر وہ خود آتی دکھائی دی۔ پلیٹ فارم پر لینے اور بیٹھے چند مسافر جمائیاں اور انگریزائیاں لیتے کھڑے ہو گئے، بڑے ابا بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی گل رخ نے بھی اپنا تھیلا اور برس سنبھال لیا۔ ٹرین یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔

جیسے ہی وہ سیٹوں پر بیٹھے، روادگی کی سیٹی بج گئی۔ گل رخ کا دل بھرا آیا تھا مگر ضبط کر گئی۔ ٹرین نے تھوڑی دیر بعد ہی رفتار پکڑ لی تھی، وہ اپنی پوری رفتار سے آگے کی طرف دوڑ رہی تھی اور گل رخ بھی آگے کے بارے میں، اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

ماضی کے بارے میں سوچنے کے لیے تھا ہی کیا، ایک معصوم، بے فکر سا بچپن۔ جب وہ باپ کی اگلی پکڑ کر جھولا بھولنے، آئس کریم کھانے باہر جاتی اور گھر میں ماں سے لاڈ اٹھایا کرتی تھی۔ لڑکپن کی شروعات، الھڑپن سے ہوئی مگر بہت جلد یہ الھڑپن اور لا پر والی، خاموشی اور اداسی میں بدل گئی۔

نازخہ اٹھانے والا باپ دنیا میں نہ رہا تھا اور جوانی کی آمد ہوئی تو اندلیٹوں اور اداسی کے بادل اور بھی گہرے ہو گئے کہ ایک مختصر بیماری کے بعد ماں بھی دنیا سے رخصت ہوئی۔ ماں باپ سے وابستہ اور رشتے دنیا میں موجود تھے، تین خالائیں، دو ماموں، ایک پھوپھی اور چار تایا چچا۔ ماشاء اللہ تنہا،

الہیہ شہزادہ داستانیں



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذرِ بیدار چٹری منکوا انیس
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب 1200/- روپے
ڈسکاؤنٹ 300/- روپے
آج ہی 950/- روپے
مئی آؤ رارسال فرمائیں

بذرِ بیدار ڈاک منکوانے کے لئے
ملکیتہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

سفر ہوتا نہیں ہے درندہ میں بھی آ جاتی۔" انہوں نے رکی سے لہجہ میں کہہ کر دوبارہ چھری اٹھائی۔

گل رخ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر تخت اور اس پر پڑی اشیاء کو گھورتی رہی۔

"تم ہاتھ منہ دھو کر آرام کرو، تھک گئی ہوگی۔" بڑے ابا تو لے سے منہ صاف کرتے ہوئے اندر آئے۔ "رؤی! اندر لے جا، بہن کو۔" انہوں نے اپنی بیٹی کو مخاطب کیا۔

نور عمری لڑکی تھی، بالکل ماں کی دوسری کاپی۔ بہت گوری، فرہ۔ بدن اور آنکھوں پر چشمہ۔ غور سے گل رخ کو دیکھ رہی تھی۔ باپ کی ہدایت سن کر وہ جھٹ سے کھڑی ہوئی اور گل رخ سے مخاطب ہوئی۔

"آؤ۔" وہ اپنا تھیلہ اٹھائے کھڑی ہو گئی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

"لاؤ، یہ مجھے دے دو۔" میں الماری میں رکھ دیتی ہوں۔" رؤی نے اس کے ہاتھ میں پکڑے تھیلوں کی طرف اشارہ کیا۔ گل رخ نے دونوں تھیلے اس کی طرف بڑھا دیے۔

رؤی الماری کھول کر تھیلے رکھنے لگی، پھر رک گئی۔ "یہ بھی رکھ دوں؟" وہ خالد بھائی کی دی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔

"یہ تم رکھ لو۔" گل نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا بچوں کا سادہ پند دیکھ لیا تھا۔

"ساری؟" "ہاں۔" گل بہت دنوں بعد بے ساختہ مسکرائی تھی۔ آج اس گھر میں اس کی پہلی رات تھی۔ کسی جگہ آخری اور پہلی رات کی عجیب اور معنی خیز ہوتی ہے۔ کبھی دکھ کی ردا میں لپٹی ہوئی، کبھی خوشی کے پیرا میں لبوس، مگر گل رخ کے لیے یہ آج کی رات بے تاثر، بے معنی سی رات تھی۔ نہ خوشیوں بھری، نہ غم انگیز۔ آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کرتی رہی مگر نیند کل کی طرح آنکھوں سے غائب تھی۔

"بڑے ابا! آپ کچھ کھائیں گے؟" گل رخ نے وہ تھیلہ ان کے آگے کیا۔

"بھکت دے دو۔"

گل رخ نے بھکت اور جوس کا پکٹ انہیں نکال کر دیا۔ اپنے لیے ایک چپس کا پکٹ نکالا اور کھول کر کھانے لگی۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے آخری بار اپنے پسندیدہ چپس کب کھائے تھے، شاید تین ماہ یا چار ماہ پہلے۔ اس نے چپس کا تیسرا ٹکڑا منہ میں ڈالا تھا، جانے کیا کچھ یاد آیا کہ وہ حلق میں اٹکتے لگا۔ اس نے بے دلی سے پکٹ واپس تھیلے میں ڈال دیا اور پانی کی بوتل منہ سے لگائی۔

سفر بہت زیادہ طویل تو نہیں تھا، چند گھنٹے لگے تھے لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے تین میں بیٹھے بیٹھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ کینٹ اسٹیشن پر اتر کر بڑے ابا نے ایک رکشہ پکڑا اور تھوڑی دیر میں اردو بازار کے عقب میں واقع ایک بلڈنگ کے سامنے انہوں نے رکشہ روکا دیا۔

عمارت بہت زیادہ پرانی نہیں تھی، رنگ دروغن میں لمبی پتی اچھی حالت میں تھی۔ تیسری منزل پر سیڑھیاں چڑھ کر پیچھے اور ایک دروازے پر دستک دی اندر سے کسی نے دروازہ کھولا۔

"آؤ بیٹا۔" اندر آ جاؤ۔" اندر رکھتے ہوئے انہوں نے متذبذب کھڑی گل رخ کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک کشادہ لاؤنج تھا، جس کے ایک کونے میں ایک تخت بڑا تھا اور دوسرے کونے میں چھوٹا سا گر صاف ستر اور اسٹائش سا بچن تھا۔

تخت پر ایک فرہ اور گوری پٹی خاتون براجمان تھیں، ان کے آگے ہری ہری سبزی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک نظر شوہر پر ڈالی جو اندر کمرے میں چلے گئے تھے۔ گل رخ کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے چھری ٹرے میں رکھ دی، تاک کی پیننگ پر اپنا چشمہ درست کیا پھر گل رخ سے مخاطب ہوئیں۔ "ادھر آ جاؤ۔" گل رخ تخت کے ایک کونے پر ٹپک گئی۔

"تمہاری ماں کا سن کر افسوس ہوا، مجھ سے لبا

دو خیال دونوں کے رشتوں سے بھر ہوا تھا مگر والدین سے محروم بننے کی بجائے کسی کے لیے کسی کے دل میں گنجائش ملے گی، نہ گھر میں جگہ۔ سوائے تایا ابو کے، جنہیں بڑے ابا کہا جاتا تھا اور یہ گنجائش بھی فقط وہ اکیلے ہی اپنے دل اور گھر میں نکال پاتے تھے۔

ان کی بیوی نے اس کی مخالفت کی تھی اور بیٹیاں بھی ان کی ہم نوا تھیں۔ بڑا بیٹا شادی کے بعد الگ ہو گیا تھا، چھوٹا بیٹا تھا جس کے لیے اندر باپ کے بکھیرے اور بہنوں کی ذمہ داریاں بہت تھیں۔ بولانے کے لیے بھی اور بوکھلانے کے لیے بھی، سو اس نئے قصبے میں اس نے کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ گل رخ ان سب باتوں سے لاعلم تھی اور کبھی بھی بے خبری بڑی اچھی نعمت ہوتی ہے۔

نیم تو جی سے وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، کہیں ریتیلے میدان، نیلے، گھر، آبادی، کچن ہرے بھرے کھیت، اس کی آنکھوں کے سامنے سے مناظر گزر رہے تھے اور باضی بننے کے لیے ایک گز رالحد اور گز راسطر ہی کافی ہے۔ وہ ہر گز ریتے لہجے اور چچھے رو جاتے مناظر کو ماضی بناتا دیکھ رہی تھی۔ اب تک کی زندگی اور والدین کے ساتھ گزرا وقت بھی باضی بن گیا تھا اور حال اور مستقبل؟ نہ جانے وقت کا کون سا رنگ کس انداز میں سامنے آئے۔

سوچوں میں گھر اور ماں بھی شاید بہت تھک گیا تھا، بے زار ہو گیا تھا، اب ہی اس کی توجہ سیٹ پر رکھے شاپر کی طرف مبذول ہوئی، جو چلتے وقت خالد بھائی نے اسے تھمایا تھا۔

"یہ رکھ لو، سفر میں کام آئیں گے۔" اب دو پہر ہو رہی تھی۔ دھوپ تیز ہو چلی تھی مگر اچھی لگ رہی تھی۔ رات ہونے والی سو سلا دھار بارش نے پہلے سے خوش گوار موسم میں ذرا ذرا خشکی سی کھول دی تھی۔ دھوپ کی حدت کو خود پر محسوس کرتے ہوئے اس نے خالد بھائی کا دیا ہوا تھیلہ کھولا۔ اس میں جوس کے ڈبے بھکت اور چپس کے پکٹس اور پانی کی دو

رومی اس سے ذرا فاصلے پر سوری تھی اور اس کے برابر روشنی گہری نیند میں تھی۔ گل رخ نے ایک نظر دونوں بہنوں کو دکھا، ان کی گہری نیند پر رشک کیا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کمرے کا ایک دروازہ جاکنی میں کھلا تھا، گل رخ آ کر وہاں کھڑی ہوئی۔ روشنیوں کے شہر میں جگہ جگہ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ انہیں بلا ارادہ دیکھنے لگی۔ اندھیرے اور روشنی کے استرجاع کا غریب پرودہ شہر ایک ماں کی طرح ہر آنے والے کو اپنی آغوش میں سمیٹنے والا، گہری سیاہ رات میں یہ شہر ہیرے کی طرح دکھ رہا تھا۔

”ارے میں کہتی ہوں، جاگ رہے ہو یا سو گئے۔“ نیم اندھیرے اور گہری سرگوشی میں ایک پاٹ دار آواز گونجی۔

”جاگ رہا ہوں، سو بھی گیا ہوتا تو یہ صور اسرائیل سن کر جاگ ہی جاتا۔“ یقیناً یہ بڑے ابا تھے جو طحڑے لہجے میں بیوی سے مخاطب تھے۔

”یہ جو نیا خچال بڑے ٹھنڈے سے اٹھالائے ہو، اس کا کمرے کیا؟“

”جو اپنی بیٹیوں کا کمرہ گا۔“

”دو گے پیار اتنی مشکلوں سے کسے ہیں، ابھی تک قرعہ نہیں اتر۔“ دو لڑکیاں اور بیٹے گونجی ہیں، بیٹا بھی ہے۔ اپنے بچے ہی نہیں سنبھل رہے اس جوان چپاں لڑکی کو کیسے ٹھکانے لگاؤ گے؟“ بڑی امی تو بلبلاتی اٹھی تھیں۔

”اللہ مالک ہے۔“ بڑے ابا رات کے اس پہر زیادہ بحث کے موڈ میں نہ تھے۔

”تو پھر ایک یتیم خانہ کھول لو گھر میں، جتنے بھی یتیم مسکین ملیں سب کو لا لاکر گھر میں جمع کرلو۔ اپنے بیوی بچے جائیں بھاڑ میں۔“ شوہر کے اطمینان اور سکون پر چمک صاف تو جل کر خاک ہو گئیں۔

”سو نے دوگی یا کمرے سے باہر چلا جاؤں؟“

”ہاں، خود تو آرام سے بھٹکا کے سو میں گئے، ہماری نیندیں اڑا کر رکھ دیں۔“ وہ کچھ دیر تک بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح اس گھر میں وہی شور اُٹا اور ہنگامہ ہو رہا تھا جو انیشا کی شادی کے بعد سے معمول بن گیا تھا۔ انیشا کی شادی کو فقط چار ماہ ہوئے تھے، شادی سے پہلے اس نے گھر کے کاموں کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر ناشتے کی۔

صبح اٹھ کر باری باری سب کو ناشتہ بنا کر دیتی تھی۔ ابا اور بھائی کام پر چلے جاتے، رومی اور نوشی بالترتیب اسکول اور کالج چھوڑ دیتا اور ماں کا ناشتہ بنا کر ان کی ساتھ ناشتہ کرتی تھی۔ اس کی شادی کے بعد گھر کے باقی کام تو ستم پستم ہو جاتے تھے مگر ناشتے کے وقت بڑی ہنر بولنگ اور شور شراب کا منظر ہوتا تھا۔

نوشی اپنی بڑی بہن کی طرح ذمہ دار تھی نہ سلیقہ مند، بڑی حد تک کام چھوڑ کر کسی حد تک پھوہڑ۔ اس کا یہی احسان بہت تھا کہ وہ صبح اٹھ کر چائے بنادیتی تھی، اب اس چائے کے ساتھ تھوڑے کھانے پاپے، یا کچھ اور..... یہ کھانے والوں کا درد دہرے۔

وہ چائے بنا کر فلاسک میں نکال کر رکھتی اور واپس بستر میں صبح کے وقت اسے نیند بہت آتی تھی، انٹر کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ کالج بھی کون سا روزانہ جاتی تھی، دس گیارہ بجے اٹھنے کی عادت تھی۔ بہن کی شادی کے بعد اب مارے باندھے اٹھنا پڑ رہا تھا، ابا، ابا، بھائی، رومی، سب بڑبڑاتے، اسے باتیں سناتے، وہ بھی جواب دے کر کمرے میں جاوے جا۔

آج بھی یہی ہنگامہ چلتا تھا۔ گل رخ کی آنکھ کھل گئی تھی، اس شور شراب سے۔ وہ دم سادھے کھٹی لاؤنج سے آئی آواز سن رہی تھی۔

”بھئی مانس! ابھی تو ہفتے میں ایک آدھ دن پراٹھا بھی بنادیا کر۔ چائے پاپے کھا کر کام پر جاتا ہوں تو ایک گھنٹے بعد ہی بھوک لگنے لگتی ہے۔“ بڑے ابا بیبی سے مخاطب تھے۔

”مجھے بھی پراٹھا بنادینا۔ تھوڑے پاپے کھا کھا کر میرا تو پیٹ خراب ہو جاتا ہے، پھر بھوک بھی جلدی لگتی ہے۔“ اشعر نے بھی دہائی دی۔

”مجھ سے نہیں بنتے صبح پراٹھے۔“ نوشی تنک کر بولی۔

”تو کوئی نوکر آئے گا ناشتہ بنانے کے لیے؟“

ای کو بھی غصہ آ گیا۔

”رکھ لیں کوئی نوکر یا نوکرانی پراٹھے تھوپنے کے لیے۔“ نوشی کی زبان بھی بس.....

”ارے سسرال جا کر کیا کرے گی مہارانی؟ وہاں تو سارے کام کرنے پڑیں گے۔“

”بھوینا کر لے چائیں گے یا نوکرانی؟“ نوشی بڑبڑاتے ہوئے اندر آ گئی۔

”آپنی امیراناشتہ تو بنادو۔“ رومی یونی فارم میں ملبوس اپنے بال باندھ رہی تھی۔

”اب نہیں کیا من و سلوی چاہیے؟“ نوشی اس پر ہی چڑھ دوڑی۔

”اٹھ اٹھادو، ہاف فرائی۔“ رومی نے جلدی سے فرمائش کی۔

”زردی نوٹ جاتی ہے مجھ سے، جیسا بنے گا چپ کر کے کھا لینا، نخرے نہ دکھانا۔“ نوشی اپنی بہن کو تنبیہ کرتی ہوئی کچن کی طرف چلی۔

”پراٹھا بنادے باپ کو۔“ ڈٹل رومی کھا کھا کر قبض رہنے لگا ہے۔ امی نے التجا کی تھی تھی سے تو وہ بھی قابو میں نہیں آتی تھی۔

”آنا گندھا ہوا نہیں ہے۔“ نوشی کے پاس بہانوں کی کمی نہیں تھی۔

”پراٹھے کو چھوڑو، رات کی روٹی ہے تو سینک دے، مجھے دیر ہو جائے گی جلدی کر۔“ ابا جھلا کر بیبی سے مخاطب ہوئے۔ نوشی نے انہیں رات کی روٹی حل کر دی۔ رومی کے لیے اٹھ اٹھایا، اشعر کو ناشتہ دیا اور پھر غراب سے کمرے میں اندر۔

گل رخ تھوڑے دھوکے لاؤنج میں آ گئی تھی، نظر تو سب کی پڑی اس پر مگر مخاطب بڑے ابا نے ہی کیا۔

”آؤ بیٹی، دیکھو میں تو کام پر جا رہا ہوں نہیں ناشتے میں جو کھانا ہو بنا لیتا۔“ فریج میں اٹھ سے، مھن، ڈٹل رومی سب ہیں۔ پاپے اور بسکٹ بھی رکھے

ہیں۔ اپنا گھر سمجھ کر رہنا، تکلف نہ کرنا اور کسی کے آسرے پر بھی نہ رہنا کہ کوئی مہمان سمجھ کر خاطر کر دے گا۔“

بولتے ہوئے ان کے لہجے میں ذرا طنز آ گیا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اشعر نے ایک نظر اپنے گھر آنے والے اس نئے مہمان پڑوائی اور پھر ناشتے میں مگن ہو گیا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد نوشی تو بدستور اپنے کمرے میں چادر تان کر سو چکی تھی۔ لاؤنج پورا بکھرا ہوا تھا، ناشتے کے برتن جوں کے توں پڑے تھے۔ بڑی امی تخت پر لیٹی ہائے کر رہی تھیں، ان کے گھٹنے بڑی حد تک جواب دے گئے تھے۔ ناشتہ کر کے دوائی کھائیں تو ذرا اٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں۔ یہاں تو دس، گیارہ بجے سے پہلے ناشتے کے آثار ہی نہ تھے۔

گل رخ ناشتے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ رہی تھی، جب انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

”لی لی از حمت نہ ہو تو ایک پیالہ چائے دے دو مجھے اور کوئی ڈٹل رومی کا ٹکڑا اور کڑا۔ میں اپنی دوائی تو کھاؤں۔“

”جی اچھا۔“ گل رخ نے چائے پیالی، اپنا اور ان کا چائے گالٹ ٹرے میں رکھا اور تھوڑے پرکھن لگا کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

ناشتہ کر کے اس نے برتن دھو کر کچن صاف کر دیا۔ لاؤنج کا بکھراؤ بھی سمیٹ دیا اور ساتھ ساتھ بڑی امی کے سوالوں کے جوابات بھی دیتی رہی۔

”تم دونوں ماں بیٹی بالکل ہی اکیلی رہتی تھیں؟“

”جی۔“

”نصیال سے کوئی آتا تھا ملے؟“

”بڑے ماموں آتے تھے۔ ایک دھ بار خالہ بھی آتی تھیں۔“

”گزر بسر کیسے ہوتی تھی؟“

”امی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ شام میں بچوں کو ٹیوشن اور قرآن شریف۔“

”گزارا ہوا جاتا تھا؟“

”جی۔“
”ہاں گزارے کا کیا ہے۔ خرچے اور ضروریات کم کر لو تو گزارا ہو ہی جاتا ہے۔“ انہوں نے خود کھانا کی تھی۔ دوایں کھا کر وہ کمرے میں گئیں اور کچھ کھڑ پڑ کر نکل گئیں۔
”سلائی دلائی آئی ہے؟“
”زیادہ نہیں آئی۔“
”سیدھی سیدھی سلائی تو کر لیتی ہو؟“
”جی، کر لیتی ہوں۔“

”اچھا تو ذرا اس چادر کے کنارے موڑ دو۔“
انہوں نے ایک خوش رنگ بڑی سی چادر اس کے حوالے کی۔ سلائی مشین وہیں ایک طرف رکھی تھی، ایک بڑے سے ڈبے میں دھاکے کی ریلیں بھی تھیں۔ دھاکہ مشین میں لگا کر وہ چادر کے کنارے موڑنے لگی۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں یہ ہوا کہ ذرا مشکل کے ساتھ ہی کئی مگر وہ اس گھر میں ایڈجسٹ ہونے لگی تھی اور اس ایڈجسٹ کے لیے اسے بڑی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔

وہ صبح اٹھ کر سب کے لیے ناشتہ بناتی۔ دن میں بھی گھر کے بیشتر کام نشتاتی اور اس درمیان میں بڑی ای کی ہدایت کے مطابق سلائی بھی کر لیتی۔ اسی سچ میں گاہے بگاہے اینٹیاں اور پلوں بھی آ جاتیں، دونوں کا رویہ گل رخ کے ساتھ نہ تو کسی کی طرح روکھا پھینکا تھا نہ روئی کی طرح دوستانہ اور بیٹھا بلکہ اپنی ای کی طرح تھا کہ کام اور بوقت ضرورت اسے مسکرا کر مخاطب کر لیتیں ورنہ گول ہو جاتیں۔

آنے کو تو پچا بھی چچی کے ساتھ آئے تھے، برقی لہجے میں تعزیت کر کے اسے پانچ سو روپے دے گئے تھے۔ پھوپھو بھی آئی تھیں، چم چاٹ کر دو سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ گئی تھیں۔

ہر جتنے بڑے ابا کے بڑے بیٹے عامر بھائی بھی اپنے والدین سے ملنے آتے تھے اور ملنے کیا آتے تھے بس اپنے دکھ بے رونے آتے تھے۔ شادی کو

دس سال ہو گئے تھے، ابھی تک بے اولاد تھے۔ بیوی کو خدا جانے کون کون سے امراض لگے ہوئے تھے۔ آئے دن بھی کوئی تکلیف، کبھی کبھیں درد، درجنوں ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر کہتے تھے، ٹیسٹ کیئر ہیں، اس وقت بھی وہ بیٹھے ہوئے ای کے سامنے اپنے دکھ بے رو رہے تھے۔

”نہ بچے ہوتے ہیں، نہ صحت ٹھیک رہتی ہے اس کی۔ میری تو لائف بچا ہو کر رہ گئی ہے۔ عثمان کی شادی میرے ساتھ ہوئی تھی، اس کے چاروں بچے اسکول جانے لگے ہیں۔ بڑا بیٹا تو کلاس فور میں گیا ہے، فرسٹ آیا تھا۔ عثمان ششائی لے کر آیا تھا۔“ عثمان ان کا سالا تھا۔

”تیری بیوی کو کوئی بیماری نہیں ہے بس سستی، کالہی اور نازخ ہے کی بیماری ہے۔ کام نہ کرنا پڑے، دو افراد کا کام بھی قہر میں کر لیتا ہے۔ ہمارا بی بی پر خدا غارت کرے، میرے بچے کی زندگی تباہ کر دی۔“ ای بیٹے کا روٹناں کر اور شروع ہو جاتیں اور اپنی مستاکائوت دیتیں۔

”دس سال تو گزر گئے، دس سال اور ایسے ہی گزر جائیں گے۔ اس خبر دینے سے تو کوئی پھل ملنے والا نہیں تھیں۔“

”تجھ پر بھی عشق کا بھوت سوار تھا کہ اسی سے کروں گا، وہ کچھ لیامن مانی کا انجام۔“

”پچھتا رہا ہوں امی!“ وہ دونوں ہاتھ ملنے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ عمر لڑکیوں کی نکلی ہے، لڑکے تو جوان ہی رہتے ہیں۔ دھک کر اس مرن جوئی کو۔“ ای نے مشورہ دیا۔

”چھوڑنے کو تو آج ہی فیصلہ کر دوں مگر مہر کیسے ادا کروں گا؟“ عامر نے چارہ بڑی مشکل تھا۔

”اتنی بڑی بڈی خلق میں پھنسیا، بھلا بتاؤ وہ لاکھ روپے حق مہر کون رکھتا ہے؟“

”تجھ جیسے بے وقوف عاشق۔“ عامر بھائی نے چپکے سی دل میں سوچا۔

”عامر بھائی! اچانک۔“ گل رخ نے ان کے

سامنے شے رکھی۔
”آں۔۔۔۔۔“ وہ چوہکے۔

”شکر یہ۔“ جاننے کا کپ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ایک بھر پور نظر گل رخ پر ڈالی تھی۔

☆☆☆

چھوٹے بچا آئے تھے، کچھ دیر بیٹھے، بڑے ابا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اصل مددے پر آ گئے۔

”بھائی صاحب! میں چاہ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے گل رخ ہمارے گھر رہے۔“

”تو رہی ہے یہاں۔“ بڑے ابا نے انہیں ہانے کی کوشش کی۔

”ہاں، ٹھیک ہے مگر ہمارا بھی تو کچھ فرض ہے۔“

”بڑے فراغ با دل رہے ہیں۔“ بڑی امی نے میز پر نظر دوں سے دیوڑی طرف دیکھا۔ بغیر مطلب کے تو دونوں میاں بیوی اپنا بخار بندیں کی کوی، وہ دیوڑی دیوڑی کی دگ دگ سے واقف تھیں۔ بڑے ابا نے کچھ سوچ کر ہائی بھری۔

”لے جاؤ کچھ دنوں کے لیے۔ اچھا ہے بچی اپنے سکوں سے مل لے گی۔ ذرا دل بھی ٹھیک جائے گا۔“

”عجیب آدمی ہو تم، اچھا بھلا اتنا کام سنبھال لیتی تھی مگر کا۔ لے کے بیچ دیا وہاں۔“ رات میں وہ شوہر صاحب پر بگڑ رہی تھیں۔

”اسی لیے بھیجا ہے وہاں، یہاں تو تم نے نوکرانی بنا کر رکھ دیا بچی کو۔ وہ بھی کیا سوچتی ہوئی کہ میں اس لیے لایا تھا۔“ بڑے ابا کی پیشانی پر خلائیں بہت ساری آ گئی تھیں۔

”وہ لوگ کون سا مہارانی بنا کر رکھیں گے۔ دیکھ لینا اپنی ہی کسی غرض سے لے گئے ہوں گے۔“

بڑی امی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ گل رخ چچا جان کے ہمراہ ان کے گھر پہنچی تو سامنے چچا کی سب سے بڑی بیٹی منال باجی اپنا مکا سا سپٹ لیے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اور چچی نے گل رخ کا بڑا پرتپاک استقبال کیا۔ اپنے پاس بٹھا کر بڑی دیر تک باتیں کرتی رہی، کچھ ادھر ادھر کر کے، کچھ اپنی

یعنی تائی امی کی برائیاں اور کچھ گل رخ سے اس کے والدین کے متعلق سوالات۔ سو سے، وہی بڑے اور گلاب جامنی سے اس کی خاطر تواضع کی۔ ان کی دو بیٹیاں اور بھی گئیں، دونوں کان جاتی تھیں۔ شام میں اکیڑی، دو بیٹھے تھے۔ چھوٹا اچھتر بن رہا تھا، بڑا کچھ بھی نہیں بن رہا تھا، بس بننا تھا۔ گھر کے سب افراد کو کبھی بے وقوف، کبھی پاگل۔

پہلا دن بڑی خاطر مدارت رہی۔ خوب اچھی اچھی چیزیں کھلائی گئیں۔ اگلے روز ناشتے کے بعد ڈیوڑی پر جانے سے پہلے چچا جان نے گل رخ کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے پیار سے کہنے لگے۔
”کسی بھی قسم کی جھجک اور تکلف کے بغیر رہنا۔ ہم سب تمہارے اپنے ہی ہیں۔ بس ذرا اپنی منال باجی کا خیال کر لینا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زائرہ اور مارکہ کو تو اپنی پڑھائیوں سے فرصت نہیں ملتی، لڑکے گھر پر کھتے نہیں ہیں۔ تمہاری وجہ سے تمہاری چچی اور منال کا دل بھی لگا رہے گا اور تھوڑی سہولت بھی ہو جائے گی، ٹھیک ہے؟“

انہوں نے گل رخ کے سر پر ہاتھ بھیرا اور جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ گل رخ اس مہینے میں سال کی ہونے والی تھی۔ اس کی عقل، شعور اور چھٹی حس عمر سے ذرا زیادہ ہی بے دار تھی۔ سمجھ گئی تھی کہ اس محبت اور خلوص کے مظاہرے کے پیچھے کون سی غرض کا فرما رہا ہے، مگر وہ بے وقوف نہیں تھی تو بے ادب بھی نہیں تھی۔ کام سے گھبراہٹی بھی نہیں تھی۔

تایا ابا کے گھر اس احسان کی وجہ سے ذمے داریاں اپنے سر لے لی تھیں کہ وہ اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھ کر اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ عزت اور تحفظ کے ساتھ اس کی چھوٹی بڑی ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی پر شکر ادا کیا تھا۔ اب چچا اور چچی کی غرض کو بھی اس نے مار جن دے دیا تھا۔ اسی حالت میں تو غیر لوگ بھی کام آ جاتے ہیں، میں تو پھر بھی ان کی

پٹی شے، باقی سب کے لیے ناشتا، کھانا، شام کی چائے پھر رات کا کھانا۔

گل رخ تو اسی میں ہی پوری ہو رہی تھی۔ گھر میں اپنی امی کے ساتھ رہتی تھی، فقط دو افراد۔ سادہ رہن سہن، سادہ غذا، منٹوں میں سارے کام ہو جاتے تھے۔ اب زندگی بیکس تبدیل ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک مختلف کاموں میں لگے لگے۔ شروع شروع میں وہ بے انتہا تھک جاتی تھی مگر اب آہستہ آہستہ عادت پڑتی جا رہی تھی۔

کھانا پکانے میں اسے کوئی خاص مہارت حاصل نہیں تھی۔ بڑی امی کے گھر بھی ان کی ہدایت کے مطابق پکائی تھی، یہاں چچی کی رہنمائی میں، ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر رکھا تھا۔ ابھی بھی ان کی ہدایت کے مطابق آلو گوشت پکا رہی تھی۔ گوشت گلنے کے قریب تھا، وہ آلو چھیل رہی تھی۔ علی اندر آیا، کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھا۔

”بات سنو لڑکی! تم انتہائی بے وقوف ہو۔“
”اپنی ساری اہم مصروفیات چھوڑ کر یہی اطلاع دینے آئے ہیں آپ؟“ گل رخ نے سر اٹھائے بغیر پوچھا تھا۔

”یہ تو ابھی شروعات ہے، آگے آگے دیکھنا سب کو تمہاری ضرورت پڑے گی۔ پھوپھو کا فون آیا تھا، ان کا پیار بھی اندر ہاتھ اٹھا رہے لیے بلکہ امل امل کر باہر کر رہا ہے۔“

”دیکھ لیں گے ان کی محبت بھی، اگر بلایا تو۔“
گل رخ کی مسکراہٹ عجیب تھی، کچھ غمی اور کچھ بے بسی۔

”شکر ہے کہ تمہارے اندر احساسات ابھی باقی ہیں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بھڑھڑاؤ۔“

”بے وقوف آپ مجھے کہہ چکے ہیں بے حس سمجھ رہے تھے اور کوئی لقب رہ گیا ہو تو وہ بھی دے دیں۔“ چچی کی ہدایات کے مطابق وہ اب چھلے ہوئے آلوؤں کے بڑے بڑے ٹکڑے کر رہی تھی، پھر انہیں دھو کر نمک لے پانی میں بھگو رہا تھا۔

”افوہ، آپ تو برا بھی مان جاتی ہیں۔ حیرت ہے ایک ایک کر کے میرے سارے اعزازے اور قبائلی غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ میرا نومولود صحافیانہ کیریئر مقام شرمندگی پر کھڑا ہے۔“

”آپ صحافی ہیں؟“ گل رخ نے اسے بغور دیکھا۔

”سننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک لڑکی کے چکر میں ماس کیوٹیکیشن میں داخلہ لینا پڑا اور پڑھنا بھی پڑا۔“ یکا یک ہی وہ انتہائی مجبور اور بے بس نظر آنے لگا۔

”صحافی سے زیادہ آپ ایک جاسوس لگتے ہیں۔“

”آپ کی قیافہ شناسی کی داد دیتا ہوں۔“ چبکتے ہوئے اس نے اچانک ہی ٹون بدلی۔ ”بات یہ ہے

لی لی کی ایک اچھا جاسوس ہی ایک بہترین صحافی بن سکتا ہے جس کی تیز نگاہ ہر معاملے کو سونگھ سکے اور اس کا ذہن معاملات کے ساتھ انسانوں کی تکیہ بھی کھج سکتے۔“

”اور آپ میں یہ سب خوبیاں ہیں؟“ گل رخ آلو بھگو کر سامن چپک کر بیٹھی۔

”تو کیا نہیں ہیں؟“
”چنانچہ، مجھے انسانوں اور معاملات کی تکیہ پہنچنا ابھی آتا نہیں ہے۔“ گل رخ سادہ سے لہجے میں بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

لاؤنج میں محفل جمی تھی۔ منال، باجی، چچی، زائرہ اور مارہہ چائیں کس بات پر سب کی سب ہنس ہنس کر دہری ہوئی جا رہی تھیں۔

”کیا ہوا گل بیٹا! بیڑیا بھون لی۔“ چچی میں یہ بات سمجھی کہ وہ تانی امی کی نسبت بڑے پیار اور پیٹھے لہجے میں مخاطب ہوئی تھیں۔

”چچی! ابھی پانی ہے اس میں، تھوڑی دیر لگے گی۔“

”اچھا، اچھا۔“ چچی نے سر ہلایا۔

”بک فیکر میں چلو گی میرے ساتھ؟“ مارہہ

نے گل کو مخاطب کیا۔
”جلی جاؤں گی۔“ گل وہیں بیٹھ گئی۔

”گل کی یہ بات بہت اچھی ہے، کسی کی بھی بات سے انکار نہیں کرتی۔“ زائرہ ہنسی اس کے پریشانی

بالوں کی پونی ہنسی کی ساتھ دائیں بائیں ہل رہی تھی۔
”اچھی بات ہے نا، بے چاری کسی کا دل نہیں توڑتی۔ سب کی بات رکھ لیتی ہے۔“ امی نے ایک

دردیدہ نظر گل رخ پر ڈالی کہ زائرہ کی بات کا برا تو نہیں مان گی۔

”میں ذرا ہنڈیا دیکھ لوں پانی خشک ہو گیا ہوگا۔“
گل رخ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھکتی ہے، ظاہر نہیں ہونے دیتی، دل میں کیا ہے۔“ اس کے جانے کے بعد چچی نے دھیمی آواز

میں بیٹیوں کے سامنے تبصرہ کیا۔
”ان امی حضور! میرے اور آپ کے خیالات

کتنے ملتے جلتے ہیں۔ اپنے ساتھ ساتھ میں آپ کی فراست کا بھی قائل ہو گیا ہوں۔“

وہ اچانک ہی کسی جن کی طرح نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا۔ چچی تو اچھل ہی پڑیں۔

”توبہ ہے، یہ لڑکا ہے یا جھلاؤ۔ بل میں یہاں، بل میں وہاں۔“ امی نے دل کر بیٹے کو گھورا۔

”میری پیاری امی جان!“ علی ان کے قدموں میں پیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔

”میرے پاس کوئی پیسے نہیں ہیں، اٹھ جا فافٹ یہاں سے۔“ چچی نے اپنے چہرے سے، بیٹے کی

رگ رگ سے واقف تھیں۔
”توبہ تو یہ کیا زمانہ آ گیا۔ ایک ماں اپنے سگے

فرماں بردار بیٹے کی خدمت گزاری پر شک کر رہی ہے۔“ علی نے اپنے دونوں گال ہٹائے۔

”دیسے علی بیٹا! تمہاری حزنیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم نے ماس کیوٹیکیشن کے بجائے ایکٹنگ کی تعلیم

حاصل کی ہے۔“ مارہہ نے اسے مخاطب کیا۔
”ایکٹنگ..... پڑھنے سے نہیں آتی۔ یہ میری

خداداد صلاحیت ہے۔“ علی نے کارا کڑا کر

”عزت مآب امی حضور! کان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟“

حالانکہ وہ اب بڑا ہو گیا تھا مگر چچی اب بھی کبھی اس کی سرزنش کے لیے اس کے کان مروڑتی تھیں۔

ان کی ہنسی بے قابو ہوتی اور علی نے ہنسنے کو آنکھ ماری،
”ہنسی تو پھنسی۔“

”کسے کہہ رہا ہے بے شرم۔ میں تیری ماں ہوں۔“ انہوں نے علی کی سرگوشی سن لی تھی اور اب اس کے کان مروڑ رہی تھیں۔

”شکر ہے کہ آپ کو یاد اور تسلیم ہے کہ آپ میری ماں ہیں اور میں آپ کا بیٹا تو اس خوب صورت

اور مقدس رشتے کا واسطہ دیتا ہوں۔ دو ہزار چاہئیں۔“

”کس لیے؟“
”کچھ بھوکوں کو کھانا کھانا ہے۔“

”ہوں گے تیرے لٹکے یاد دوست۔“
”جلد ہی سے دو ٹوٹ نکال دیں، نیلے پیلے

ہوئے بغیر۔“ علی کو جلدی ہو رہی تھی۔
”تیرے باوا اکل پوچھ رہے تھے مجھ سے کہ یہ

لڑکا دایہ بنی ادھر ادھر پھرتا رہتا ہے۔ سنجیدہ کب ہوگا؟ کام کب کرے گا؟“ امی نے اسے ڈرانے کی

کوشش کی تھی مگر بے کاری کی۔
”سنجیدہ تو میں کب سے ہوں، آپ ہی میری

سنجیدگی کو سیریس نہیں لیتیں۔“
”پھر شروع ہو گیا؟ کام دھندا کچھ کرنا نہیں،

تیرے سر پر سہرا سجادوں؟“
”بڑا تو ہو جاؤں گا، کام بھی کروں گا۔ اتنی اچھی

لڑکی بتائی ہے آپ کو، زندگی بھر پیش کرے گا آپ کا بیٹا۔ عمر بھر کمانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”کچھ بن کر تو دکھا، رشتہ لے جاتی ہوئی بھی اچھی لگوں۔ وہاں تو پہلے ہی رشتوں کی لائن لگی ہوئی

ہے۔“
”اللہ، بھائی! آپ ابھی تک اس بھوری ملی

کے چھوٹے بڑے بڑے زائرہ، زائرہ، زائرہ،

آنکھیں جھرت سے پھیلائیں۔

”بھوری بلی ہے یا کالی بلی۔ وہ جیک پاٹ ہے جیک پاٹ۔ لگ گیا تا تم سب کے بھی وارے ہارے ہو جائیں گے۔ تین کروڑ کے گھر اور دو کروڑ کی دکانوں کی اگلوٹی وارث۔ صرف کراہی ہی ہر ماہ لاکھوں روپے آرہا ہے۔“

”اور وہ تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے؟“ منائل نے مذاق اڑانے والے انداز میں علی کو دیکھا۔

”ارے آپ ابھی جانتی ہی کہاں ہیں اپنے بلیغٹ بھائی کو۔ دیکھ لیجیے گا، جب تک یہاں سے رشتہ نہیں جائے گا وہ کہیں ہاں نہیں کرے گی۔“ علی نے دعوے سے کہا۔

”ویسے کوئی بھروسہ بھی نہیں تمہارا۔“ منائل نے آنکھیں جھپکائیں۔

علی کو اچانک یاد آگیا، وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ ”ای! اور ہزار روپے۔“

”علی! اپنے باوا سے ایٹھا کر یہ رقیں، مجھے مت تنگ کیا کر۔“

”وہ تو جو کما تے ہیں، ساری جیبیں آپ کے سامنے جھاڑ دیتے ہیں۔“

”پور گھر چلائی ہوں، آسان ہے کیا؟“

”جلدی کریں امی جان! فقط دو ٹوٹ ہی تو ہیں۔“

”علی! اہی نے اسے گھور کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔ نہیں دے رہیں تو مت دیں، ویسے آپ کے پرس سے میں پہلے ہی نکال چکا ہوں۔ مجھے چاہتا رہا دینے کے معاملے میں تو آپ میری سوتیلی ماں بن جاتی ہیں۔“

علی نے انکشاف کر کے وہاں سے غائب ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ گل رخ ہنڈیا بھون کر واپس آئی تو چچی کو سر پڑے دیکھا اور تینوں بیٹیوں کی کھی کھی کر رہی تھیں۔

رات کھانے کے بعد وہ برتن دھو رہی تھی جب اسے اچانک یاد آیا کہ دن میں کپڑے دھو کر پھیلائے تھے، اب کل ہی لاؤں گی۔ رات میں چھت پر اکیلے جاتے ہوئے اسے عجیب سا لگا۔

اگلے روز دوپہر میں یاد آیا، کپڑے لینے اوپر آگئی تو ٹھنک گئی۔ علی کا وہاں ہونا عجیب نہیں تھا مگر وہاں گرین شیڈ کے نیچے بیٹھ کر اسے اسونگ کرتے دیکھ کر گل رخ کو دھچکا سا لگا مگر وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے اپنے کپڑے الٹی سے اتارنے لگی۔

”اتنی بری بری نظروں سے مت دیکھو، جودل میں ہے، کہہ ڈالو۔“ سسکتی ہوئی سگریٹ ابھی بھی علی کی انگلیوں میں دبی تھی۔

”میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔“

”جھوٹ، ہر انسان کے دل میں چار خانے ہوتے ہیں، خون بھی ہوتا ہے۔ یہ تو ڈاکٹر کا کہنا ہے، کسی شاعر یا عاشق سے پوچھو تو وہ جانے کیا الا بلا بتائے گا جودل میں ہوتی یا ہوتے ہیں۔ عشق، محبت، درد و فدا، کسی کی تصویر، تمہارے دل میں کچھ نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”آپ بول بول کر تھکتے نہیں ہیں؟“

”میں چپ رہتا ہوں تو تھک جاتا ہے۔ کبھی کسی اور کی خاموشی سے بھی تھک جاتا ہوں۔“

”کسی اور کون؟ وہ بھوری بلی؟“

”ارے وہ بڑی بے ضروری چیز ہے۔ تمہیں اس سے جینس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سگریٹ کو اپنی چپل کے نیچے مسلتا ہوا وہ بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔

”دنیا بھر کی ساری خوش فہمیاں آپ کو ہی لاحق ہیں؟“ گل رخ نے بڑے سکون سے اس کا اطمینان کو نشانہ بنایا۔

”غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے خوش فہم ہونا۔“ علی کھڑا ہو گیا۔

”اب تم نیچے جاؤ، میری نئی گرل فرینڈ کا فون آنے والا ہے۔ فون کے ذریعے تمہاری خوشبو بھی پہنچے

گئی تا تو بیک جائے گی۔“

”جاری ہوں، مجھے کوئی شوق نہیں ہے یہاں کھڑے ہو کر آپ کے ساتھ باتیں بنانے کا۔“ گل رخ نے ملاحت سے جواب دینے کی کوشش کی تھی مگر لہجہ ترخ ہی گیا۔

نیچے آئی تو پھوپھو آئی بیٹھی تھیں۔ اس نے سلام کیا تو انہوں نے ایک کرویوں گلے لگایا جیسے پتا نہیں کب کی پھنڑی ہوئی ملی ہوں۔

”ارے میری بیٹی! میں کب سے تجھے یاد کر رہی تھی۔ بڑے بھائی صاحب کے ہاں گئی تو چچا چلاؤ تم یہاں آئی ہوئی ہو۔ سب جھک کی میریں کرتی پھر رہی ہو، پھوپھو کے گھر آنے کی توفیق نہیں ہوئی؟“ اسے گلے سے دوپٹے دوپٹے انہوں نے قافہ ساری باتیں کر لیں۔

”پھوپھو! اس بے چاری کی گردن تو پھوڑیں، جو وہ کوئی جواب دے۔“ منائل مامی نے ہی مداحلت کر کے گل رخ کی جاں بخشی کر دالی۔

”کسی دن آؤں گی پھوپھو! آپ کے گھر۔“ گل رخ نے ان کی تسلی کے لیے یوں ہی کہا مگر وہ تو تڑپ ہی اٹھیں۔

”ارے واہ، کسی دن کیوں؟ بس آج ہی چلو گی میرے ساتھ۔ تمہیں لینے ہی تو آئی ہوں۔“ انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا یا بھانڈا پھوڑا۔ منائل اور زائرہ کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”پھوپھو! میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں، مجھے تو کبھی لینے نہیں آئیں اس طرح؟“ زائرہ نے لاڈ دکھائے۔

”اوہ! تم تو مل کر پانی بھی نہیں پیتی ہو، پھوپھو کو کیا فائدہ تمہیں لے جانے سے۔“ وہ بڑے مزے سے بول لگیں پھر منائل اور زائرہ کی بے ساختہ ہنسی پر ذرا ہوشیار ہوئیں۔

”ہاں، تمہیں شوق آرہا ہے تو گل رخ کے ساتھ چلی چلا۔“

”پھوپھو! پرنٹ تو بڑا پیار ہے، براڈ ڈلگ رہا ہے۔“ زائرہ نے ان کے نئے جوڑے کی تعریف کی۔

”ہاں، براڈ ڈو تو ہے۔ ابھی نیا بنایا ہے، کھل رہا ہے نا مجھ پر؟“ وہ خوش ہو کر پوچھنے لگیں۔

”آپ تو اتنی اسامٹ ہیں جو بھی پہن لیں کھل اٹتی ہیں۔“

”ارے میری پیاری پھوپھو جانی! کتنے دنوں بعد دیدار کروایا ہے۔“ علی نے آتے ہی ایک نعرہ مستانہ مارا اور ان کے گلے لگ گیا۔

”اے ہائے علی! تو کب بڑا ہوگا؟“ پھوپھو بے چاری گرتے گرتے پھیں، پھر صوفے پر ڈھلے گی۔

”تمہارے ہاں مہمانوں کو چائے پانی پوچھنے کا رواج نہیں ہے لڑکی! جاؤ ہمارے لیے کچھ لے کر آؤ۔“ علی نے گل رخ کو یوں مخاطب کیا جیسے خود مہمان ہو اور وہ اس گھر میں میزبان۔ گل رخ بیچ و تاب کھاتی ہوئی پگن میں چلی آئی۔

”بیٹی! پھوپھو کے لیے شربت بنالوں؟“ پوچھتے پوچھتے اس کی نظر مارہ پر پڑی جو گلاسوں میں گولڈ ڈرنک نکال رہی تھی۔

”مارہ لاری ہے، تم بیٹھو وہاں جا کر۔“ چچی بھی خاصی مصروف لگ رہی تھیں۔ فریق سے پگن کا پکٹ نکال کے پانی میں ڈالا ہوا تھا اور خود پیاز کاٹ رہی تھیں۔

”لائیں، میں پکا دیتی ہوں۔ بتادیں کیسے بنانا ہے۔“ گل رخ نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے چھری لینی چاہی مگر انہوں نے دی نہیں۔

”میں کر لوں گی، تم جا کر پھوپھو کو کہنی دو۔“ چچی نے اسے ٹالا پھر بڑا لے لگیں۔

”ایک تو آصف بھی یہ نہیں کرتی کہ آنے سے پہلے فون کر دے یا کھانے کے تاہم سے ایک دو گھنٹے پہلے آجائے، عین وقت پر آئے گی اور وہ بھی اچانک۔“ بولتے بولتے ان کی نظر گل رخ پر پڑی جو

”تم جاؤ بیٹا! مجھے ضرورت ہوگی تو بلاؤں گی۔“
گل رخ انجھی انجھی لاؤنچ کی طرف آنے لگی۔

”جب تک پھوپھو گھر پر ہیں، تمہاری کام کی چھٹی ہے، بیٹھ کر وہ“ علی برابر سے گزرتے ہوئے سرگوشی کر کے گیا تھا۔

”اف! یہ جاسوس پلس نیوز رپورٹر۔ چچی نے صحیح نام رکھا ہے موصوف کا چھلاوا۔“

گل رخ لاؤنچ میں پہنچ گئی۔ جہاں کولڈ ڈرنک کا دور چل رہا تھا، پھوپھو کے دونوں چھوٹے صاحب زادے اور ان سے تھوڑی بڑی بیٹی بھی موجود تھی۔

مازہ نے ایک گلاس اٹھا کر اسے دیا۔
”پھوپھو! اپنی شنگ اینورسری کر رہی ہیں اس بار؟“ زارہ نے سوال کیا۔

”وہ ہر سال اپنی شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے مناتی تھیں، سب کو بلاتی تھیں، اس بار ان کی سولہویں تقریب آ رہی تھی۔“

”ارے کہاں۔ تمہارے پھوپھو نے منع کر دیا۔ کہہ رہے تھے کہ اب یہ جو بچے اچھے نہیں لگتے، بچے بڑے ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے منہ سورا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، دل جوان ہونا چاہیے۔“ منائل بولی۔

”ہاں، یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔“ وہ پر جوش ہوئیں کوئی تو ہم خیال ملا۔

گل رخ وہیں بیٹھی رہی، چچی کے حکم کے مطابق پھوپھو کو کوئی دیتی رہی۔ یہ اور بات کہ کوئی سے زیادہ وہ ان کے سوالات کے جوابات دیتی رہی۔

چچی نے مازہ کو اپنے ساتھ لے کر کھانا تیار کر لیا تھا۔ لیکن برائی انہوں نے خلاف بنائی تھی، کوفتے بنے رکھے تھے۔ گریوی بنا کر ان کا سالن بھی تیار ہو گیا۔ ماش کی دال اور تلی ہوئی مرچیں بنائی ہوئی تھیں، چپاٹیاں بازار سے آ گئیں۔ سلاوا سیدھی تیار

گل رخ کو آج بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ بچھلے تین ہفتوں سے وہ صبح سے شام تک کام میں لگی رہتی تھی اور آج یوں ریست ملا تو ہنسن نہیں ہو رہا تھا۔ حیرت کی بات کہ منائل کو اپنا کچھ کھانا پینا نہیں آیا جس کے لیے وہ بار بار گل رخ کو دہرائی رہتی۔ کھانے کے بعد بیٹھے میں آکس کریم اور پھل تھے۔

”پھوپھو! آکس کریم زیادہ نہ کھائیے گا۔“ علی ہر تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی شوشا چھوٹنے کا عادی تھا۔

”کیوں بھی؟ مجھے تو آکس کریم بہت پسند ہے اور ویسے بھی ہمارے لیے تو آئی ہے۔“ پھوپھو نے چمک کر جواب دیا۔

”سمجھا کر گئیں نا، سوئی ہو گئیں تو پھوپھو بچا ادھر تاک جھانک شروع کر دیں گے۔“

”جی نہیں، میرے میاں ایسے نہیں ہیں۔“

”قریبان جاؤں پھوپھو! آپ کے اس یقین اور محبت پر، مگر حقیقت بھی کبھی بڑی تلخ، بڑی ظالم ہوتی ہے۔“ وہ بکا بکا کیش بن گیا۔

”کیا مطلب؟“ آکس کریم کھاتی ہوئی پھوپھو نے الجھ کر پیچھے کود نکھا۔

”مطلب یہ کہ اتنے سیدھے نہیں ہیں آپ کے مجازی خدا جو یوں آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہیں۔“

”علی! خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“ چچی جان کے صبر کا پتا نہ لبریز ہو گیا۔

”ایک شوہر اپنی معصوم بیوی کو دھوکا دے رہا ہے اور آپ کہتی ہیں، میں خاموش ہو جاؤں؟“

”جی جی بتا علی! کیا بات ہے تو نے کچھ دیکھا ہے کیا، یا سنا ہے؟“ پھوپھو آکس کریم کھانا بھول گئیں اور گھر مند نظروں سے علی کو دیکھ رہی تھیں۔

”دیکھا بھی ہے، سنا بھی ہے اور شبت بھی ہے میرے پاس۔ یہ دیکھیں۔“ وہ اب اپنی جیب سے

اسے دیکھ رہے تھے۔
پھوپھو نے موبائل اس کے ہاتھ سے لیا۔ تصویر ایک ریسٹورنٹ کی تھی، ان کے شوہر ایک خوب صورت نئی سنوری، خاتون کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔

”اے ہائے یہ تو میرے پھوپھو بھی لگ رہے ہیں؟“ پھوپھو کی آواز صدمے سے پھر گئی۔

”لگ کیا رہے ہیں۔ سو فیصد وہی ہیں۔“

”اور یہ ساتھ میں کون ہے؟“ پھوپھو کا بھولپن قابل دید تھا۔

”یہ آپ اپنے مجازی خدا سے پوچھیے۔“

”ان سے تو میں پوچھتی ہوں مگر جا کر یہ تصویر میرے موبائل میں بھیج دے گا؟“

”میں ابھی وائس ایپ کرتا ہوں۔“ علی نے پھرتی دکھائی۔

”اے ہائے، مجھ سے تو اب کچھ کھایا بھی نہیں جائے گا۔“ پھوپھو نے ایک آہ بھری اور ممکن لگا ہوں سے اپنے سامنے رکھے آکس کریم سے بھرے پیالے کو دیکھا۔

”تم کس کی باتوں میں آ رہی ہو، کھانا کھاؤ سکون ہے۔ یہ تو ایک نمبر کا ڈراما ہے باز ہے۔“ اسی نے انہیں کھلی دینی چاہی مگر وہ بے چاری اداس ہو گئی تھیں۔

”نہیں بھابھی! دال میں کچھ کالا ہے تب ہی اس بار شادی کی سالگرہ بھی منانے سے انکار کر دیا۔“

مازہ ڈراما کا لڑکے جیسے ٹوٹو ٹوٹو کر کے

”ابھی کیوں جارہی ہیں، رات کا کھانا دانا کھا کر آرام سے جائیے گا۔“

”نہ بھئی، میرے تو دل کو پچھلے لگ گئے اب کہیں سکون نہیں ملے گا۔“

”گل رخ کو لے جا رہی ہیں؟“

(اف! لڑکا) اسی نے گھور کر پیچھے کود دیکھا۔
”بس، ابھی تو نہیں لے جا رہی، بعد میں دیکھو گا۔“

جواب دیا۔

”جی جی بتا لڑکے! یہ کیا چکر ہے؟ تیرے دادا کو بھٹک بھی ہو گئی نا تو وہ جوتے لگا نہیں گے، ساری ایکٹنگ بھول کر جائے گا۔“ پھوپھو شرم پٹم بچوں کو سیٹ کر چلی گئیں اور ان کے جانے کے بعد ادا کر کے تیوروں کے ساتھ بیٹے سے مخاطب تھیں۔
”یہ کیا ڈراما تھا؟“

”کوئی ڈراما نہیں ہے ابی! جی جی کی تصویر ہے، میں نے خود کھینچا تھا اور خود ہی بیٹھی تھی یہ تصویر۔“

”جی جی بتاؤ بھائی! نوٹو شاپ تو نہیں کی؟“ مازہ کو بھی یقین نہیں رہا تھا۔

”نہیں بھئی۔“

”پھوپھو ایسے لگتے تو نہیں ہیں۔“ منائل نے خود کھائی کی۔

”کیسے؟“

”جیسا اس تصویر میں نظر آ رہا ہے۔ آخر کون ہیں یہ خاتون؟“ منائل ہاتھ میں موبائل پکڑے تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ خاتون، پھوپھو کی ایک کولیک ہیں جن کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ دونوں میاں بیوی کو انہوں نے بچ پر انوائٹ کیا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ اتفاق سے وہیں تھا۔ جا کر پھوپھو سے اور ان کے مہمانوں سے سلام دعا کی، سنی اور دو چار تصویریں بھی لے لیں۔“

”باقی تصویریں کہاں ہیں؟“ منائل کو خیال آیا۔

”یہ لو۔“ علی نے موبائل لے کر دو چار بچے اور اسکرین اس کے سامنے کر دی۔ چار، پانچ تصاویر میں خاتون کے شوہر صاحب بھی نمایاں نظر آ رہے تھے۔

”یہ غیرت انسان، ڈرامے بازی کیوں کر رہا تھا پھوپھو کے ساتھ۔ تیرے دادا سے شکایت کر دی نا

تکلیل (پھوپھو)۔ تو نے مجھے چھوڑیں گے نہیں۔“ چچی

”جی جی بتاؤ بھائی! نوٹو شاپ تو نہیں کی؟“ مازہ کو بھی یقین نہیں رہا تھا۔

”نہیں بھئی۔“

ٹرمپ کے جانشین ہوں حالانکہ وہ بے چارے تو صدر پاکستان سے بھی زیادہ بے ضرر سے تھے۔

”کچھ نہیں ہوگا، پھوپھو اپنے میاں چانی سے تھوڑا ناراض ہوں گی اور وہ اپنی پیاری اور تھوڑی سی بے وقوف بیگم کو منانے کے لیے اپنی دینگ اینوز سرسی منانے پر راضی ہو جائیں گے۔“ علی نے ہاتھ ہلا کر فقط کسی اڑادی تھی، اس کے لیے تو کوئی مسئلہ، مسئلہ ہی نہیں تھا۔

”پھوپھو کو تو ایسی فکر ہوئی فوراً ہی اٹھ کر چلی گئیں۔ پھوپھو سے جواب ملنے کے لیے۔“ مارہ نے تبصرہ کیا۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ آنکھوں دیکھی اور کانوں کی بات پر بھی یقین نہیں کرنا چاہیے۔ سوال یہ سوال کر کے اگلے بندے سے وضاحت لے سکتی چاہیے۔ اب پھوپھو نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، بس تصویر دیکھ کر فوراً سمجھ لیا کہ یہ تصویر ایک سچ ہے اس کے پیچھے بھی ایک سچائی ہے، اس حقیقت کو جاننے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔“

”اب تم رپورٹر بن گئے تو سب کو اپنی طرح جاسوس بناؤ گے، ہر خبر کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔“ منائل بولی۔

”کیا حرج ہے یہ میڈیا ورلڈ ہے، ہر دیکھی اور سنی جانے والی چیز کی پرکھ ضروری ہے۔ آنکھیں بند کر کے، یقین کرنا بے وقوفوں کا کام ہے۔“ اس کے مخاطب تو جملہ حاضرین تھے مگر نظریں فقط گل رخ پر جمی تھیں، جنہیں محسوس کر کے وہ جزیر ہو رہی تھی۔

”میری تو سمجھ سے باہر ہے یہ تیری نوکری۔ نہ کوئی جانے کا نام ہے، نہ آنے کا یا تو سارا سارا دن گھر میں گزارنا ہے، لپ ٹاپ کے آگے یا آدھی آدھی رات کو گھر میں گھٹتا ہے۔“ اسی نے اپنے لاڈ لے مگر عجیب و غریب بے کو گھوڑا۔

”ہائیکو تو فانی کی نوکری تو کر کوئی کر رہا ہے۔ مزا تو تب ہے جب انسان اپنے کام کو عبادت سمجھے یا

تھکن کی پردا کے بغیر۔“

”خدا خیر کرے، علی بھائی اور فلاسفی۔ خدا جانے کس کس پر اوقات آنے والا ہے۔“ زائرہ نے بولتے ہوئے اپنے بالوں کو کچھ میں جکڑا۔ گل رخ برتن دھونے کچن میں چلی گئی، بچی کو اچانک ہی یاد آیا تھا علی کو بل بھرنے کو دیا تھا۔

”بل بھرنے دیا تھا؟“ وہ بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔ ”بالکل۔“

”سازھے پانچ سو بچے ہوں گے، کہاں ہیں؟“

”کیا، یہ معمولی معمولی رقموں کا حساب لیتی ہیں آپ امی حضور۔“

”دو کلو چکن آتی ہے اس میں۔“ امی نے بتایا۔ ”دو کلو چکن،“ آپ کے بیٹے کے جذبات اور جیب سے بڑھ کر ہے؟“ اف کیا دور آ گیا ہے۔ پہلے زمانے کی مائیں اپنی اولاد پر واری صدے جاتی تھیں اور ایک آج کل کی مائیں ہیں، پانی پانی کا حساب رکھتی ہیں۔“ علی کی ایک ننگ کا کوئی وقت تھوڑی مقرر تھا، جب دل چاہے، اس کا تھیر شروع ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

گہری کی شدت میں کچھ کی آچلی تھی، بڑی پیاری ہوائیں چل پڑی تھیں۔ نہ بہت گرم نہ بالکل سرد، اسے خوش گوار موسم میں ایک گلابی سی شام منائل نے ایک گول منسل، اسے جیسی خوب صورت بی کوشم دیا۔ گھر میں خوشی کی لہر پھیل گئی، بچی اسے خضیاں میں بھی پکلی تھی اور دھکیلاں میں بھی۔ سسرال والے اسپتال بھی آئے پھر چھٹی کے بعد جب وہ گھر آ گئی تو شوہر صاحب ساس اور سرور دوبارہ بھی آئے، خوشی کا اظہار تو کر رہے تھے بہت، پھر بھی ساس ایک موقع پر بول ہی پڑیں۔

”چھٹی اولاد بیٹا ہو تو ذرا اچھا رہتا ہے۔ جلدی بڑا ہو کر باب کا بازو بنتا ہے۔“ اچھی تو خبر بی بی بھی ہوتی تو ابھی

مہنگائی کے دور میں بی بی ایک ہی کافی ہے۔“ اور ان کی تقریر بھی مزید جاری رہتی مگر ان کے بیٹے نے آگے بڑھ کر بچی کو گود میں اٹھالیا اور پیار کرنے لگا اور شوہر صاحب نے کھنکھار کر حالات حاضرہ اور سیاست پر گفتگو شروع کر دی۔

بچی کی پیدائش کے بعد گل رخ کا کام اور ذمہ دار یوں کا بوجھ مزید بڑھ گیا تھا۔ بچی کی ہدایات کے مطابق منائل کے لیے پرہیزی ناشتہ اور کھانے بنانی اور بانی گھر والوں کے لیے وہی معمول کے مطابق پکنا۔

وہیے چچی خود بھی کبھی کبھی اس کے ساتھ لگ جاتی تھیں۔ زائرہ موڈی تھی، دل چاہتا تو سلاہ وغیرہ بنا لیتی یا کبھی کبھی جانے بیٹھتی، اس سے زیادہ کی توقع اور امید رکھنا فضول تھا۔ مارہ گھر کے کاموں کے معاملے میں بڑے لبا کی بی بی نوشی کی بہن تھی۔ بقول چچی کے، اسے تو کچن میں کھڑے ہونے کے نام سے موت آتی ہے، دونوں کے پاس اپنی پڑھائی کا بہانا موجود تھا، یہ بہانا نہ بھی ہوتا تو مفت کی ملی بے زبانی نوکرائی کے ہوتے ہوئے کون بے وقوف کام کی زحمت کرے گا؟

منائل کے لیے منٹن کا سالن پڑھا کر اس نے گھر کے لیے دال نکال کر بھگو دی۔ چچی نے دال چاول پکانے کو کہا تھا۔ رات کا لوکی گوشت بھی رکھا تھا۔ وہ آٹا نکال کر گوندھنے لگی، منائل اور چچی کی روٹی بکلی تھی۔ ابھی آٹے میں پانی ملا ہی رہی تھی کہ وہ بلائے جان پھر نازل ہو گیا۔

”پھر کیا سبق سیکھا آپ نے اپنی اور اپنے والدین کی زندگی سے؟“ وہ آتے ہی بات یوں شروع کرتا تھا، جیسے بہت دیر سے اسی موضوع پر بات کر رہا ہو۔

”آپ بتائے، آپ کو کیا سبق مل رہا ہے میری اور میرے والدین کی زندگی سے؟“ گل رخ آٹا، پانی اور نمک کیجان کر کے سمیٹنے لگی۔

”بھئی کہ بندہ اگر پسند کی شادی کرے تو دولت

مند سے کرے، تاکہ اگر بعد میں اولاد کو اکیلا چھوڑ جائیں تو اسے کسی کی نوکرائی یا نوکر نہ بننا پڑے۔“ علی بڑا بد لحاظ اور ظالم بھی تھا، رخصتوں پہ نشتر چلانے میں تو اسے کمال حاصل تھا۔

گل رخ نے ایک نظر اسے دیکھا اور چپ چاپ آنے میں کیاں مارنے لگی۔

”اسی لیے میں نے ایک مال دار اسامی کو بھانس رکھا ہے، کل کو ہم دنیا میں نہ ہوں تو ہماری اولاد کو ور پدر انہوں کی یا دوسروں کی غلامی نہ کرنی پڑے۔“

بولنے کے دوران اس نے فریق سے کچھرا ٹھانڑ، بندہ کو بھی، نکال کر اس نے دھو کر کاؤنٹر پر رکھیں اور ایک ایک کر کے کنگ پورڈ پر رکھ کر کاٹنا شروع کر دیا تھا۔

”میرے پاس ڈھیروں دولت ہوتی تو آپ کی طرح کوئی لاہی اور اپنی غرض کا شخص مل جاتا، کھانے کا سودا تو وہ بھی ہوتا۔“

گل رخ کی سادگی سے کئی بات پردہ ایک لمحے کو لا جواب ہوا تھا، اگلے ہی لمحے نیا پیترا بدل کر میدان میں آ گیا۔

”اسے بارے میں سوچ کر کبھی احساس کمتری نہیں ہوتا؟ دکھ نہیں ہوتا؟“

گل رخ آٹا گوندھ چکی تھی، اسے ڈھک کر ایک طرف رکھا اور ہاتھ دھونے لگی، ہاتھ دھو کر اس نے دال پکنے کو کھادی۔

”کیا بات ہے میرا سوال برا لگ گیا کیا؟“

”نہیں، برا تو نہیں لگا۔ دراصل ابھی تک اتنی سنجیدگی اور تفصیل سے اس بارے میں سوچا نہیں۔“

”اچھا تو پھر تم کیا سوچتی ہو؟“ علی کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس گل رخ کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”میں.....“ گل رخ نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں یہ سوچتی ہوں کہ میرے والدین اور بہن بھائی نہیں ہیں، پھر بھی میں عزت اور تحفظ کے ساتھ

ایک چار دیواری میں ہوں۔ میرے پاس کچھ قریبی رشتے موجود ہیں، جن میں کچھ خود غرض بھی ہیں اور تھوڑی اپنائیت بھی ہے اور میری چھوٹی بڑی بہت سی ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں، جن کے لیے مجھے گھر سے باہر نکل کر محنت کر کے کمائنا نہیں پڑتا، میری دامنی اور جسمانی نشوونما میں کوئی عیب، کوئی کمی نہیں ہے۔ میں گمن نہیں سکتی، بیتائیں سکتی، مجھے اللہ نے کتنا نوازا ہے۔“

علی گنگا بورڈ اور کھرے، پیاز کو فراموش کر کے حیرت سے اسے تنک رہا تھا، جو اس کی نگاہوں سے بے نیاز اپنے کام میں مگن تھی۔

”اتنا میرا شکر تہا رے اندر کہاں سے آیا؟“
”پتا نہیں، شاید والدین سے ہی آیا ہوگا، جن کے اوپر پسند کی شادی کا کیل لگا ہوا ہے۔“ ایک پھینکی سی مسکراہٹ گل رخ کے لبوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔
”کیا مطلب؟“

”آپ جاسوس جمع صحافی ہیں، سراغ لگائیں برسوں پہلے جن لوگوں نے یہاں سے دور جا کر اپنی دنیا آباد کی، اس کے پیچھے کیا کہانی تھی؟“
”چلیج دے رہی ہو مجھے؟“

”جی ہاں!“ اہلٹی ہوئی دال کے اوپر جمع جھاگ کو جھجے سے نکالتے ہوئے گل رخ نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

☆☆☆

ہواؤں نے تیور بدلنے شروع کر دیے تھے، موسم کسی بد مزاج انسان کی طرح خشک ہونے لگا تھا اور ذرا سرد مہر بھی، ہواؤں نے بھی یہی رنگ ڈھنگ اختیار کرنا شروع کر دیے تھے، زائرہ اور مائرہ دونوں نے قسم قسم کے موچر اندر رکھا استعمال زیادہ کر دیا تھا۔ مائرہ کو اپنے ریشمی بالوں کی لنگر ہو چلی تھی جو سرد موسم کا آغاز ہونے ہی اس کے سر سے یوں جھڑنے کو تیار ہو جاتے جیسے خزاں آلود پتے درخت سے.....

ایسی ہی ایک خشک اور بے کیف شام مائرہ، گل رخ کے پاس آئی تھی۔

”ذرا تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ بازار چلو گی؟ ایک دوست کا برتھ ڈے ہے گفٹ لینا ہے۔“
”کتنی دیر لگے گی؟ رات کا کھانا پکانا ہے۔“

”بہت زیادہ بھی لگا تو ایک گھنٹہ، بس سمجھ لو، آنے جانے میں تاخیر نہ ہو، گفٹ میں پھیلے ہفتے دیکھ کر آئی تھی، وہی مل گیا تو لے لوں گی ورنہ کچھ اور خرید لوں گی، مگر زیادہ وقت نہیں لگے گا، مجھے بھی آ کر اسے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔“ گل رخ کا اندیشہ زائل کرنے کے لیے مائرہ نے پوری ایک تقریر جھاڑ دی تھی۔

”اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔“ گل رخ اس کی تقریر سے شاید بھرا گئی تھی۔

”تم جب تنک ساتھ منہ دھو کر چہچ کر لو، میں آتی ہوں۔“ مائرہ چلی گئی، گل رخ کی تیاری میں گھنٹہ بھر نہیں لگتا تھا، خلاف توقع مائرہ بھی جلدی آ گئی۔
”چلیں؟“

”چلی کو بتا دیا؟“
”ہاں۔ میں نے بتا دیا ہے۔“

”جلدی چلو۔“ مائرہ ادھر ادھر توجہ دینے کے بجائے تیز تیز چل رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسے بھی تھکات رہی تھی۔

میں روڈ پر آ کر وہ کھڑی ہو گئیں۔ مائرہ اپنے فون میں لگی ہوئی تھی۔

”کیسے جا نہیں سمجھے؟“ گل رخ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”فون کر دیا ہے میں نے، ابھی آ جائے گی سواری۔“

ماائرہ نے تسلی دی، گل رخ نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ کہیں بھی آنے جانے میں آن لائن سواری کی سہولت سے فائدہ اٹھاتی تھیں، وہ مطمئن ہو گئی۔
بیشکل بائج منٹ لینڈ سفید کار آ کر رکی۔
”چلو بیٹھو۔“ مائرہ نے گل رخ کو ٹھوکا دیا۔

”پہلے کفرم تو کر لو، وہی ہے، جسے بلایا تھا۔“
گل رخ نہ جانے کیوں کنفیوز ہو رہی تھی۔

”ہاں بھئی۔ وہی ہے، تم بیٹھو تو۔“ مائرہ نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اسنے میں ڈرائیور نے فرسٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

”ماائرہ! تم تو بیٹھو۔“ وہ کھڑکی سے سر نکالے مائرہ سے مخاطب تھا۔ گل رخ، اس کے یوں بے تکلف انداز پر شدید رگڑ گئی۔

”کون ہے یہ؟ اور تمہیں کیسے جانتا ہے؟“ وہ یکدم پیچھے ہٹی۔

”انورہ۔“ مائرہ جھپٹائی۔ ”تم بیٹھو تو سہی، میں ساری بات بتاتی ہوں۔“

”نہیں، مجھے نہیں بیٹھنا۔“ گل رخ بدک گئی تھی۔

”کیا یار؟ تم سمجھا کر نہیں لاتی تھیں اسے؟ تم تو کہہ رہی تھیں سب کچھ سیٹ ہے، کوئی پرالیم نہیں ہے۔“ کار میں بیٹھے اس ہینڈ سم نو جوان کا لہجہ درشت تھا، مائرہ، گل رخ کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ریان! پلیز تم تو خاموش ہو جاؤ، وہ بیٹھ رہی ہے تا۔ گل تم۔“ مائرہ اس سے کچھ کہنے جا رہی تھی، مگر گل رخ نے بات کاٹ دی۔

”مجھے تمہارے ایسے ارادوں کا علم ہوتا تو کبھی تمہارے ساتھ نہ آتی۔“ اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

”تم اسکی نہیں آ سکتی تھیں۔ کیا ضرورت تھی، کسی کو ساتھ لانے کی؟“ ریان مائرہ پر برس رہا تھا۔
جواباً مائرہ کو بھی غصہ آ گیا۔

”تایا تو تھا، امی ایک بار تمہارے ساتھ دیکھ چکی ہیں مجھے، انکی گھر سے نہیں نکل سکتی، اسی لیے اس ڈفر کو ساتھ لائی گئی، مجھے کیا پتا تھا یہ اتنی اکر دکھائے گی۔“ مائرہ اسے جواب دے کر گل رخ کے پیچھے بھاگی، جو تیز تیز قدموں سے جا رہی تھی۔

”پلیز گل! اس آج کی بات ہے، ایک بار کی، میرے ساتھ چلو ورنہ ریان مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔“

”فصل باتیں مت کرو مائرہ!“ گل رخ نے

خفی سے جواب دیا۔

”تم خود کو چھٹی کیا ہو؟“ مائرہ کو ٹپس آ گیا۔
”میں، خود کو کچھ نہیں سمجھتی، تم ذفر سمجھتی ہو مجھے، مگر اس ذفر کو یہ معلوم ہے کہ اپنی اور اپنی عزت کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے اور اس ذفر کو یہ سکھایا گیا ہے کہ والدین کو دھوکا دے کر نہ عزت ملتی ہے نہ محبت۔“
گل رخ کی آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی۔

”اور کس نے سکھائی تمہیں یہ بات، جنہوں نے خود گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی؟“ مائرہ نے بے حکم ظفری بلکہ کینگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

گل رخ کا ضبط اچھا کو بیچ گیا، اپنی بیسکتی ہوئی آنکھیں اس نے خفی سے پوچھ ڈالیں اور تیز قدم اٹھانے لگی۔ یہ خیال کیے بغیر کہ مائرہ اس کے ساتھ ہے یا کتنی پیچھے، اس وقت وہ نہ مائرہ کی شکل دیکھنا چاہتی تھی نہ اس کی آواز سننا چاہتی تھی۔

☆☆☆

رات میں بڑے ابا اسے لینے آئے تھے ساتھ میں روٹی بھی آئی تھی۔

”ہاں بھئی، مزید رکے کا دل ہے یا گھر چلو گی؟“ وہ گل رخ سے مخاطب ہوئے۔

”گھر چلوں گی۔“ گل رخ ان کے کہنے سے پہلے ہی، ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔

”تمہارا چلیج یاد ہے، آدمی اسٹوری معلوم ہو گئی ہے۔“ چلتے سے پہلے علی اس کے پاس آیا۔

”بائی آدمی بھی معلوم کر لیں پھر چلیج پورا ہوگا۔“

☆☆☆

وہ تایا ابا کے گھر واپس آ گئی تھی، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی اور فقط دو ماہ میں بھلا کیا تبدیلی آئی تھی۔ تائی ای نہ پر جوش تھیں نہ سرد مہر، نوشی مطمئن تھی کہ اس کے سر سے بچنے کے کاموں کا بوجھ ہٹ جائے گا۔ روٹی بے غرض تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کی ٹیبل واپس آ گئی۔ اشعر معمول کے مطابق بے نیاز اور لا پرواہ۔

تائی اسی اور نوشی نے رکی حال احوال پوچھا، روئی دیر تک اس سے اپنے اسکول، سہیلیوں، ٹیچر، پڑھائی اور اپنی پسند کے ڈراموں کی باتیں کرتی رہی۔ رات گئے تک نوشی سو بائیں میں لی ہوئی تھی، بڑے ابا ہٹائی اسی اور اشعر بھائی سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ روئی بھی دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے سو گئی۔ ایک گل رخ بھی تھی جس کی آنکھوں میں نیند آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

خاموشی سے اٹھ کر وہ لنگی میں جا کھڑی ہوئی۔ دور تک پھیلے ہوئے شہر میں کہیں روشنیاں نظر آرہی تھیں، کہیں تاریکی، جیسے کسی کی زندگی، جس پر بھی احوال کا راج ہوتا ہے۔ بھی اندھیروں کا، وہ کتنی ہی دیر کھڑی اندھیروں اور اجالوں کا سگم دیکھتی رہی۔ رات گئے تک بھی سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ ہوا میں خنکی گھلنے ملنے لگی تھی۔ ٹھنڈ زیادہ محسوس ہوئی تو وہ آ کر لیٹ گئی۔

ماڑہ کی حرکت نے، اس کے لیے روئے اور لفظوں نے اسے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ ماڑہ کی اخلاقیات کی جھلکے دار نہیں تھی مگر اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے غیر اخلاقی معاملات میں گل رخ کا استعمال کرے اور پھر اس کا اہانت آمیز رویہ، توہین آمیز الفاظ، جن کی گونج ابھی تک گل رخ کے کانوں میں بائی تھی۔

اس نے آج تک خود کو اتنا بے بس اور حقیر محسوس نہیں کیا تھا، اس وقت بھی نہیں جب اس کی اسی کا انتقال ہوا تھا اور وہ اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ مگر آج اس کے احساسات کچھ مختلف تھے، آج اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اپنی زندگی میں بہت سی کمیوں کا، اسے آج محسوس ہو رہا تھا کہ ایک انسان کے لیے اس کا اپنا گھر اور اس گھر میں اس سے بڑے رشتے کتنے ضروری، کتنے اہم ہوتے ہیں۔ جن سے وابستہ فرد، خود کو اس معاشرے میں مضبوط سمجھتا ہے۔

ماڑہ نے اسے بے مول کر دیا تھا۔ اپنے

خیالوں میں الجھے الجھے اسے کب نیند آئی، پتا نہ چلا۔

☆☆☆

دونوں بہنوں میں محبت تھی، ان کے شوہروں کے درمیان عداوت، محل کرکھی جھگڑا نہ ہوا تھا، بظاہر میل ملاپ تھا مگر اندر ہی اندر نفص، کینہ اور عداوت کی آگ بھی جودونوں کے دلوں میں جل رہی تھی، اس کی بنیاد کب پڑی، کچھ پتا نہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے جب بنیاد پڑ گئی تو اس پر نفص و عداوت کی عمارت بلند سے بلند ہوتی رہی۔

حفیظہ بیگم کی شدید علالت نے انہیں ہسپتال پر پہنچا دیا تھا۔ ان کی آخری خواہش کے آگے شوہر اور بہنوں خاموش ہو گئے۔ زہیر اور عدیلہ کا نکاح کر دیا گیا۔ رخصتی چھ ماہ بعد تھی، ابھی تو عدیلہ کا انتر بھی مکمل نہیں ہوا تھا اور زہیر کی کہیں نوکری نہ تھی، مگر یہ چھ ماہ گزرنے سے پہلے ہی حفیظہ بیگم وفات پا گئیں۔

عدیلہ کا انتر اور پھر بی۔ اے بھی مکمل ہو گیا۔ زہیر کو نوکری بھی ملے ایک عرصہ ہو گیا مگر عدیلہ کی رخصتی عمل میں نہیں آ رہی تھی، اس کے والد کا اصرار تھا۔ زہیر کے ابا آ کر خود رخصتی کے لیے التجا کریں، ادھر زہیر کے والد کی ضد تھی کہ ہم زلف ان کے گھر آ کر بارات لانے کا نہیں، اسی ضد بحث میں وقت گزر رہا تھا مگر محل کوئی نہیں نکل رہا تھا۔

ان ہی گزرتے دنوں میں ایک روز عدیلہ کی والدہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہو گئیں، عدیلہ سے ایک سال چھوٹے بھائی ناظم کا غم و غصے سے برا حال تھا اگر مناسب وقت پر رخصتی ہو جانی تو ایک ماں اپنی بیٹی کی خوشیاں اور بستا ہوا گھر دیکھ سکتی مگر دو اپنا رستوں کی بے کار ضد، زعموں کو مردہ اور زندہ درگور ہوتے ہوئے دیکھ کر قہقہہ لگا رہی تھی۔

زہیر کے آبانے اس کی دوسری شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔ عدیلہ کے والد بھی کچھ کم نہ تھے انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنی مرضی سے خلع کا نوٹس بھیج دیا۔ عدیلہ کا گھڑ کی پٹائی بنی اپنے نصیب کو تماشا بننے دیکھ رہی تھی۔ مگر کچھ ہونے کی تاب بھی نہ بجالا،

بالا خر ناظم نے ہی فیصلہ کن قدم اٹھایا۔ اس قدم کو اٹھانے کی ہمت اور شہزیر نے ہی بھی جو اپنے بڑوں کے اس ہتاشے سے جگ اچکا تھا۔

نکاح کے دو بولوں سے پہلے ہی من موہنی عدیلہ نے اس کے دل میں گھر بنایا ہوا تھا، نکاح کے بعد دل کا یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا اب اس لڑکی اور اس رشتے کو کھونا سوہان روح تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی اور ناظم سے بات کی۔ نوکری کے سلسلے میں سکھ تبادلہ ہو رہا تھا، رہنے کے لیے ایک چھوٹے سے مکان کا بندوبست وہ کر آیا تھا۔

ناظم نے ایک صبح جیسے ہی اپنا اپنی ڈیوٹی پہ گئے، زہیر اور بڑے بھائی جان کو بلا کر اپنے گھر سے اپنی بڑی بہن کو رخصت کر دیا۔ جب بڑے اپنی انا اور ضد کے پہاڑ تلے اولاد کو پسینے پر تل جائیں تو چھوٹوں کو بڑا بن کر فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ باب کی ضد اور انا کو اچھی طرح جانتا تھا اور زہیر کے والد یعنی اپنے خالو کی خلعت سے بھی خوب واقف تھا۔

اپنے چھوٹے بھائی، بہن کی محبت اور دعاؤں تلے رخصتی کو عدیلہ کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر دوسری صورت پھر یہی ہوتی کہ اس کے لیے خلع لے لی جاتی، جو اسے کسی صورت منظور نہیں تھی، وہ رخصت ہو کر زہیر کے سنگ چلی تو گئی مگر یہ خوشی بڑی عجیب تھی، ادا کی اور آنسوؤں کے ہالے میں لیٹی ہوئی۔

عدالت کا بوجھ اٹھائی ہوئی خوشی اس کے ہمراہ عمر بھر رہی۔ دونوں کو زندگی بھر اجازت نہیں ملی کہ اپنے اپنے باپ کے گھر آ سکیں یا اپنے بہن بھائیوں سے مل سکیں۔ انتقال پر ان کے جنازوں نہ آئے اور پھر واپس چلے گئے، زندگی وہاں سیٹ ہو چکی تھی، یہاں خاندان بھر میں ان کے متعلق یہی بات چیلی ہوئی تھی کہ دونوں نے اپنی مرضی سے اپنا گھر خود ہی بسالیا۔

ناظم نے زہیر کے بڑے بھائی نے وضاحتیں پیش کیں مگر ان لوگوں کے صفائیاں پیش کرنے کو اقرار یا پروری کہا اور سمجھا گیا۔ اس معاشرے میں متنی باتوں

کو پھیلنے میں نہ دقت ہوتی ہے نہ وقت لگتا ہے۔

☆☆☆

موڑ سائیکل وہ ہمیشہ کی طرح احتیاط کے ساتھ چلا کر گھر واپس جا رہے تھے، گھر سے پچھلے اسٹاپ پر جہاں گیراج اور دکانوں کے آگے بے تحروں پہ چھترے چھانٹ اور ہر کام سے فارغ آدھارہ گروہوں کا مجمع سا لگا رہتا تھا۔ ان ہی میں ایک راجا کا گروپ تھا جس میں چڑی موالی زیادہ تھے، عثمان صاحب کے لیے یہ منظر روز کا معمول تھا مگر آج وہ بری طرح چونکے تھے، ان چڑی موالیوں کے بیچ میں ان کا بیٹا بیٹھا سولے لگا رہا تھا، انہیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔

دل تو چاہا کہ موڑ سائیکل روک کر وہ چھتر لگا کر اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں مگر ایک تو وہ قدم میں ان سے کتنی دوا چٹھکا ہوا ہی تھا، پھر ایک خیال اور آیا تھا، وہ خاموشی سے موڑ سائیکل آگے بڑھا گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سیدھے بیٹے کے کمرے میں گئے، بیگم بھی ان کے پیچھے پیچھے آئیں۔

”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ بیگم نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

ڈیوٹی سے آتے ہی اپنے روزمرہ معمول پر عمل کرنے کے بجائے وہ سیدھے بیٹے کے کمرے میں پہنچے تھے جبکہ بیٹا گھر میں بھی نہیں تھا۔

عثمان صاحب، بیگم کی تشویش اور سوالوں کا جواب دینے کے بجائے الماری اور دراز میں کھول کھول کر دیکھ رہے تھے اور ایک دراز میں جو کچھ رکھا ہوا تھا، وہ دیکھ کر انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”کیا بات ہے؟“ بیگم حیران پریشان آگے آئیں۔

”لو، دیکھو اپنے بیٹے کے کمرے، نشہ کرنے لگے ہیں صاحبزادے۔“ عثمان صاحب یک دم ہی بھٹ پڑے تھے۔ دراز کھلی ہوئی تھی جن میں سے انکشن، سگریٹ کی ڈیا اور پلاسٹک کی ٹھیلی میں بھجورا

بھورا سا مسکون تھا۔ بیگم صاحبہ نے آگے بڑھ کر دیکھا اور اپنا دل تھام لیا۔

”یہ کیسے ہو گیا؟“ ان کی کیفیت اور حالت بھی شوہر سے مختلف تھی۔

”تم بتاؤ؟“ تم تو کہہ رہی تھیں کہ کسی اخبار میں جاب کرنے لگا ہے۔ مجھے تو اس کی نوکری پہلے بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ کیسی نوکری ہے، جب دل چاہا گھر پر، جب موڈ ہوا، گھر سے غائب، اب دیکھو، یہ ہے اس آوارہ کی مصروفیت اور نوکری، اس وقت بھی راجا کے اڈے پر دیکھ کر رہا ہوں اسے، چری، موالی پار دوستوں کے ساتھ بیٹھا دھوئیں میں جانے کون سے غم اڑا رہا ہے۔“ عثمان صاحب کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”اف خدا یا، ہم سے کیا کوتاہی ہو گئی اس کی تربیت میں، جو وہ اس راستے پہ چل نکلا۔“ بیگم عثمان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”تب ہی وہ مجھ سے آئے دن رئیس اینٹھارہ پتا تھا، میں نے بھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے پیسے لیتا ہے، پتا ہوتا تو ایک چوٹی بھی نہیں دیتی۔“

وہ رندھی ہوئی آواز میں بول رہی تھیں، اسے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

دونوں میاں بیوی نے دروازے کی سمت دیکھا جہاں بے فکری سے بیٹھ بجاتا ہوا علی ان دونوں کو وہاں دیکھ کر اک دم ساکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

موسم سرد اور خشک ہو گیا تھا۔ درختوں نے سونا اوڑھ لیا تھا جہاں جہاں بھی سبزہ تھا، زردی کے پیراں میں لیوس ہو رہا تھا۔ گل رخ کا دل نہ جانے کیوں اداس ہو چلا تھا۔

باہر کا موسم اگر گل کے موسم پر اثر انداز ہوتا ہے تو آج کل کا موسم گل رخ کے اندر تک سرایت کر رہا تھا۔ کچھ بڑے لبا کے گلر کا ماحول عجیب و غریب ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بڑے لبا اور اشعر کے ڈیوٹی پہ جانے کے بعد ہر دوسرے تیسرے

روز عام بھائی آتے اور بڑی ای کے ساتھ طویل بیٹھک کر کے جاتے، اندر کمرے میں بیٹھے دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہتے تھے، نوشی کو اس سب سے کیا، گھر کے کسی معاملے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اس کی دنیا اس کے اسارت موبائل سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔

گل رخ گھر کے کاموں سے فارغ ہوتی تو بڑی ای سلائی کے لیے کچھ نہ کچھ تھام بیٹیں، اسے کام کرنے میں کوئی عار نہ تھا مگر بس ایک عجیب پر اسرار سے حالات سے اسے وحشت سی ہو رہی تھی، عامر بھائی کی کبھی کبھی متنی خیز نگاہیں اسے شدید الجھن میں مبتلا کر دیتیں اور ایک روز یہ راز گل رخ کی گھبراہٹ رات گئے وہ حسب عادت بالکٹی میں کھڑی دروازہ تک پھیلے اس شہر کے اندھیروں اور اجالوں کے سنگم کو دیکھ رہی تھی۔

بڑے لبا کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔ وہ اپنی بیگم سے مخاطب تھے۔

”میں نے آج بات کی تھی اشعر سے گل رخ کے لیے۔“

”کیا؟“ نانی یوں اچھلیں جیسے پھونے کاٹ لیا ہو۔

”میں نے کہا اس نے، میں نے کہا بھی کہ شیم بچی ہے، سہارا دے دو، ثواب کا کام ہے، مگر ماما ہی نہیں۔“ بڑے لبا کی آواز سے بے حد مایوسی جھلک رہی تھی۔

”اب جوان جہاں اولاد یہ کہاں زور پتا ہے؟“ وہ پہلے والا دروازہ ہی ہے کہ پڑا کر کسی بھی کھونٹے سے باندھ دو۔“

نانی ای چمک کر بولی تھیں، ویسے تو انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اشعر نے انکار کر دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجازی خدا کی بات سن کر چونک پڑیں۔

”عثمان کی زائرہ کے لیے کہہ رہا ہے کہ وہاں رشتہ دے دیں۔“

”پاکل ہوا ہے کیا، اماں بھی بیٹیاں بھی، سب ایک سے بڑھ کر ایک خیرے بیٹی ہیں، مشکل ہی ہے، ہاں کریں۔“ وہ صاف کوئی سے بولیں۔

”مجھے تو گل رخ کی فکر کھائے جا رہی ہے، کیا ہوگا اس بچی کا، اپنے ہوں یا پرانے، ہر کوئی پیسے کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ سب کو مال دار سرال چاہیے۔“

”ایک بات کہوں، بھڑک مت اٹھنا، ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔“ بڑی ای نے کچھ کہنے سے پہلے تنہید باندھی۔

”کہہ دو تم بھی، کیا بات ہے۔“

”عامر اپنی بیوی کو چھوڑ رہا ہے۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔

”کیا پھر جھگڑا ہو گیا دونوں میں؟“ وہ بیزار ہو کر بولے۔ دونوں میاں بیوی کے جھگڑے اب معمول بن گئے تھے۔

”جھگڑا تو کب سے ہے، لیکن یہ بتاؤ، کب تک رہے گا، جنہیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ تمہارا بیٹا اولاد کا سکھ دیکھے۔ یہ گورت تو بانجھ ہے، اس سے تو اولاد نہیں ہو گی۔“

”معاذ کیا ہے؟“

”عامر تو طلاق دینے کو بیٹھا ہے، مہر کی رقم کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ کہہ رہا تھا ایک بار آتا ہے بات کروں، پھر فیصلہ کر دوں گا۔“

”جب سارے کام خود ہی کر لیے تو اب مجھ سے کیا پوچھتا رہا گیا؟“

”میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے تو گل رخ کے ساتھ نکاح کر دیں گے اس کا۔“

”کیا؟“ بڑے لبا واقعی بھڑک اٹھے تھے۔

”دیکھو، میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ٹھنڈے دل سے میری بات سننا اور غور کرنا۔“

”بات بھی تو کوئی ذہن کی ہو۔“

”کیا برائی ہے اس میں؟ دس سال پہلے جب عامر نے شادی کی تھی تو تیس سال کا تھا، اس چنڈال نے سٹکی کرا کے اپنے قابو میں کر لیا تھا تب ہی آؤ

دیکھنا تاؤ کیا وہ کر لیا تمہاری بھتیجی سے دس سال ہی بڑا ہو گا۔ اس سے زیادہ، زیادہ فرق کی شادیاں ہم نے دیکھی ہیں، پھر عیب کیا ہے اس میں، مختصی ہے، اچھا لکھا ہے تمہارا بیٹا ہے، چھوٹے سے کرنے پر راضی ہو لڑکی کو تو بڑے کے لیے سوچ لو۔“

”پھر بھی..... کہاں عامر، کہاں وہ.....؟“ بڑے لبا متذبذب تھے۔

”شکل صورت میں اب بھی ہزاروں میں ایک ہے میرا بیٹا، اس کو تو کوئی بھی لڑکی مل جائے گی۔ تمہیں کیا خبر، لڑکیوں کے رشتوں کے کتنے مسائل ہیں۔“

لوگ بچوں والے کو بھی اپنی کنواریاں بیاہ دیتے ہیں۔ مجبوری کی وجہ سے، اب اس تنظیم بچی میں کیا میرے لگے ہیں؟ دو چار سال یونہی گزر گئے تو عامر جیسا رشتہ بھی نہ ملے گا۔“

بڑی ای اپنی تقریر کر کے خاموش ہو کر سو گئیں مگر اس رات بڑے لبا اور گل رخ دونوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”تم ہی منہ اپنے لاڈ لے سے۔“

عثمان صاحب غصے اور کوفت کے مارے کمرے سے ہی باہر نکل گئے، سچ تو یہ تھا کہ بیٹے کی شکل دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ انہیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان کا کھلنڈرا اور شوخ و شریر بیٹا کس راستے پہ چل نکلا ہے۔

”ارے بیٹا! یہ تو نے کیا کیا؟“ ای تو اسے دیکھتے ہی کراہ اٹھی تھیں۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ اب بھی انجان بن رہا تھا۔

”تو سگریٹیں پینے لگا ہے، وہ بھی بھری ہوئی؟“ ای نے ڈائریک بات کی ان کا چہرہ اور لہجہ صدمے سے چور تھا۔

”کیا ہو گیا ہے ای! کیا خواب دیکھ لیا رات

سوچتے ہیں؟“ علی نے ایک قہقہہ لگایا اور ان کے پاس بیٹھ بیٹھ گیا۔
 ”اچھا تو یہ سب کیا ہے؟“ انہوں نے مکلی دروازے کی طرف اشارہ کیا، جس میں انکشن، سگریٹ اور سفوف کے پیکٹ تھے۔

”یہ تو میرے دوست کی چیزیں ہیں، ابھی واپس کر کے آتا ہوں۔“ اس نے پھرتی سے ساری اشیاء سمیٹ کر ایک شارپ میں ڈالیں۔
 ”تیرے ابو نے دیکھا تھا ابھی، تو راجا کے اڈے پر ان چری موالی لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور..... آگے ای کی آواز دندھ لگی۔

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا اتنا ذہین، لائق فائق بیٹا کس دلدل میں جا گھسا ہے، مگر علی ہمیشہ کی طرح مطمئن ہو کر انہیں تسلیاں دے رہا تھا۔

”کوئی ایسی بات نہیں ہے ای! وہ تو میں وہاں سے گزر رہا تھا لڑکوں نے پکڑ کر زبردستی بٹھالیا۔ باتوں باتوں میں، پونہی فٹل میں دو چار کس لگا لیے۔“ وہ بول تو رہا تھا مگر لہجہ کھوکھلا ہو چلا تھا۔

”علی! تو نے بڑا دل دکھایا ہے میرا، میں تو تیرا رشتہ لے جانے والی تھی نفرت کے گھر۔ کسی کو بھٹک بھی پڑی تو تمہاری ساری عزت تکل ہو جائے گی۔“
 ”آپ بے فکر ہو کر جائیں رشتہ لے کر، وہ بھوری بلی اسی گھر میں آئے گی۔“

”پہلے تو وعدہ کر، آئندہ سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“

”پکا وعدہ۔“ علی نے ہاتھ کھڑا کر کے عہد کیا۔
 ”اور اپنے لٹکے دوستوں سے بھی دور رہے گا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ علی بڑی آسانی سے مان گیا تھا۔

”تم تو پڑھے لکھے ہو بیٹا! سمجھ دار ہو، جس رستے پہ چل پڑے ہو۔ سراسر جانی ہے۔“ ای نے سمجھایا۔

”جی ای!“ وہ بڑی سعادت مندی سے ہر بات پہنچی جی کر رہا تھا۔

وہ وہاں سے اٹھ تو گئیں مگر دل ہنوز پریشان تھا، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیٹے کو اپنے پلو سے باندھ کر ہر وقت اپنے ساتھ ساتھ رکھیں، مذہب ہر جانے کا نہ لٹکے یا رد دوستوں سے ملے گا جو ای کی طرح تھکے تھکے سے فٹ پاتھ اور تھڑے پہ محفل جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔

عثمان صاحب روز اند آتے جاتے خاص طور پر راجا کا اڈہ دیکھتے تھے کہ علی یہاں تو نہیں بیٹھا مگر ج تو یہ ہے کہ انہیں اور ان کی بیگم کو ابھی تک اپنے بیٹے کے گھونک ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

اتنے اداس، بے کیف اور اجازت شب و روز گل رخ کی زندگی میں پہلے بھی نہیں آئے تھے، صبح سے وہ مشین کی طرح اپنے کام سر انجام دے رہی تھی۔ نوشی بوقت ضرورت بات کرتی تھی رومی کی ادھر ادھر کی باتیں ایک پھکی مسکراہٹ کے ساتھ سنی رہتی اور اپنے خیالات میں غلطیاں دیکھاں رہتی۔

”اگر میرے والدین حیات ہوتے تو شاید زندگی کچھ سہل ہوتی۔“ آج پہلی بار وہ اپنی دل گرفتہ تھی کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو بھی چاہ رہا تھا۔
 ”اللہ تو سب کا ہوتا ہے پھلی! تمہارا بھی ہے، ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرنے والا، اپنے بندوں کی فکر اور تمہاری کرنے والا۔“ اس کے اندر سے آواز آئی تھی مگر دل بہت باغی ہو رہا تھا۔

لڑکیوں سے نجات کا آسان نسخہ، شادی، ان کے سارے مسائل کا حل شادی، وہ شادی چاہے کسی سے بھی ہو۔ بالکل ایک جوئے کی مانند۔ داؤ لگ گیا تو وارے نیارے درندہ کی دست، یہی دامن رہ جاؤ۔“
 بڑی ای کی دی ہوئی ایک فیص سیٹے ہوئے اس کا دل باغی بھی ہو رہا تھا اور پھر بھر بھی آ رہا تھا۔ عامر بھائی اندر بیٹھے تھے بڑی ای کے ساتھ۔ پہلے تو دونوں سرگوشیوں میں بات کرتے تھے، اب ان کی آواز لاؤنج میں گل رخ تک پہنچ رہی تھی۔

”اے ہاں، مان جائیں گے تیرے ابا، آدھے آپ وہاں جا کر بیٹھیں، میں چائے لا رہی

تو راضی ہیں، باقی آدھے بھی ہو جائیں گے، میں نے تو جتا دیا کہ ابھی تو یہ رشتہ ل بھی رہا ہے، بعد میں یہ بھی ہاتھ سے جائے گا۔“

”ہاں اماں! آج کل اچھے لڑکے ملتے ہی کہاں ہیں۔“ بلیک ڈریسڈ پیٹ اور سفید دھاریوں والی شرٹ میں لمبوں، اپنے بالوں کو سلپتے سے جمائے، صاف رنگت والے عامر بھائی کمرے سے باہر آئے۔

”ارے بھی کل! ایک کپ چائے پلاؤ گی، اچھی سی۔“ وہ تخت پر براجمان ہو گئے، نظریں اسی پر جمی گئیں۔

”جی!“ کچھ توقف کے بعد گل رخ کی مری مری سی انگلی۔

جیسے آپ تو زندگی کا مقصد سب کی جی حضوری اور تابعداری ہی، چاہے پچا تیا کا گھر ہو یا چھوٹا۔ ہر کوئی اپنے گھر رکھنے کا خراج پوری طرح وصول کر رہا تھا۔

ماموں کے گھر گئی تھی مگر مل کر واپس آ گئی۔ وہ بے چارے خود قاف کا شکار ہوئے بستر پہ پڑے تھے، ان کی بیگم سخت مزاج اور بلا کی نبض، کسی کو ایک کپ چائے نہیں پوچھتی تھیں، یا پھر یہ ان کی معاشی مجبوری تھی مگر بہر حال اس گھر میں گل رخ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، خال اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ملک سے باہر گئیں۔ گل رخ کو پانچ ہزار روپے بھیج کر انہوں نے بھی اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ چائے بناتے ہوئے وہ اپنے خیالات میں غرق تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ عامر بھائی کاؤنٹر کے قریب کھڑے اس سے مخاطب تھے۔

”کچھ نہیں۔“ گل رخ اپنا رخ موڑ کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ارے بھئی۔“ خوش رہا کر، تم تو بہت سی مسکراتی اچھی لگتی ہو۔“ وہ بے تکلفی کی ساری حدود پار کیے جا رہے تھے۔

”آپ وہاں جا کر بیٹھیں، میں چائے لا رہی

ہوں۔“ گل رخ نے اپنا لہجہ اور چہرے کے عضلات سخت کر لیے، ایسی گلاب جاسن تو نہیں تھی کہ جس کا جی چاہے اٹھا کر منہ میں رکھ لے اور ہڑپ کر جائے۔
 ”چلو بھئی، جیسے تمہارا حکم، ہم تو تانی دار ہیں۔“ اس کے سخت لہجے کو نظر انداز کر کے وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔ بڑی ای بھی اتنے میں دوپٹے آ کر بیٹھ گئیں۔

”فیص سل گئی؟“
 ”تھوڑی سی رہ گئی ہے۔“ چائے کا کپ عامر بھائی کے آگے رکھتی ہوئی وہ دھیرے سے بولی اور پھر جا کر مشین پہ جھک گئی۔

”ارے اماں! آپ نے کچھ سنا، علی کے بارے میں؟“ عامر کو اچانک ہی کچھ یاد آیا تھا۔

”کیا ہوا؟ نکاح کر لیا کسی سے، پیسے لے کر بھاگ گیا؟ آج کل تو ہر طرف سے ایسی ہی خبریں ملتی رہتی ہیں۔“ بڑی ای نے اندازہ لگایا۔

”نفسہ کرنے لگا ہے۔“ عامر نے چائے کی چسکی لی۔

”ہائیں، یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ وہ حیران ہوئیں۔

سلانی کرتی گل رخ نے یک دم ہی مشین روکی تھی۔ دھاگہ ٹوٹ گیا تھا۔ دھاگہ سوئی میں ڈالتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

”حیرت سے آپ کو نہیں معلوم، پورے خاندان میں پھیل گئی ہے بات، بلکہ اپنے چری دوستوں کے ساتھ اس کی تصویریں بھی کسی نے نہیں بک پر ڈالی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھیں۔“ عامر بھائی موبائل محول کر انہیں تصویریں دکھانے لگے۔

”آے ہائے، اچھا بھلا لڑکا تھا، یہ کن چکروں میں پڑ گیا اور کمزور کتنا ہو رہا ہے؟“ تانی ای افسوس کا اظہار کر رہی تھیں۔ عامر بھائی مزے سے چائے پینے میں مگن تھے اور گل رخ کو اتنی دیر ہو گئی تھی مگر سوئی میں دھاگہ ڈل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

امی نے آتے ہی اپنا براؤڈ لیڈر بیگ مونسے
پھینک ہی دیا تھا۔ ان کا قیمتی جواز ان کے جسم پر اب
قہری جھنگار رہا تھا۔ سرچرہ بالکل بچھ کر رہ گیا تھا۔
”پانی پلاؤ ذرا“ انہوں نے بیٹی کو آواز دی
مگر مشکل تھا کہ آواز اس کے کانوں تک پہنچے، کانوں
میں پیئڈ فری کسٹیسوے نظریں موبائل اسکرین پر
تھیں۔

علی ان کی آوازیں کر لاؤنگ میں آگیا تھا۔ پانی
کی بوتل اور گلاس لے آیا۔
”بہت تھام روشن کر دیا تمہارے لاڈلے نے،
ہر طرف اسی کا چرچا ہو رہا ہے۔“
عثمان صاحب جو پیگم کے ہمراہ واپس آئے
تھے، زہر خندہ لہجے میں بولے، مخاطب پیگم تھیں مگر بیٹے
کو سن رہے تھے۔

”علی! تم نے تو دو کوڑی کی عزت کر کے رکھ دی
ہماری۔“ امی جان تو رہا کسی ہو رہی تھیں۔
”نقدہ کے ماموں تمہاری تصویریں دکھا رہے
تھے۔ فیس بک پر موجود ہیں تمہارے لفتکے دوستوں
کے ساتھ، راجا کے گروپ کے ساتھ، کہہ رہے تھے کہ
آپ اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے لڑکے سے کریں گے؟“
”ذلیل کر کے رکھ دیا سب میں ہمیں، ایسی
اولاد سے بے اولاد ہی بھلتے تھے۔“ عثمان صاحب کا
غم وغصے سے برا حال تھا۔

”اچھی بھلی بات بن گئی تھی نقدہ راضی تھی،
ماموں کو بھی راضی کر لیتی نصیب والوں کو ملتی ہے ایسی
بہو، کروڑوں کی جائیداد کی اکیلی وارث، معمولی سا تو
عیب ہے بس، چہرے پہ جگہ جگہ بھورے بھورے تل
ہیں۔ (حالانکہ یہ کوئی عیب نہیں مگر جس لڑکی کو بہو کی
حیثیت سے دیکھتی تھیں، اس کے لیے ان کی نگاہ بڑی
تقصیدی تھی) عیب چھپ جاتے ہیں چہرے کے، کیسے
کیسے خواب دیکھتے تھے میں نے۔ پہناؤ لی میں سونے
کے کڑے ملے، اس لڑکے نے سب کچھ غارت کر
کے رکھ دیا۔“

امی اور ابو دونوں کا رخ اور غصے کے مارے برا

حال تھا۔ بیٹے کی شادی کے حوالے سے جو خواب
دیکھے تھے سب چکنا چور ہو گئے تھے۔
”میں نے تم سے تمنا کر کہ ان بد معاشوں اور
اوباشوں میں اٹھنا بیٹھا بند کر دو۔ پھر یہ سلیم لنگڑا نہیں
بلانے کیوں آیا تھا؟“ عثمان صاحب علی کی کلاس لے
رہے تھے۔

”آپ ہی کی نصیحت پہ عمل کر رہا ہوں، وہاں
جاتا ہی نہیں ہوں، اسی لیے وہ بلانے آیا تھا۔ چھوڑ دیا
ہے سب کو۔“ علی نے ملاحت سے جواب دیا۔
”اب چھوڑنے سے کیا فائدہ، کون یقین
کرے گا تمہارے سدھرنے کا۔ سب جگہ بدنامی
ہو گئی، ایسی ذلت کا تو میں نے بھی خواب میں بھی نہیں
سوچا تھا۔“

”اوپر سے اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔“
امی کو اب تک نقدہ کے رشتے کا غم کھائے جا رہا تھا۔
”اب کون دے گا اپنی لڑکی، پتا نہیں کس لنگڑے
پار دوست نے تصویریں بھی آپ لوڈ کر دیں، جس کو
نہیں بھی پتا تھا، پتا چل گیا۔“

”اب تو میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں، یار
دوستوں کو بھی اور سگریٹ بھی۔“ علی نے احتجاج کیا۔
”کون یقین کرے گا بد اچھا، بدنام بڑا۔“ امی
نے ایک آنہ بھری۔

”پہلے تو میں ہی یقین نہیں کروں گا کہ تمہارے
صاحبزادے نے جو کہا ہے، وہ سچ ہے چور چوری سے
جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔“ ابو کی آنکھوں سے
ٹھوک و شہات چھٹک رہے تھے۔

☆☆☆

زرد پتے درختوں سے جدا ہو کر نیچے قدموں
میں چرمارہے تھے، قانون قدرت اٹل ہے، جو پتے
اپنی جڑوں سے کٹ جائیں، شاخوں سے علیحدہ ہو
جائیں ان کے لیے پھر قدموں کے نیچے ہی جگہ بنتی
ہے یا پھر تیز ہواؤں کی زد میں ادھر سے ادھر اڑتے
رہتے ہیں، نہ سزا پہنچے بس میں نہ منزل کا نشان۔
شام کے وقت بالائی میں کھڑی وہ دور نظر آنے

والے ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی،
شاید میری حیثیت اور اوقات بھی شارخ سے ٹوٹے
پتے سے زیادہ نہیں، کوئی ٹھکانا نہ منزل، بس ایک بے
سمت سفر ہے، ذہنی شام میں آسمان پہ غور پرواز
پر بندوں پر اس نے نگاہ کی جو واپس اپنے اپنے مسکن پہ
لوٹ رہے تھے۔

یہ پرندے کتنے خوش نصیب ہیں، اندھیرا
ہونے سے کل اپنی پناہ گاہوں میں لوٹ آتے ہیں
اور میرے لیے۔۔۔ آگے اندھیرا نظر آ رہا ہے مجھے،
مگر پناہ گاہ کوئی نہیں۔“

کل رخ پہ بری طرح یاسیت اور اداری کا دورہ
بڑا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی
تھی، فضا میں دھیرے دھیرے سرخی غبار چھا رہا تھا۔
اتنی پہ نیلگوں آسمان پر ڈوبتے سورج کی سرخی غالب
آ رہی تھی۔ یکایک وہ دکھتا ہوا تاری گولہ بن گیا اور
ڈوبتے ہوئے چاروں اور اندھیرے کی چادر پھیلا
گیا، ہر جی مساجد سے اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہونے
لگی۔

کل رخ مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اندر آ
گئی۔ جب سارے در بند نظر آئیں تو انسان کے
لیے ایک در ہمیشہ کھلا رہتا ہے جس پر دستک دینے والا
اور مدد مانگنے والا بھی ناکام نہیں ہوتا۔ اربوں
انسانوں سے بھری اس دنیا میں بھی کسی ایک انسان
سے بھی کوئی امید نہیں ہوتی، کوئی چارہ سا، غم گسار نظر
نہیں آتا مگر گھپ اندھیر میں روشنی کی، امید کی ایک
کرل ہمیشہ ہوتی ہے۔

وہ ذات پاک جس نے اپنے ہر بندے کو بڑی
محبت سے تخلیق کر کے اس دنیا میں بھیجا۔ وہ بندہ جب
اپنی مشکلات میں اپنے خالق کو، اپنے رب کو پکارتا
ہے تو وہ پہلے ہی اپنے بندے کے قریب ہوتا ہے۔ شہ
رگ سے بھی زیادہ قریب۔

نماز پڑھ کر کل رخ نے دعا کے لیے ہاتھ
اٹھائے تو سوائے آنسوؤں کے اور کوئی التجا اپنے رب
کے حضور پیش نہ کر سکی۔

☆☆☆

عثمان صاحب کی پریشانی اور فکر کی کوئی حد نہ
تھی، پریشان تو ان کی بیوی بھی تھیں اور بانی گھر
والے بھی، یار دوستوں کو اور سرگرم اور نشہ چھوڑنے
کے علی کے سارے وعدے ریت کی دیوار ثابت
ہوئے، سارے عہد سائل پہ پڑے خاشاک کی طرح
کمزور اور بے بس، جنہیں فقط ایک لہر ہی اپنے ساتھ
بہا لے جاتی ہے۔

علی کی حرکتیں دن بدن ناقابل برداشت ہو رہی
تھیں۔ دن بھر میلے خیلے کپڑوں میں ادھر ادھر گھومتا
رہتا یا راجا کے اڈے پہ ان ہی لنگڑوں کے ساتھ بیٹھا
رہتا۔ امی تو کڑھ کڑھ گرا دمی ہو گئی تھیں، ان کا دل
خون کے آنسو رو رہا تھا۔ منابل ملنے آئی تو اس کے
سامنے رو پڑیں۔

”کیا کروں اس لڑکے کا، خود کوتاہ کر رہا ہے۔
میں نے اور تمہارے ابو نے کتنا زور دیا کہ علاج
کروالے ڈاکٹر سے، جہاں نفٹ کے عادی افراد کا
علاج ہوتا ہے، کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، پتا
نہیں کس حاسد نے میرے بچے پہ جادو ٹوٹا کر دیا۔
خدا غارت کرے ایسے حاسدوں کو، اپنے ہی حسد کی
آگ میں جل کر مریں۔“

امی بھڑائی ہوئی آواز میں نادیہ دشمنوں کو
کوٹنے دیے لگیں۔

”ایک بات کہوں امی؟“ منابل کچھ سوچتے
ہوئے بولی۔ ”آپ علی کی شادی کر دیں۔“

”حالت دیکھ رہی ہو، کیا بنائی ہوئی ہے اس
نے؟ کوئی کام دھندا کرتا نہیں، اچھی بھلی اخبار میں
ٹوکری لگی تھی، وہ بھی چھوڑ دی۔ ایسے کتے اور نفٹ باز
کو کون لڑکی دے گا؟“

”لڑکی ہے میری نظر میں، آپ دیکھیے گا شادی
کے بعد بیوی بچوں کی ذمہ داری پڑے گی تو ٹھیک
ہو جائے گا۔“

منابل بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔ امی اس کی
بات بہت توجہ سے سن رہی تھیں۔

”کون لڑکی ہے نظر میں؟ پھر علی..... وہ راضی ہوگا شادی کے لیے؟“
”اسے منانا میرا کام ہے۔“ منائل جلدی سے بولی۔

”لڑکی کون ہے نظر میں؟“ ای نے سوال کیا۔
منائل نے نام بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں، پھر ایک آہ بھری۔

”سبیلہ والا علی ہوتا تو کبھی اس لڑکی کو بہو بنانے کا سوچتی کبھی نہیں مگر اب تو.....“ انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”اس لڑکے نے بڑی ذلیل و خوار کر دیا ہمیں۔“

☆☆☆

بڑے ابا اور ان کی بیگم کی گفتگو مباحثے میں بدل جاتی اور وہ مباحثہ، چھوٹے مولے جھگڑے میں، عامر نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا مصمم فیصلہ کر لیا تھا۔ اب وہ چاہ رہا تھا کہ ابا کل رخ کے لیے ہائی بھر لیں تاکہ پرانا رشتہ ختم کر کے وہ فوراً ہی نیا رشتہ جوڑ لے۔ زائرہ کے لیے اشعر کا رشتہ نامعلوم ہو گیا تھا۔ بڑے ابا چاہ رہے تھے کہ اشعر کو کل رخ کے لیے راضی کر لیں۔

اسی بات پر ان کی اپنی بیوی سے بحث ہوتی تھی۔ شادی شدہ بیٹیاں آتی تھیں۔ گھر کے معاملات اور حالات سے واقف تھیں، انیشا بڑی حد تک سیدھے سادے مزاج اور اچھے اخلاق کی تھی، اسے دنیا کی کوئی لڑکی اپنے بھائی کے لیے پری تنگ نہ تھی۔ وہ اشعر اور کل رخ کے رشتے کی چاہی تھی، بلکہ اپنے بھائی کو چپکے چپکے کنوینس بھی کر رہی تھی۔

دوسری لیکن امی کے رعب میں تھی، ان کی ہاں میں ہاں ملائی رہتی۔ ٹوٹی بے نیاز تھی، رومی بھی کل رخ کی حمایت بھی مگر وہ بے چاری کس گنتی میں تھی۔ تانی امی اپنی اوجیز بن میں بڑی ہوتی تھیں، ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ اشعر کا رشتہ کل رخ سے نہ ہونے دیں۔ اپنے شوہر سے بھی وہ کبھی بحث کرتی تھیں۔
”بڑے والے نے اپنی من مانی کی، اپنی مرضی

سے بیوی لے آیا، اب چھوٹے کے معاملے میں تم من مانی کر رہے ہو، اپنے بیٹے کے لیے میری بھی کوئی خواہش، کوئی تمنا ہے یا نہیں؟“

”بھلی مائیں، بات، بھتی کیوں نہیں، نیک سیرت بہو آئے گی تو ہم دونوں کا بڑھاپا سنور جائے گا۔“
بڑے ابا اپنی بیگم کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر انہیں سمجھانا ایسا ہی تھا جیسے جینس کے آگے بین بجانا اور ان ہی اٹکھے ہوئے ریشم جیسے دنوں میں عثمان صاحب اپنی بیگم کے ساتھ بڑے ابا اور بڑی امی کے پاس آئے تھے۔

☆☆☆

وہ خاموش، بے حس و حرکت بیٹھی تھی، کسی سنگی مجسمے کی طرح ایسا مجسمہ جس کے اندر دھڑکنے والی پوری قوت اور رفتار کے ساتھ بغاوت پر آمادہ ہو مگر بے بسی کچھ بھی کرنے نہ دے۔

”بہنی امیں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، تمہاری بھلائی کے لیے کر رہا ہوں مجھے امید ہے کہ اپنا باپ سمجھ کر میرا مان رکھ لوگی۔“

وہ کل رخ کے سر پہ ہاتھ رکھے اس سے مخاطب تھے۔ جس کے خاموش وجود میں طوفان برپا تھا۔
”میری جگہ آپ کی بیٹی ہوتی تب بھی یہی فیصلہ کرتے؟“ کل رخ ان سے پوچھتا جانتی تھی مگر پوچھ نہ سکی، شرم اور مردت نے ہونٹوں پہ تالا لگا دیا تھا۔

وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی، اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر ہی اتار لیا تھا۔ اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر نکاح ہو گیا تھا۔ ہر قسمی اگلے بننے لگی۔

☆☆☆

بڑے ابا نے اس کی رخصتی کے لیے سارے اہتمام اور انتظامات ایسے ہی کیے تھے جیسے اپنی دونوں بیٹیوں کو رخصت کیا تھا۔ گھر پر ہی اسے مایوں بٹھایا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے اسے بالنگی کا سامنے کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں کگلے میں گلے پودے میں بہار کا پہلا پھول کھل گیا تھا۔
”تو بہار آئی!“

کل رخ نے مسکراتے پھول کو غور سے دیکھا۔ زرد دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں یا قسمت کے مذاق عجیب؟

کل رخ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اب قدرت اور تقدیر کے فلسفے کو سمجھ کر کیا کرنا تھا، جو ہونا تھا، وہ ہونے جا رہا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی مگر عجیب بات تھی کہ اسے کسی سچے سچے کا انتظار تھا نہ امید۔

اللہ ہے مایوس نہیں تھی مگر اس کے بندوں سے مایوس ہو چکی تھی۔

☆☆☆

گھر میں وہی گہما گہما، ہنگامہ اور شور مچا رہا تھا جو بارات رزوائی سے کل گھر میں ہوتا ہے۔ دولہا تیار ہو کر آ گیا تھا۔ سفید رزوائی شیر والی اور کلاہ میں اتنا وجہہ اور خوش لگ رہا تھا کہ امی نے ہلا میں لے لیں۔

”اللہ میرے بچے کے اوپر سے ساری بلائیں دور کر دے۔“ انہوں نے بے ساختہ دعا کی۔

بہو مرضی اور پسند کی نہیں تھی۔ رشتہ طے کرتے وقت انہوں نے کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کیا تھا مگر اب کیسی بھی مجبوری سی، اس مجبوری کو خوشی سے بھانسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں دولہا کے کچھ خاص مہمان آئے بیٹھے تھے، انہیں اطلاع ملی تو دل دھڑک گیا۔
”ارے کہیں ان بد معاشوں کو تو نہیں بلایا، وہ لنگے، چرپی، موالی، اب ایسے قہر ڈکلاں لوگ بارات کے ساتھ جائیں گے۔“

عثمان صاحب کے بلاوے پر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئیں مگر دل میں ہزاروں دوسو سے اور اندیشے تھے۔

ڈرائنگ روم میں ان کے اندیشوں کے برعکس بڑے پردہ دار اور سویر سے تین مہمان بیٹھے تھے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس، چہروں سے بڑے معتبر نظر آ رہے تھے اور جب انہوں نے منہ کھلے تو دونوں میاں بیوی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”آپ کا بیٹا ماشاء اللہ بڑا بہادر اور باصلاحیت ہے، پچھلے ایک سال سے ہمارے اخبار کے لیے کام کر رہا ہے، پچھلے مہینے اس کی رپورٹ کی مدد سے منشیات کا ایک بہت بڑا سلاٹر پکڑا گیا ہے، گروہ کے اندر تک گھس کر ثبوت لے کر آیا تھا۔ اس میں جان کارسک تھا مگر وہ ڈرائنگس۔ آپ کو تو اپنے بیٹے پر بہت فخر ہوگا؟“

☆☆☆

باراتی گاڑیوں میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے، پیٹڈ باجے والے پورے زور و شور سے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے، دولہا گھر کے اندر اپنے گھر والوں کے نرغے میں پھنسا بے چین تھا کہ تفتیش ختم ہو تو وہ بارات لے کر نکلے۔

”کیا تھا وہ سب؟“ عثمان صاحب درحقیقت چکر اٹھے تھے۔

”نو کری کے چکر میں سب کرنا پڑتا ہے۔ منشیات کے اصل ڈیلر تک پہنچنے کے لیے اتنا لمبانا تک کھیلنا پڑا۔ باری دوستی بڑھائی پڑی اور ان کے ساتھ پیٹڈ کر سوتے بھی لگے پڑے۔ ان کے جیسا نہ بننا تو ان لوگوں کا اعتماد بھی کبھی نہ جیتنا۔“

”بے غیرت! پہلے نہیں بتا سکتا تھا۔ یہ بات؟“ امی نے غصے میں دانت پیسے۔ انہیں اچانک ہی لغو کی یاد نے آن ستایا۔ ہائے وہ کروڑوں کی جائیداد۔

”امی حضور، جس راز کو انسان خود اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکتا، وہ پھر کسی اور کے پیٹ میں بھی نہیں رہ سکتا، دراصل میرے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ آپ سب نے ہی بھرا ہے۔ جو پریشان ہو ہو کر مجھے بھی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے اور کبھی مجھ پہ پابندیاں لگا رہے تھے۔ نشہ چھڑانے کے لیے ہر جن کر رہے تھے۔“ علی بہت دن بعد اپنے مخصوص انداز میں چپک کر بولا تھا۔

بتا کر چرسیوں کا ہم بھیں غالب تماشاے اہل بھرم دیکھتے ہیں
”ویسے مجھے اب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ہمارے ہاں رانی کا پہاڑ اور پر کا کوا کیسے بنتا ہے۔“

”غم کو ہی بتا دیتا، وہ تو کم از کم ہمیں بے عزت نہ کرتی۔“

”وہ تو آنکھ کھلنے سے لے کر آنکھ بند کرنے تک ہر لمحے کی سستی اور اپنا سارا بانیوڈیا، ساری خبریں فیس بک پر پہنچا دیتی ہے۔ اسے بتا دیتا تو پورے پاکستان اور پوری دنیا کو فوراً پتا چل جاتا۔ ویسے بھی مجھے پراون رنگ شروع سے ہی نہیں پسند اور نہ ہی بلایاں اچھی لگتی ہیں، ہر وقت میاؤں میاؤں کر کے دماغ چاٹتی رہتی ہیں۔“ علی نے برا سانس دیا۔

”مگل رخ کے لیے بڑی جلدی راضی ہو گئے۔“ ماہرہ نے نیکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”امی، ابو کا اصرار تھا، اب ان کی بات ماننا تو میرا فرض ہے اور جوڑی مجھ سے شادی پر راضی ہو گئی، اس کا گل رخ ہونا ایک اتفاق ہے، اور اب مجھ غریب کو ساری رات یہیں کھڑا رکھیں گے یا رات لے جائیں گے؟“

☆☆☆

اسٹج پہ بیٹھا وہ نسبتاً سنجیدہ تھا، ایک کثیر الاشاعت اخبار کے نائب مدیر اور دو جانے پہچانے صحافیوں کی بارات کے ساتھ آمد نے اسے سب کی نگاہوں میں معتبر کر دیا تھا۔ رشتے دار اسٹج پر آ کر شادی کے ساتھ ساتھ اس کے کارنامے کی مبارک باد بھی دے رہے تھے اور اس کے پہلو میں بیٹھی مگل رخ بھری تو نہیں مگر کچھ معاملہ اس کی سمجھ میں بھی آ رہا تھا۔ غور کیا تو عقل کے دروازے کچھ اور کھل گئے۔

”رخصتی کے وقت بڑے ابا نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔“

”کسی کے روپے اور باتوں کو دل پہ مت لینا۔ خوش رہنا اور یہ لڑکا تمہیں خوش رکھے گا۔“ بڑے ابا نے اسے پیچھے کے رنگ گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

برسوں پہلے کی بات تھی، جب انہوں نے اپنے بھائی کی نیا پار لگانے میں اس کی مدد کی تھی۔ اب مجھے پہلے بھتیجا ان کے پاس مدد کے لیے آنا تھا۔ اپنے بیٹے کو ایک طرف کر کے انہوں نے پیچھے کی مدد کرنے کا

فیصلہ کیا تھا۔ علی کی جو حقیقت لوگوں پہ آج کھلی تھی، انہیں پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی مگر انہوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا، گل رخ کو بھی نہیں۔

راز کو راز رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ گل رخ کی نگاہوں میں شکایت تھی، چہرے پہ اداسی، مگر انہوں نے نیکی کی شکایت اور اداسی دور کرنے کی کوشش نہیں کی، کچھ وقت کے لیے خود برے بن گئے۔

☆☆☆

معاملات کا تانا بانا جوڑنے میں وہ اتنی منہمک بلکہ غرق ہو گئی تھی کہ علی کی آمد اور آہٹ اسے چونکا نہ پائی تب پتا چلی جب اسے اپنے سامنے موجود پایا۔ گل رخ کی نظریں انہیں اور علی کی نگاہوں سے الچھ کر رہ گئیں۔

”افوہ! تم کیا سمجھ رہی ہو، کیا یہ سب ڈراما وہ بھی اتنا لبا ڈراما تمہارے لیے کیا تھا؟ ہرگز نہیں، اپنا کیریئر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امی ابو نے ڈر کے مارے شادی کا پھندا گلے میں ڈال دیا۔ میں نے تو بھوری مٹی کے خواب دیکھے تھے۔ افسوس، سارے خواب خاک میں مل گئے۔“

علی نے ایک آنکھ بھری اور اپنی کلاہ اتار کر ایک طرف رکھی۔

”واقعی؟“

”تو اور کیا اور دے یہ تمہاری آنکھوں میں اتنی خوش چمنی کیوں بھری ہوئی ہے، جیسے میں سچ ہی تم پر مر رہا ہوں۔ ایسی بے وقوفی میں نے آج تک نہیں کی اور آئندہ بھی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔“

”چچی غلط کہتی ہیں کہ آپ ڈرامے باز ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتی اک لمحے کوری۔

”آپ تو بہت بڑے ڈرامے باز ہیں۔“ مگل رخ کی ایک مٹی کی سنجیدگی کسی مترنم جھرنے کی ہلکی سی بدل گئی۔ علی بہوت سا اسے دیکھ رہا تھا جس کی خوب صورت اور بے ساختہ ہنسی میں بہار کے سارے خوش رنگ پھول مسکرا رہے تھے۔

☆

عائشہ تنویر

خوبی و خرابی زندگی

حفصہ نے پانی سے بھری بالٹی بیڑھیوں پر الٹائی، پانی بھل بھل نیچے پہنچے لگا۔ تب ہی چلی بیڑھیوں کا موڑ مڑ کر حاشر سامنے آیا تھا۔ اس نے بے اختیار شرمندہ ہو کر شکر کیا کہ وہ بھیگا نہیں تھا۔



جانے کیوں اسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی تھیں، شاید یہ اس کی آنکھوں میں بہاں نرم گرم جذبات تھے جو اس کے اندر اٹھل پھل چلا دیتے۔

کوئی اور ہوتا تو وہ مٹی بھرے جوتے لانے پر داویلا چاڑھتی لیکن سامنے شہر دل کا لکین تھا جو شرعی لڑکا ہونے کے باوجود اس سے زیادہ منظم تھا۔ اپنے جوتوں کو پانی پر تھپتا تا وہ گویا انہیں صاف کر رہا تھا۔ مٹی نکال کر وہ احتیاط سے چڑھا حصہ کے سامنے آیا جو بت مٹی اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی۔" حاشر نے اس موٹی سی لڑکی پر ایک نظر ڈالتے سنجیدگی سے سوال کیا۔ وہ بہت مضبوط کردار اور خوب صورت شخصیت کا مالک تھا۔ کزنز ہونے کی حیثیت سے بات تو ہوتی مگر کبھی بلا وجہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ جب تک دل کا رشتہ سند حاصل نہیں کر لیتا، وہ اسے کسی پر آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر اسے اندازہ ہوتا کہ اس کی آنکھیں دل کی کھڑکی بن کر سارے راز اس باز کی لڑکی پر کھول دیتی ہیں تو شاید وہ بھی اس کے سامنے نظر نہ اٹھاتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور تھا مگر سوچیں واضح تھیں۔ اس کے تمام بچے جذبات اور سبکے الفاظ اس کی امانت تھے جو مستقبل میں اس کی ہمسفر بنتی۔

"جی، بولیں، کہیں۔" حصہ ہوش میں آئی۔ "ایسے پانی پھانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ برش سے دیوار کے ساتھ گلی میل صاف کرو۔" وہ لب و لہجہ مسکراہٹ چھپاتا کہہ کر چلا گیا۔ ماحول کا سارا فسون غارت ہو گیا۔ حصہ نے سگ کر اس کی پشت کو گھورا۔

"ادھہ، بڑے آئے اصغری کے جانشین۔" وہ سر جھٹک کر جلدی جلدی کام کرنے لگی۔ خیال تھا کہ حاشر کے ساتھ کرن یا پچھو بھی یقیناً آئی ہوں گی۔ شاید نیچے چچی کے گھر میں بیٹھی ہوں مگر

کام ختم کر کے اس نے درمیانی دروازے سے چچی کے پورٹن میں جھانکا تو ایسے کوئی آثار نہ ملے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نگاہ بے اختیار دیوار کے ساتھ کناروں پر میل ڈھونڈنے لگی۔ پھر خود ہی جلدی سے لا حول پڑھ کر اوپر چڑھ آئی۔

پچھو در کنگ دو مین تھیں۔ ان کے گھر میں سب کو کام کی عادت تھی۔ جس عمر میں وہ اسکول سے آ کر جوتے ادھر ادھر بیٹھتی، دادی کی گود میں گھس جاتی تھی۔ وہ تینوں بہن بھائی تب سے اپنے جوتے خود پالش کرتے تھے۔ آ کر اتارے تو آرام سے ریک میں رکھ دیتے۔ اپنی اسی آواز سے کہنے لگے کہ وہ سب بہن بھائی بہت سے کام خود کر لیتے۔ سگ میں بڑے برتن ضویا دھو دیتی تو حاشر سب کے کپڑے استری کر دیتا۔

ان ہی سوچوں کے ساتھ اوپر آئی تو لاؤنج میں ہی دادی اور حاشر بیٹھے نظر آئے۔ حاشر اپنی نالی کے پاس بیٹھا ان کی دوائیاں چیک کر رہا تھا۔ دادی اٹھوٹے نواسے کو دیکھ کر حاشر کو چاندی ہوئی تھیں اور اپنی پیالیوں کی مکمل تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔ خدا خواستہ انہیں کوئی بڑی بیماری نہ تھی مگر ڈاکٹر نواسے کو دیکھ کر خود بخود ہی تمام تکالیف یاد آ جاتیں۔

"کرن نہیں آئی۔" اس نے لمحہ بھر رک کر دریافت کیا۔ وہ اور کرن ہم عمر ہی نہیں بلکہ بہترین دوست بھی تھیں۔ "نہیں، امی نے اسے کچن کی صفائی پر لگا رکھا تھا۔ ضویا اپنے ہفتہ وار کام گزار رہی تھی۔ پھر پورا ہفتہ تو وقت نہیں ملتا۔" اس نے خوش گواری سے سب کے متعلق بتایا۔ دادی کو اب بیٹی اور نواسی کا خیال آ گیا تھا۔ اس کی پچھو اور دادی کی بے چاری معصوم بیٹی، جو ایک مشہور اسکول کی پرنسپل تھیں۔ گھر اور اسکول بہت اچھے طریقے سے سنبھالتی تھیں۔ حاشر سے چھوٹی ضویا بھی ماسٹرز کر کے ایک

پرائیویٹ کالج میں لیچرر شپ کر رہی تھی جبکہ کرن، حصہ کی کلاس فیلو تھی۔

ان کے خاندان میں خواتین کے کیریئر کے حوالے سے کوئی خاص تحفظات نہ تھے تو کوئی پابندی بھی نہ تھی مگر عموماً کوئی لڑکی نوکری نہیں کرتی۔ سب لڑکیاں پڑھتے پڑھتے ہی پیادہ دی جاتیں۔ صرف نسرین پچھو ہی واحد خاتون تھیں، جنہوں نے شادی کے بعد بھی تعلیم مکمل کر کے نوکری کی۔ انہیں اپنے میاں اور بچے کی مکمل سپورٹ تھی۔ بچے نالی کے پاس آرام سے رہ جاتے اور پچھو نے کزنز سے خوب ٹھیکتے۔ ان کی محنت ہی تھی جو اب وہ خاندان بھر میں معاشی حساب سے سب سے زیادہ آسودہ تھیں۔ بچے پڑھ لکھ گئے تھے۔ اپنا وسیع و عریض گھر تھا۔ سب کو پچھو کی مصروفیت اور تھکاوٹ نظر آتی۔ صرف حصہ تھی جو ان کی گرومنڈ پر سنائی، اب نوڈیٹ طرز زندگی سے متاثر تھی۔ پچھو اس کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ ان جیسی بننا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"حصہ، آ جا میری بیٹی، میں تیل ڈال دوں سر میں پڑھ پڑھ کر تو نے تو اپنی صحت کا ستیاناس کر لیا۔" وہ دل جمعی سے ننہیر پیکل حل کرنے میں مصروف تھی، جب دادی کو اس کی صورت دیکھ کر پیار آیا۔ دادی اور وہ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ رات دیر گئے وہ لائٹ جلا کر پڑھتی تو روشنی سے ڈسٹرینس کے بجائے اس خیال سے دادی کی نیند اڑ جاتی کہ ان کی لاڈلی پوتی اتنی محنت کر رہی ہے۔ بچے تو سارے ہی پیارے ہوتے ہیں مگر حاشر اٹھوٹا نواسا ہونے کی وجہ سے زیادہ پیارا تھا۔ تو حصہ اٹھوٹی پوتی تھی۔ دو اس کے بھائی اور چار چچا کے بیٹوں میں وہ سب کی اٹھوٹی آپنی تھی۔ ابو، چچا، دادا جان، اس نے سب سے ہی خوب لاڈ اٹھوائے تھے۔ دادی کی بھی اس میں جان بندھتی۔

"ابھی نہیں دادی جان، یونیورسٹی سے واپس آ

کر ڈیو لوں گی۔ آپ کی نیند خراب ہو رہی ہے تو میں باہر چلی جاتی ہوں۔"

اس نے جواب دیتے، متشکر انداز میں سر اٹھا کر ایک نظر دادی جان کو دوسری نظر بارہ کا ہندسہ گراں کرتی گھڑی کو دیکھا۔ اس وقت سوتے سے وہ یقیناً روشنی کی وجہ سے بیدار ہوئی تھیں۔ "نہیں، نہیں، باہر کہاں بیٹھو گی۔ میں تو دوشہ آنکھوں پر رکھوں گی اور سو جاؤں گی۔" انہوں نے فوراً منع کیا۔ حصہ ان کی محبت پر مسکرائی۔

دادا جان سے وراثت میں ملے اس گھر میں وہ لوگ بچپن سے رہ رہے تھے۔ ان کے کمرے کے علاوہ، ایک کمرہ اس کے دونوں بھائیوں کے پاس تو ایک ای، ابو کے پاس تھا۔ وہ یہاں سے نکلتی تو لاؤنج کے علاوہ بیٹھے کو جگہ نہیں تھی۔

"اکیلا کمانے والا اور اتنے کھانے والے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے، پچھو نے ساتھ محنت کی تو ماشاء اللہ کتاب بڑا کھربالیا۔"

اس کے ذہن میں ہمیشہ کی طرح خیال ابھرا۔ "آپ سو جائیں۔ میں بس سونے والی ہوں۔" اس نے دادی کو سلی دی اور دھیان دوبارہ کام پر مرکوز کیا۔

"اتنا پڑھ کر تم نے کرنا کیا ہے۔ چار نمبر کم بھی آ جائیں تو کچھ نہیں ہوتا۔" دوپٹ آنکھوں پر رکھنے سے روشنی رکی تھی مگر دادی کا دماغ ہنوز اس کی فکر میں جپٹا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

☆☆☆

جات اور گولی گولی کی پلیٹ کے ساتھ کولڈ ڈرنک کی بوتل سنبھالے کرن بارات کی دلہن کی طرح سچ سچ آگے بڑھ رہی تھی۔ دور سے اس پر نظریں جمائے حصہ اپنی سوچی گئی مثال پر خود ہی مسکرا دی۔ ان کے پاس آج بے شمار ٹوٹس اور کٹائیں تھیں،

حصہ یوں بھی رش میں گھس کر کچھ لینے سے بچتی تھی سوکرن کے اصرار کے باوجود خود سامان رکھ کر یہاں بیٹھ گئی اور اسے اکیلے کینٹین جانے دیا۔ اس وقت کرن ہی بھوک سے پریشان ہوئی تھی، حصہ کو تو پیٹ بھرنا شہ کیے بنا گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ تب ہی ایک طرف سے یاد رکھ کر کرن کے ساتھ چلے لگا۔

”لاؤ، میں پکڑ لوں۔“ وہ ہاتھ آگے بڑھائے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

”شکریہ، میں اپنا کام خود کرنے کی عادی ہوں۔“ کرن نے آرام سے جواب دیا۔

”مجھے معلوم ہے۔ میں تو صرف تمہارے ساتھ چلنا چاہ رہا تھا۔“

اس کے لہجے میں معنوں کا جہان آباد تھا۔ کرن نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”بلیک ٹیگس ہے۔ سب ہی آ جا رہے ہیں۔ میرے آگے، پیچھے، برابر میں، تم بھی چل لو۔“

اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

یادور نے جھلا کر اسے جاتے دیکھا تھا۔ یہ چنچل سی لڑکی ہمیشہ اسے یوں ہی ٹال دیتی تھی۔ وہ پراعتاد تھی۔ بڑھی لکھی ٹیلی سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے

درمیان اچھی دوستی تھی مگر یادور نے جب کلاس فیلو سے پڑھ کر آگے تعلق بڑھانا چاہا، وہ بہت تھک دواور تھا ہو گئی تھی۔

حصہ نے دور سے سارا منظر دیکھا، کچھ سناکی نہ دینے کے باوجود وہ سب سمجھ گئی تھی۔

”تم تو بے چارے کو بالکل لٹھ نہیں کروا تیں۔ خوار ہو رہا ہے تمہارے پیچھے۔“

اس نے کرن کو شہارت سے چھیڑا۔

”میں نے تو اسے کبھی نہیں کہا کہ میرے پیچھے آئے۔“

وہ پوری توجہ سے چاٹ مکس کرنے میں مصروف تھی۔

”وہی وہ سیریس ہے بار۔ اپنے گھر والوں کو

بھیجنا چاہتا ہے۔ تمہیں بھی گھر سے کوئی مسئلہ نہیں تو پھر۔۔۔۔۔۔“

حصہ نے دل میں ہلکی الجھن کو زبان دی۔

”تم نے کبھی مجھے اس کے ساتھ اکیلے بیٹھے دیکھا ہے؟ بلا ضرورت ہم ساتھ پھرتے ہیں؟“

اس نے جواب میں سوال داغا تھا۔

”نہیں۔“

حصہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

کرن کی سارے ڈیپارٹمنٹ سے ہیلو ہائے بھی گھر دوپٹی صرف حصہ سے تھی۔

”لیکن اگر ہمارا رشتہ ہو گیا تو سب یہی سمجھیں گے۔ ہمارے طبقے کی لڑکیاں باہر نکلیں تو سارا زمانہ انھیں فوکس کر لیتا ہے۔ اکیلی تمہارے گھر آ جاؤ تو

میری اپنی مانی ہی کہہ دیتی ہیں کہ نسرین خود فوگری میں گئی ہے اور بچی کی فکر نہیں، کیسی آنکھوں سے دے رہی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کبھی ایسے کسی مسئلے میں نہ پڑوں۔“

اس نے اب کی بار چاٹ سے انصاف کرتے تفصیل سے جواب دیا تھا۔ حصہ، دادی کی بات پر

شرمندہ سی ہو گئی۔ واقعی، گھر میں رہنے والی خواتین دوسروں کی مشکل کا اور اک کے بغیر کسی بھی درگاہ

دوسن پر کتنے آرام سے تبصرے کر دیتی ہیں۔

”ضمیمہ آپ کی شادی کی تاریخ سمجھو رکھ ہی دی۔“

اس کی خاموشی پر کرن نے دانستہ موضوع بدل دیا۔

”ارے کب، حاشر بھائی آئے تھے تو انہوں نے بتایا ہی نہیں۔“

حصہ بھی یادور کو بھلا کر خوش گواری حیرت سے متوجہ ہوئی۔

”کل شام میں تو فون آیا تھا آئی کا۔ امی تو کب سے چاہ رہی تھیں، بس انہیں اپنے بڑے بیٹے کی آمد کا انتظار تھا۔ فراز بھائی سے بڑے بھائی آ سڑیلیا میں ہوتے ہیں نا۔ اب ان کی ٹیلی کا دیر

آگ گیا، وہ اگلے ماہ آ رہے ہیں بیوی، بچوں کو لینے تو یہاں شادی منانا کر ہی جائیں گے۔“

کرن نے رغبت سے کھاتے تفصیل سے آگاہ کیا۔ اب وہ اس کے سامنے سے گول گپے اٹھا رہی تھی۔

حصہ نے کوفت سے اسے گھورا اور پلیٹ اس کے آگے دھکیل دی۔

”یونیورسٹی آتے ہی تمہیں کھانے پینے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کا بتا رہی ہو، یہ نہیں یاد کر اگلے ماہ تو ہمارے پیچڑ ہوں گے۔۔۔۔۔۔“

وہ پریشان ہوا بھی تھی۔

”چند اگوارے گھر میں سب صبح صبح اپنے کاموں پر جاتے ہیں۔ دیر سے اٹھو تو ناشتہ نہیں ملتا۔ تمہاری طرح نہیں کہ امی ناشتہ سجا کر پیش کریں تو

دادی منہ میں ٹوالے ڈالیں۔“

کرن نے ٹکڑا توڑ جواب دیتے ہوئے گول کیا منہ میں رکھا۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھتی رہی۔ منہ خالی

ہوا تو کرن نے خود ہی سلسلہ کلام جوڑا۔

”امتحان ہیں تو کیا ہوا۔ تم تو پیچڑ کو سر پر سوار کر لیتی ہو۔ روز تو پڑھتے ہیں ہم۔ آدمی تیاری تو ہے۔ تم یہ سوچو، کپڑے کیسے بنوانے ہیں۔“

اس کی لاپرواہی پر حصہ ایسے دیکھ کر رہ گئی۔

پچھو کی چلی میں وہ واحد بندی تھی جو اپنے مستقبل سے اتنی بے فکر تھی۔ نہ پوزیشن کی دوڑ میں شامل ہونے کا شوق، نہ پرفیشن کا سوچ کر ہلکان ہوتی۔

بس بے گلے کا شوق تھا، یونیورسٹی آ کر انجوائے کرنی اور ساتھ عادتاً تپڑھ لیتی کہ پاس ہو جائے۔

گھر جاتے ہی اس نے بیچر بریک کی بھی۔ ابھی تک دادی کے پاس پچھو کا فون نہیں آیا تھا۔ وہ پچھو

کوفن ملانے کو بے چین ہونے لگیں۔

”کرن بتا رہی تھی کہ رات ہی مات ہوئی ہے دادی! صبح پچھو اسکول چلی گئی ہوں گی۔ اس لیے آپ کو فون نہیں کیا۔ ابھی ہال کا معلوم کر کے تاریخ

رہیں گے تو سب کو بتائیں گے۔“

اس نے انہیں ڈھارس دی۔

”ہزار بار کہا ہے نسرین کو، اب جان چھوڑے فوگری کی۔ گھر میں بچی کی شادی ہے اور اسے اسکول سے فرصت نہیں۔“

دادی بڑبڑا رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

سب کو اپنی بڑی تھی۔ دو پیچڑ کی فکر میں ہلکان تھی۔

دادی کو بتانے میں دیر کرنا ٹھیک رہا تھا جبکہ امی اور چچی کو دینے لینے کی فکر ہو رہی تھی۔ آخر نند کے گھر پہلی

شادی تھی۔ وہ سب کو باتیں کرتا چھوڑ کر اٹھ گئی۔

اسے شادی سے پہلے پہلے تیاری پوری کرنی تھی ورنہ پڑھائی کا بہت حرج ہوتا۔

☆☆☆

”امی! بھائی کی شادی بھی ساتھ ہی کر دیں۔“

کرن نے جوش سے مشورہ دیا تھا۔

”اتنی جلدی کون رشتہ دے گا۔“ ضویا ہنسی تھی۔

”رشتہ کیوں، ہم حصہ کو بھابھی بنائیں گے نا۔“ کرن نے امی کو دیکھا۔

مائی اور امی کی یہ خواہش اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ایسے طور پر وہ اکیلے میں ایسی باتیں کرتی تھیں

مگر بچے چھوڑا سن کر ہی کتنا زباہہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں، یہ انہیں معلوم نہ تھا۔ مائی بھی کو بار بار اس باتیں کہ

حصہ کو حاشر کے لیے مانگ لو مگر وہ بچپن کے رشتوں کے حق میں نہیں تھیں۔ جانے بڑا ہونے کے بعد

بچوں کی کیا مرضی ہوتی۔ پھر بیویوں کے رشتے بھی خراب ہوتے۔ انہیں بیٹی پیاری تھی مگر ماں کی اس

خواہش کو ہر بار ٹال جاتیں۔ حصہ کی آنکھوں میں حاشر کا خواب جننے کی وجہ شادی نہیں رہی۔ وہ دادی

کی لاڈلی تھی۔ ان کے ساتھ ہی رہتی۔ پچھو سے لپٹا

لپٹا کر پیار کرتیں۔ میری گڑیا، میرے گھر کی رونق

تھیں تو دھیان کا پچھی اپنی من پسند دنیا کو آ جاتا۔

”ارادہ تو یہی ہے بیٹا مگر حاشر سے پوچھے بغیر تو

کچھ نہیں کروں گی۔ کیا پتا، اسے کوئی اور پسند ہو۔

ابھی تو حصہ بھی پڑھ رہی ہے، جب شادی کا وقت

آئے گا، دیکھا جائے گا۔ تمہاری اور حاشر کی شادی

ساتھ کروں گی۔“

ای نے سمجھاؤ سے جواب دیتے پیار سے اسے دیکھا۔

”نہیں امی! پھر میں بھائی کی شادی کیسے انجوائے کروں گی۔“ وہ ہنسی۔

”مشرقی لڑکیاں، اپنی شادی کی بات پر شرمایا کرتی ہیں۔“ ضویا نے اسے چھیڑا۔

”نہیں بھئی، آج کل شرمانے والی لڑکیوں کا ٹریڈ نہیں۔“

اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو ان دونوں کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

”پیرینڈ بھی پرانا نہیں ہوتا۔ مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگتی، اپنے منہ سے شادی کی بات کرنے والی چچیاں۔“

امی نے صاف گوئی سے ناگواری کا اظہار کیا۔

”میں نے کب بات کی اپنی شادی کی۔ میں تو بھائی کی شادی کا پوچھ رہی ہوں۔ آپ نے ہی موضوع بدلا۔ شادی نہیں کرنی تو بھائی کی۔ منگنی ہی

کروں۔ کچھ حرا آئے۔“

گرن نے احتجاج کے ساتھ فرمائش بھی ریکارڈ کروائی۔

”بہی بھی منگنیاں نہیں اچھی لگتیں مجھے۔ تم فالٹو باتیں چھوڑو اور مہمانوں کی فہرست بناؤ۔“ امی نے اسے ڈپٹ کر کام پر لگایا۔

☆☆☆

”پلیز حصہ! بہن نہیں ہو۔ چلو میرے ساتھ مارکیٹ۔ بچاری ضویا کا بھی بازار جا کر حشر ہو گیا ہے۔“

گرن بہت حاجت سے مت کر رہی تھی۔

”فراز بھائی نے جہیز سے تو سختی سے منع کر دیا تو بازار کے اتنے چکر کیوں لگ رہے ہیں۔“

”حصہ تعجب سے پوچھ رہی تھی۔

”جوتو! کے لئے اسے کسی راعتار نہیں۔ کہہ رہی تھی

بری میں اللہ جانے کیا ہو۔ میں اپنی پسند کے کپڑے تو بنواؤں۔ پھر اس کے بیوٹی پارلرز کے چکر، میرے

سینڈل اب تک نہیں ملے۔ امی اپنے اسکول میں مصروف۔ میں اکیلی کیسے جاؤں۔ تم آج واپسی پر

میرے ساتھ چلو تو لے لوں۔ تمہاری تیاری ہو گئی پوری؟“

اس نے تفصیل بتاتے ہوئے پوچھا۔ ضویا ان دونوں سے بڑی تھی مگر وہ نام لینے کی ہی عادی نہیں۔

ضویا کی خوش لباسی اور حسن پورے کالج میں مشہور تھا۔ وہ اپنا خیال رکھتی بھی بہت تھی۔ لڑکیوں نے اسے ”بیوٹی دد برین“ کا خطاب دیا تھا۔ اس کے

مقابلے میں وہ دونوں مست ملگ تھیں۔ گرن غیر نصابی سرگرمیوں میں تو حصہ نصابی سرگرمیوں میں

آگے آگے ہوتی مگر لباس اور فیشن کا وہ گریزان میں نہیں تھا جو ضویا میں تھا۔ اب بھی بہن کی شادی کی

خوشی میں گرن تیار یوں میں لگی تھی جبکہ حصہ کو امتحانات کی فکر تھی۔

”سوٹ تو سلوا لیا میرا امی نے۔ سینڈل چچی کے میچ ہو گئے۔ بس ایک اور ریڈی میڈ لینے کا ارادہ

ہے ویسے کے لیے۔“

اس نے سکون سے جواب دیا۔

”تو میرے ساتھ چلو، تم بھی لے لینا۔ امی نے اپنا اے بی ایم کارڈ دے دیا تھا۔ جتنی ضرورت ہوئی، میسے نکالیں گے۔“

گرن فوراً اپنے مطلب پر آئی۔

”یونیورسٹی میں اتنی خواری کے بعد بھی تمہارے اندر ہمت ہے کہ بازار جاؤ گی۔“

”حصہ نے آنکھیں پھیلائیں مگر گرن کے غصیلے تیور دیکھ کر اسے ماننا ہی پڑا۔

”شائے مال میں پہنچے ہی پہلے وہ لوگ فوڈ کورٹ گئے تھے۔ کھانا کھا کر جان آئی تو کچھ خریدتے۔

”فوڈ کورٹ میں ایک طرف لڑکے، لڑکیوں کا بڑا سا گروپ ہی مذاق میں مشغول تھا۔

”حصہ نے دیکھا، ان میں حاشر بھی تھا۔ وہ سب

دوست کسی پارٹی کے لیے یہاں جمع تھے۔ الگ الگ ہسٹالوں میں چاب کے بعد ایک جگہ ملاقات کرنا ان کے لیے بہت خوشی کا باعث تھا۔

حاشر کے برابر میں بیٹھی پیاری سی لڑکی، اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

”حصہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اس لڑکی کا دوستانہ انداز اس کے دل میں دھواں بھر گیا۔ اس نے نظریں ہٹا کر، اپنی سانس لے کر خود کو نادل کرنا چاہا مگر تب

تک حاشر نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ خوش گوار انداز میں اپنے دوستوں سے معذرت کرنا ان تک آیا تھا۔

گرن، بھائی کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی شاپنگ کے بعد گھر ڈراپ کرنے کا مطالبہ کر دیا تھا تاکہ پبلک کنونینس میں پریشان نہ ہونا پڑے۔

وہ دونوں جلدی جلدی کھا کر اٹھ گئی تھیں۔ گرن نے اپنی شاپنگ کرتے اسے بھی بار بار کچھ خریدنے پر مجبور کیا دل نہ چاہنے کے باوجود حصہ اس کے

ساتھ خریداری میں مصروف تھی۔ اپنی کیفیت خود اس کی سمجھ سے باہر تھی، حاشر، اس کا صرف کرنا تھا۔ وہ

دوستوں کے ساتھ ٹھوٹایا لڑکیوں سے بے تکلف ہوتا، اس کا دل کیوں بچھ رہا تھا۔ ضروری تو نہیں جو

جذبات وہ حاشر کے لیے رکھتی تھی، وہ بھی اسے ویسے ہی سوچتا۔

اسے آج احساس ہوا تھا کہ حاشر کی بولتی آنکھوں کا لکھا ہوا ہے وہ بہت دور نکل آئی ہے۔ ان کے درمیان کوئی وعدہ نہیں تھے۔ حاشر کی اپنائیت

تمام کزنز کے لیے یکساں تھی، شاید وہ ہی غلطی کا شکار ہو گئی تھی۔ میڈیکل کی فیلڈ سے شعل رکھنے والے

تویوں بھی اپنی جتنی شریک حیات ڈھونڈتے تھے۔ وہ خود کو خالق کا سبق پڑھاتی، خوش فہمیوں کے سمندر

سے باہر نکال رہی تھی مگر دل میں رکھتے ہوئے خوابوں کا دھواں حلق میں ہی بھر رہا تھا۔ ابھی وہ شاپنگ ہی

کر رہی تھیں، جب حاشر بھی اسی لڑکی کے ساتھ ان کے پاس چلا آیا۔ اس کے سارے دوست چلے گئے

تھے۔ اسے حاشر نے ڈراپ کرنا تھا۔ حاشر کی جلدی

جلدی کی رٹ کے باوجود گرن آرام سے حصہ کا سوٹ پسند کرنے میں لگی تھی۔ آخر وہ اس کے ساتھ

اتنی دیر دکان دکان پھری، اب اس کی ہی شاپنگ رہ جاتی تو کتنا برا لگتا۔

حاشر کی دوست فضا بہت خوش مزاج لڑکی تھی۔

جلدی کی رٹ کے باوجود گرن آرام سے حصہ کا سوٹ پسند کرنے میں لگی تھی۔ آخر وہ اس کے ساتھ

اتنی دیر دکان دکان پھری، اب اس کی ہی شاپنگ رہ جاتی تو کتنا برا لگتا۔

حاشر کی دوست فضا بہت خوش مزاج لڑکی تھی۔

جلت چائے بناؤہ آرام سے انہیں سوٹ پسند کرنے میں مشورے دے رہی تھی۔ ڈارک براؤن لکڑ کا ایک

اسٹائش سوٹ پکڑے وہ اس کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی، جب حاشر نے وہ سوٹ اس سے لے کر

حصہ کے ہاتھ میں دیا۔

”بس اب لے لو۔ تمہیں تو کوئی سوٹ پسند نہیں آ رہا۔“

وہ حد درجہ اکتایا ہوا تھا۔ حصہ نے ایک نظر اسے اور دوسری مسکرائی فضا پر ڈالی۔ یہ سوٹ حاشر

نے اس کے لیے پسند کیا ہوتا تو وہ مکمل اچھی مگر یہ فضا کی پسند تھا۔ دل میں درد کی لہر اٹھی مگر اس نے

دبائی۔ جب حاشر نے اسے ہی منتخب نہیں کیا تو اس کے لیے سوٹ کیوں منتخب کرنا۔ اس نے بے دلی سے

وہی سوٹ لے لیا تھا۔

☆☆☆

ضویا کی شادی میں شریک ہونا مجبوری تھی۔

خاندان کا معاملہ تھا۔ وہ کسی کو اپنے دل کا بچہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ اس کی عبت کی جھک ہوئی۔ بس

پڑھائی کا بھانا کر کے وہ وقت کے وقت جاتی اور جلدی واپس آ جاتی۔ اس کی توجہ دیکھ کر سب گرن کو

اس کی لاپرواہی کا احساس دلاتے مگر وہ بے فکری سے ہنس دیتی۔ سب بھی کہہ رہے تھے کہ حصہ اپنی پچھو

کی طرح سختی ہے، ضرور کسی اونچے مقام کو پائے گی۔

خواتین کی نوکری کی مخالف دادی اور امی بھی یہ سنتیں تو انہیں حصہ پر فخر ہوتا۔ وہ خاموشی سے سب کے

تہیزے سنی مسکرا دیتی۔

شادی والے دن بھی باہر ہنگاموں میں اس کا

دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ پچھو کے کہنے پر ضویا کے

ساتھ پارلر گئی تھی اور واپس آ کر اس کے پاس ہی

برا بیڑل روم میں بیٹھی رہی۔

حاشر بہت تیزی سے اندر کچھ کہنے آیا تھا مگر نظر اس پر پڑی تو لمحہ بھر کو ساکت رہ گیا۔ پہلی بار اسے اس قدر بجا سندور دیکھا تھا۔ اس کا بے اختیار ٹھٹھکانا حفسہ اور ضویا نے بھی محسوس کیا تھا۔ محبت کی غیر مرئی شعاعیں اس کے اندر تک اتری تھیں۔ وہ فوراً نظر جھکا گئی تو وہ ہوش میں آیا لیکن کے پاس آ کر اسے پیار کرنے لگا۔

”بھائی! آخر تو ہے۔“

کھڑے ہو کر بھائی کے شانے سے ٹکتے ضویا نے شوقی بھری سرگوشی کی تھی۔ وہ مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا حفسہ پر دوسری نظر ڈالے بنا ہر نکل گیا۔ بہت چاہنے کے باوجود اس نے خود پر ضبط کا بند باندھا تھا۔ البتہ دل میں دبی خواہش ہمک کر اوپر آ گئی تھی۔

حفسہ کے دل میں مرجھایا پودا اس بھر پور نظر سے دوبارہ زندگی پکڑ لیتا اگر شادی میں اس کی ملاقات حفسہ سے نہ ہوتی۔ حاشر کے سب سے دوست انوا بیٹھتے تھے۔ حفسہ کے علاوہ بھی دو، تین لڑکیاں موجود تھیں۔ ان سب کے مابین دوستی بھری فضا سب کو نظر آرہی تھی مگر حفسہ خود کو دوبارہ کسی خوش فہمی میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اسی لیے جذبات کو قفل کے تابع کرنے کی بے نتیجہ سعی میں مصروف رہی۔

جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ نصیب کے لکھے سے کون بھاگ سکتا ہے۔ خوش باش لوگوں کے درمیان وہ کاٹنی سی لڑکی خود سے جنگ میں مصروف تھی۔

دیسے والے دن وہ لوگ مہمان تھے۔ سب اکٹھے ہی ہوئے پہنچے تھے۔ اسی ڈارک براؤن سوٹ میں تک سب سے درست حفسہ، حاشر کو دل کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی مگر اس کا خوبصورت چہرہ بہت اداس لگ رہا تھا۔

”خیریت تو ہے، تم کس حد سے کاٹکار ہو۔“ وہ اور کرن ریش چھٹنے کے انتظار میں اس کے ساتھ کھڑی تھیں، جب حاشر بھی وہیں آ گیا۔

وہ اپنے دل کا چور چھپانے کو غیر ارادی طور پر ہاتھ چہرے تک لے گئی تھی۔ لب زبردستی پھیلائے۔ اس کی محبت اتنی ارزاق نہ تھی کہ یوں عیاں ہونی جبکہ کرن نے دل کر بھائی کو جواب دیا تھا۔

”اللہ نہ کرے، کوئی صدمہ ہو۔ بس پیپر ز کی ٹینشن سر پر سوار کر رکھی ہے اس نے۔“

”تم ہی تو تھوڑی سی فکری اسے دے دو۔ مجال ہے کبھی پریشان دیکھا ہو نہیں۔“

حاشر نے بہن کی کھچائی کا موقع جانے نہیں دیا لیکن وہ اپنے نام کی ایک سی تھی۔ مجال ہے جو اثر لے۔

”اس نے تو پوزیشن لینی ہے، کیریئر بنانا ہے اپنی پھپھو کی طرح۔ اب میری کوئی پھپھو ہی نہیں تو میں پوزیشن لے کر کیا کروں۔“

وہ مزے سے ہنسی خود پر مصنوعی دلگرفتی طاری کیے ہوئی۔ حاشر بے اختیار ہنسا تھا جبکہ حفسہ کے چہرے پر بھی مسکان چھلکی تھی۔

”بذریعہ تم نے واقعی چاب کرنی ہے۔“ لیکن کے سر پر چپت لگا تا وہ حفسہ سے پوچھ رہا تھا۔

حفسہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نوکری کرنا اس کی خواہش بھی تھی اور اس وقت اس کی دلی حالت چھپانے کے لیے بہترین پر وہ بھی تھی۔

”چلو اس پر ضویا سے مل کر آتے ہیں۔“ وہ مزید تبصرہ کے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔

انچ پر ضویا دلی خوشی کا عکاس چمکتا چہرہ لیے ان کی خنجر بیٹھی تھی۔

☆☆☆

ماسٹر مکمل ہوتے ہی جہاں کرن نے سکون کا سانس لیا، وہاں حفسہ پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ اس نے کان میں جاب کے ساتھ ایم فل میں ایڈمیشن بھی لے لیا تھا۔ اخبارات میں پبلک سروس کمیشن کے اشتہار دیکھ کر ایک کے بعد ایک وکٹمی کے لیے اپلائی کر دیتی۔ اس کی اس مصروفیت سے

گھر والے پریشان تھے مگر وہ کافی مطمئن تھی۔ دن، رات مختلف کاموں میں اٹھنے اسے دل کی پکار پر دھیان دینے کا وقت بھی نہیں ملتا۔

جہاں پھپھو زور و شور سے کرن کے لیے رشتے ڈھونڈنے میں مصروف تھیں۔ وہاں امی بھی اس کی شادی کو مقصد حیات بنائے بیٹھی تھیں۔ چچی بھی اپنے بھائی کا رشتہ حفسہ کے لیے لائیں مگر بیرون ملک ہونے کی وجہ سے معذرت کر لی تھی۔ انکوئی بیٹی کو اتنی

دور بھیجنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔ امی کی تک دودھ کچھ کر ایک استہزائیہ مسکراہٹ حفسہ کے لب پر آ جاتی۔

سو ثابت ہوا کہ اس کا دل بیوقوف تھا، غلط شکل دیتا تھا مگر نہ حاشر چاہتا تو اس کا رشتہ مانگنے میں پھپھو کو کیا عذر مانع ہوتا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی آئیڈیل پھپھو دیکھنے میں جتنی بھی روشن خیال لگیں مگر رات پنی مشرقی ماؤں کی طرح وہ بیٹی سے پہلے بیٹے کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ خیال یہی تھا کہ کرن کا رشتہ ہو جائے تو وہ حاشر کے لیے حفسہ کو مانگ لیں گی اور اکٹھے دونوں کی شادی کر دیں گی۔

مگر پھر دادی کے بار بار احساس دلانے پر وہ بیدار ہوئیں۔ اگر ابھی بھی وہ رشتہ نہیں پا سکتیں تو بھائی، بھائی بیٹی کا رشتہ کیوں اور کر دیتے۔ بیٹی کو بہو بنانا ان کی برائی خواہش تھی۔ حاشر کے رجحان کا بھی اندازہ تھا مگر اس وقت وہ حیران بلکہ پریشان رہ گئیں، جب حاشر نے حفسہ کے لیے رخ کرتے

انہیں کہیں بھی رشتہ کرنے کی آزادی دیے دی۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ ماں تھیں، اس کے انداز پچھاتی تھیں۔ ضویا نے بھی انہیں حاشر کی حفسہ کے لیے پسندیدگی سے آگاہ کیا تھا۔ تو ان سب کو غلط فہمی ہو گئی یا کچھ اور مسئلہ تھا۔

”حفسہ! کیوں نہیں بیٹا۔ جب تمہیں کوئی پسند نہیں تو حفسہ سے اچھا کون ہے۔“

وہ تعجب سی پوچھ رہی تھیں۔

”حفسہ بہت اچھی ہے امی! لیکن مجھے لگتا ہے

کہ ہمارے خیالات بہت مختلف ہیں۔ شاید ہم ایک ساتھ خوش نہیں رہ پائیں۔ بعد کی رخصت سے بہتر ہے کہ ابھی سوچ کر فیصلہ کیا جائے۔“

حاشر نے اپنے دل پر پاؤں رکھ کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی دل کے مقابلے میں دماغ کو مقدم رکھتا مگر اب کی بار دل کا احتجاج برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”اچھی بھلی بچی ہے۔ تمہارے ایسے کون سے خیالات ہیں جو لڑکیاں کرو گے۔“

ای اٹھا ہوا بھی تھیں۔ حاشر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کن الفاظ میں اپنا مدعا سمجھائے۔

”وہ بہت کیریئر اور ریڈیو قسم کی لڑکی ہے امی۔ میں باؤس وائف چاہتا ہوں۔ بعد کے مسائل سے بہتر نہیں کر۔“

اس نے جملہ ادھر ادھر چھوڑ دیا۔ بار بار اپنی زبان سے راستہ بدلنے کا اعلان کرنا مشکل تھا۔

”سب لڑکیاں باؤس وائف ہی ہوتی ہیں۔ مگر وائف سے ہی بنتا ہے۔ چاہے وہ جاب کریں نہ کریں۔ مجھے نہیں معلوم تھا، تم اتنے تنگ نظر ہو۔“

وہ حشکی سے کہہ رہی تھیں۔

”میں تنگ نظر نہیں ہوں امی۔ نہ ہی لڑکیوں کی جاب کے خلاف ہوں۔ بس مجھے اچھا لگے گا کہ میری بیوی گھر بیٹھ کر میرا انتظار کرے۔“

وہ ماں کی دل شکنی کے خیال سے کہہ نہ سکا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے ماں کی مشکلات سمجھنے میں اپنا بچپن کھوائیں۔

”بس اب میں تمہاری ایک بات نہیں سنوں گی۔ یہ کوئی بات ہو ہی پھلا۔ میں تو تمہیں بہت ذمہ دار، سچو رانسان سمجھتی تھی اور تم۔“

وہ کہتی جا رہی تھیں۔ مستقبل کے بے شمار اندیشوں کے باوجود حاشر نے اپنے دل میں سکون سا اثر محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ خود چاہتا تھا کہ امی اس کی بات نہ مانیں، تب ہی اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے مسلسل ڈراتے دماغ کو چپ کر دیا تھا۔

اگلے ہی دن پچھو منے گئی تھیں۔ باقاعدہ رشتہ لے جانے سے پہلے وہ بھانجی سے نہ صرف اجازت لینا چاہتی تھیں بلکہ حاشر کے تحفظات بھی ان کے علم میں لانا چاہتی تھیں۔

حسب توقع وہ سب ان کی خواہش جان کر خوش ہو گئے تھے۔ گھر بھر کی لاڈلی حصہ نظروں کے سامنے محفوظ ہاتھوں میں رہتی، اس سے بڑھ کر کیا تھا۔ حصہ کا نوکری کرنا ویسے بھی اسی اور دادی کو پسند نہیں تھا سو یہ ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اسی لیے انہوں نے حصہ کو بھی اس بارے میں بتانے کی زحمت نہیں کی۔

گھر میں مشورے کے بعد اگلا اتوار باقاعدہ رشتہ لاکر رسم کرنے کے لیے مختص ہوا۔ حصہ کے لیے یہ خوش گوار جھلکا تھا۔ اب جب وہ مایوس ہو چکی تھی، اللہ نے اپنی رحمت سے اس کے من کی مراد پوری کر دی۔ وہ خوشی سے لگ رہ گئی تھی۔ اس کا رواں رواں شکر ادا کر رہا تھا مگر خوشی کا یہ وقت بہت محدود تھا۔

☆☆☆

گھر میں چہل پھل اور رونق تھی۔ پچھو لوگ اس کا رشتہ لائے تھے۔ اپنی نو عمری کے پہلے خواب کی تعبیر حاصل کرنے پر وہ شادی ہواؤں میں اڑ رہی تھی، رسم کے بعد سب باہر محفل جمائے بیٹھے تھے، جب کرن کی بے خیالی میں کئی باتوں نے اسے آسمان سے زمین پر مارا تھا۔

”تمہیں بھانجی بنانا میری بچپن کی خواہش تھی۔ پتا ہے، میں تو ہزار بار اسی سے کہہ چکی تھی کہ ہم منگنی کر دیتے ہیں مگر اسی کو بھی منگنیاں پسند نہیں، دیکھنا اب وہ جلد ہی شادی کریں گی۔ اچھی اتنا وقت بھی بھائی کی وجہ سے لگ گیا، جانے ان کے دل میں کیا سودا سلیا، کہنے لگے حصہ نہیں، اس کے علاوہ جو بھی ہو۔ اسی نے اچھی بھانجی کی ان کی۔“

کرن حڑے سے کہتی جا رہی تھی اور حصہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ ایسا بے عزتی۔

”کیا کہا تم نے۔“

اس نے بمشکل کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

کرن نے چونک کر اسے دیکھا۔

”وہ راضی نہیں تھے اس رشتے پر؟“ اب وہ سختی سے پوچھ رہی تھی۔ گزریے وقت اور زمانے کی ہوا نے اسے مضبوط کر دیا تھا۔ وہ اب ٹین اینکر لڑکی نہیں تھی جو نرم لفظوں کو محبت سمجھ سکتی تھی۔

”نہیں، بھائی کی مرضی کے بنا کیا ہوتا بھلا۔ وہ تو ہمیں پسند کرتے ہیں۔ بس انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ تم لوگوں کا مزاج الگ ہے۔“ کرن نے بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تانسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جانتی تھی کہ اب وہ اسے بھلا رہی ہے۔

دل میں پھیلا خوشی کا سارا احساس بھاپ بن کر اڑا تھا۔ اب وہاں آبلے تھے۔ بکھرے خوابوں کی کرچیاں تھیں اور اس کی ایک طرف محبت ایک کونے میں منہ دیے سسک رہی تھی۔

اسے ایک طرف احساسات کو بے قوفی سمجھ کر ان پر ہنسنا، خوش گمانی سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آنا اس کے لیے مشکل تھا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا کہ وہ اس کے جذبات سے بے خبر ہے۔ محبت خود رو پودے کی طرح نہیں بھی اگ جاتی ہے۔ وہ نہ تو زبردستی اس کے دل میں اپنی محبت کا بیج ڈال سکتی تھی، نہ یوں اسے پاسکتی تھی۔

لیکن یہ خیال کہ وہ اس پر مسلط کی گئی ہے۔ وہ اسے اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنانا چاہتا تھا، اس کی رگیں کاٹ رہا تھا۔ محبت کا وہ تناور درخت جو وہ اپنے تئیں کاٹ چکی تھی۔ پھر جڑیں پھیلا کر راتوں رات اگ آتا تھا۔ اب کی باروں میں جدائی کا اندیشہ نہیں بلکہ اپنی بے وقوفی کا غم تھا۔ جو شخص اس کے لیے شادمانی کا دوسرا نام تھا۔ وہ اس کے لیے اتنی کم مایہ تھی۔

ایک بار پھر سب خوش تھے اور وہ اپنی ہی ذات میں مقید اندر ہی اندر زخمی ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ بچھٹ پڑے لیکن کیا کہے۔ رشتہ اس کی مرضی سے

طے ہوا تھا۔

اچانک سے کرن کا رشتہ بھی طے ہو گیا تھا۔ یاد اب کی بار ان کی کلاس کی ایک لڑکی کے ذریعے گھر تک آیا تھا۔ اب وہ بے روزگار زیر تعلیم نوجوان نہیں تھا بلکہ ایک اچھی جاب کا حامل تھا۔ اس کی محبت بھی تھی۔ شاید اس کی دعاؤں کا ہی اثر تھا جو اب تک کرن کا رشتہ نہیں طے نہیں ہو سکا تھا۔

آنا فنا دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ امی نے اسے مزید جاب پر جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہی جھلک سوچوں میں لم اتنی پڑمردہ ہو رہی تھی کہ خاموشی سے ان کی بات مان لی۔

کسی کام میں دلچسپی لیے بنا وہ سر منہ لیپے لیٹی رہتی۔ دادی کو اب اس کی بے رونق صورت دیکھ کر تشویش ہونے لگی تھی۔

اس دن امی اور چچی شادی کی تیاریوں کے لیے شاپنگ پر گئی تھیں، جب حاشر ثانی کی خیریت معلوم کرنے آ گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی ٹائم کے حساب سے آتا تھا۔ جاب اور یونیورسٹی کی مصروفیات میں کافی عرصے سے ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ رسم والے دن دیکھی جھلک کے بعد سے حاشر کا دل اسے دیکھنے کے لیے جل رہا تھا۔ اسی لیے بہانے سے چلا آیا۔

حاشر کو دیکھ کر وہ مارے باندھے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سب بچے ٹیوشن گئے تھے۔ اس کا ارادہ بھی تھا کہ یہاں سے اٹھ کر امی کے کمرے میں چلی جائے کی مگر دادی نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی سستی کی تفصیل بتا کر حاشر سے نسخہ لکھوانے کو بے تاب تھیں۔

”دادی! میں ان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی جاتی ہوں۔“

دماغ میں ابھرتے سوالات سے بھگ آ کر حصہ نے محول میں فیصلہ کیا۔ وہ اس سے حساب لینا چاہتی تھی۔ اس کی ذات اتنی ارزاق نہیں تھی کہ

زبردستی کسی کے سر منہ ہدی جاتی۔ بچی محبت کرنے والے باور کی طرح راستے ڈھونڈ لیتے ہیں مگر زبردستی کسی کا راستہ نہیں کاٹتے۔ اگر حاشر اسے پسند نہیں کرتا تو وہ بھی اپنی محبت کی بے توقیری برداشت کیے بغیر پوری عزت کے ساتھ یہ رشتہ ختم کر دے گی۔

”ڈاکٹر تو یہ خود ہے۔“

دادی نے منہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ حاشر نہ سمجھنے والے انداز میں دادی پوچھ کر دیکھ رہا تھا۔ جو اس کی موجودگی کیمرہ بھلائے آپس میں لگی تھیں۔

”ٹیسٹ کروانا ہے دادی! مجھے لگ رہا ہے خون کی کمی ہو گئی ہے۔“

حصہ نے دادی کی کم زوری پکڑی۔ دادی نے پریشانی سے اس کی شکل دیکھی۔

”تب ہی رنگ اتنا پھلا ہو رہا ہے۔ مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ حاشر جاننا! اسے خون کی بوتل لگوا دے۔ بچے ٹیوشن سے آئیں گے تو گھر خالی ہو گا ورنہ تو میں خود ساتھ جاتی۔“

دادی نے افسوس سے ہاتھ ملتے حاشر کو حکم دیا۔ ان کے یوں گھر بیٹھے مرض کی تشخیص سے علاج تک پہنچنے پر وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر جان چکا تھا کہ یہ دھوپ چھاؤں سی لڑکی اس کے ساتھ باہر جانا چاہتی ہے اور یہ وقت میڈیکل سائنس پڑھانے کا نہیں سو خاموشی سے باہر نکل گیا۔

وہ دادی کو تسلیاں دیتی آ کر گاڑی میں بیٹھی تو حاشر نے گاڑی آگے بڑھاتے اسے دیکھا۔

”اب کیا کرنا ہے۔ کہاں سے خون لے کر چڑھاؤں گے۔“

اس کے انداز پر حصہ کے لب بے اختیار پھیلے۔

”ضروری بات کرنی ہے مجھے آپ سے۔“

”ضرور کرو، مگر یہ اپنا حشر کیا بتایا ہے۔ ثانی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بہت کم زور لگ رہی ہو۔“

نے سر جھکا۔ اس کی بچی باتیں اسے خوش فہمی میں مبتلا کرتی تھیں۔

”آپ کو پھپھو نے زبردستی مجھ سے شادی کے لیے راضی کیا ہے۔“

اس نے بلا تامل پوچھا۔

”کیا مطلب۔“ حاشر کا پاؤں بے اختیار بریک پر گیا۔ یہ سوال غیر متوقع تھا۔

”زبردستی تو خیر کوئی نہیں ہوئی۔“

وہ اسے جواب دیتا اب گاڑی سڑک کے ایک طرف کر کے لگا رہا تھا تاکہ فرصت سے اسے دیکھ کر بات کر سکے۔

”مجھے کرن نے خود بتایا ہے کہ آپ نے منع کر دیا تھا اور پھپھو کے کہنے پر راضی ہوئے۔“

وہ اس کے یوں انکار کر دینے پر ایک دم غصے میں آئی تھی۔

”کرن تو بے وقوف ہے اور تم اس سے بڑی بے وقوف ہو۔ مجھے لگتا تھا بلکہ ہے کہ ہمارے خیالات میں تضاد کی وجہ سے ہم میں بہت اختلافات ہوں گے۔ اسی لیے منع کر رہا تھا، پھر سوچا کہ ایسی فضول بات پر اپنی محبت کون چھوڑتا ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ مل جل کر گزارا کر ہی لیں گے۔“

حاشر نے اس کی طرف رخ کر کے حرف پر زور دیتے دھیان سے اسے دیکھا۔

اس کا اچانک اظہار محبت حشہ کو ہڑبزانے پر مجبور کر گیا۔

”محبت کون۔“ ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔

حاشر زور سے ہنسا تھا۔

”تم، بیوقوف لڑکی تم خود۔ ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اظہار محبت اپنی بیوی سے ہی کروں گا مگر تم نے مجھے مجبور کر دیا۔“

اپنی عادت کے برخلاف وہ چپک رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔

”باتیں مت بنائیں، منع کیوں کیا تھا آپ

نے۔“ وہ فوراً بچھل بات پر آئی۔

”تمہیں مای اور نانی نے کچھ نہیں بتایا۔“

اس نے حشہ کو بغور دیکھا۔ حشہ نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”کیونکہ تم اپنے کیرر کے لیے اتنی سنجیدہ ہو، جبکہ میری خواہش ہے کہ میری بیوی ایک فل ٹائم ہاؤس وائف ہو۔ میں جب تمہیں جاب سے منع کروں گا تو جھگڑا ہوگا۔ تمہاری جاب میرے کہنے پر ہی مای نے چھڑائی ہے۔“

حاشر نے صاف کوئی سے کہا۔

”ہیں حشہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ انداز کھودا پہاڑ نکلا چہا جیسا تھا۔ اسی کے بعد حشہ کا یہ رد عمل دیکھ کر حاشر کو خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ جس بات نے اس کا سکون چھین لیا۔ وہ ان سب کے لیے اہمیت ہی نہیں رکھتی۔“

”تم جاب نہیں کرو گی ناشادی کے بعد۔“

اس نے حشہ سے یقین دہانی چاہی۔

”آپ کو خواتین کا جاب کرنا کیوں پسند نہیں ہے جب کہ آپ کی تو اپنی ہی جاب کرتی ہیں۔“

حشہ کے لہجے میں اب بھی استعجاب تھا۔ اس نے حاشر کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

”اسی لیے نہیں پسند ہے۔ اپنی امی کی روشنی دیکھ کر ہی میں چاہتا ہوں کہ میرے بچوں کی امی جاب نہ کرے۔ ان کے ساتھ مکمل وقت بتائے۔“

اس نے مکمل سنجیدگی سے کہتے حشہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ حاشر کی آنکھوں میں چمکتی خوشی نے اس کے کمال تپا دیے تھے۔ وہ نظریں چراگئی۔ پھر بات بدلنے کو بولی۔

”ملک کی آدمی آبادی خواتین کی ہے اگر آدمی آبادی کام نہیں کرے گی، گھر بیٹھے کی تو ملک کیسے ترقی کرے گا۔“

”قوموں کا سرمایہ ان کے جوان، ان کے بچے ہوتے ہیں۔ مادی اشیاء نہیں۔ ہماری آدمی آبادی

جس نے اگلی نسل کی تربیت کرنی ہے، وہ زبردستی کی مشقت میں مصروف ہوگی تو ہماری اگلی نسل کیا سیکھے گی۔ تمہارے وقت اور علم کی ضرورت ہمارے گھر کو زیادہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے اسکول سے آئیں تو انہیں سینے میں چھپا کر ان کی باتیں سننے والی ماں خود تھکاوٹ کا شکار ہو۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ماں کے پیچھے پھرنا پڑے اور ماں گھڑی کی سونوں کے ساتھ گھر اور جاب کو چلانے میں خود کو بھول جائے۔“

حاشر کے لہجے میں یاسیت تھی۔ ماں کو پانے کی تڑپ تھی۔ بچپن کے کھوئے ہوئے لمحوں کی پکار تھی۔ وہ خاموش رہ گئی۔

پھپھو کی گروڈر سٹائلی اور ماحاشی آسودگی اسے جاب کی طرف مائل کرتی تھی مگر خود جاب کی مشکلات برداشت کر کے اسے اندازہ ہوا کہ درحک و دامن کے لیے گھر داری آسان نہیں۔ سارے دن کی تھکاوٹ گھر میں شہر کام دیکھ کر دو چند ہو جاتی ہے مگر معاملے کا یہ پہلو اس کی نظر سے بالکل اوجھل تھا۔

خود مختار، خود انحصار، بااعتماد نظر آنے والے حاشر کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی، دل میں جانے کیسی کک پنہاں تھی، جو اس کے اندر تک اتری تھی۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا، اسی لیے منع کر رہا تھا۔ سب کا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ تمہیں جاب کا شوق ہے۔ ساری زندگی ہم دونوں بلاوجہ کی بحث کرتے رہیں، اس سے بہتر کارہ کر لینا ہے۔ فیصلہ اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

حاشر نے اس کی خاموشی سے جانے کیا سمجھا کہ ساری بات سمیٹ کر اس کی خواہش اور خواب کو ترازو کے پلڑوں میں رکھ دیا۔ حاشر نہیں چاہتا تھا مگر وہ تو جانتی تھی کہ جاب ایک شوق تھا مگر وہ خود اس کی اداس عمری کا خواب تھا۔ اس نے مسکرا کر اپنے سر سے غصے کی حسین تعبیر کو دیکھا۔ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

”آپ بعد میں بھی مجھے روڈ پر کھڑا کر کے صرف پیکر ہی پلایا کریں گے یا کبھی کبھار اور بھی ملے گا۔“

اس کے شرارت سے کیے سوال میں حاشر کے لیے جواب پوشیدہ تھا۔ اطمینان، سکون، محبت، خوشی جانے کیا احساس تھے، جو اس کی روح پر پھوار بن کر بر سے تھے۔ وہ سر ہٹا رہا تھا۔

”بعد میں تو تمہیں اپنے پیار کا امرت دھارا پلاؤں گا۔“ وہ ایک دم بے باک ہو گیا۔ حشہ کا چہرہ سرخ ہوا۔

”ہیں، زیادہ اور مت ہوں۔ مجھے گھر ڈراپ کر دیں۔“

حشہ کے لیے اس کی نظروں کا سامنا مشکل ہو رہا تھا۔

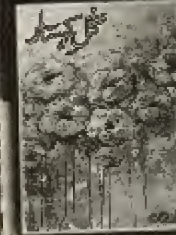
”نانی کو کیا بتاؤ گی، کتنی بوتلیں خون کی چڑھاؤ ہیں۔ بیلے چہرے کو لال کر دیا میں نے۔“

وہ گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں رہا تھا۔ حشہ بھی ہنس پڑی۔ تضادات کو اختلاف نہ بنایا جائے تو زیست نکل ہو جاتی ہے۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

گل کھسار



نور جمالی

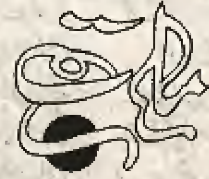
قیمت - 400/- روپے

منگلے کا پتہ

ملکتیہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر 32735021

37، اردو بازار، کراچی



”زندگی پورے من کے ساتھ گزارنی چاہیے۔“

میں نے اپنے سامنے کھلی کتاب میں سے یہ جملہ پڑھا۔ مجھے کتابوں کا شوق نہیں ہے، یہ تو زرفشاں کا شوق ہے۔ وہی شاید پڑھتے پڑھتے کتاب پوں ہی کھلی چھوڑ کر چلی گئی تھی اور پتا نہیں کیوں میری نظریں اس جملے پر ٹھہر گئیں۔

ناولٹ

میں نے اسے پڑھا اور اپنے آپ سے پوچھا ”کیا میں نے زندگی پورے من کے ساتھ گزار لی ہے؟“ میں ایک کامیاب شخص ہوں۔ میں نے جو چاہا وہ حاصل کر لیا۔ اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں بہت خوش قسمت ہوں تو شاید کچھ غلط نہیں کہتے۔ میں صفوان حیدر، حیدر شاہ کا اکھوتا لاڈلا بیٹا ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک مجھے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی، پھر پتا نہیں کیوں میں اس جملے پر اٹک گیا ہوں اور مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے زندگی پورے من کے ساتھ نہیں گزار لی۔ کہیں تو کچھ کمی بھی، میری زندگی میں جو مجھے ایسا لگ رہا ہے۔

ہاں شاید محبت کی..... ایک مطمئن پرسکون زندگی۔ لیکن اس مطمئن، پرسکون زندگی میں محبت تو کہیں بھی نہیں تھی۔ تو کیا میں نے شادی شدہ زندگی کے یہ اٹھارہ سال بغیر محبت کے گزار دیے۔

کیا میں ان اٹھارہ سالوں میں زرفشاں سے محبت نہیں کر سکا اور یہ اٹھارہ سال جیت کے نشے میں گزار دیے۔ زرفشاں کو ہرا دینے، اسے جیت لینے کی خوشی میں محبت تو کہیں بھی نہیں تھی۔

محبت تو میں نے صرف کوئل رضا سے کی تھی۔ نیلی آنکھوں والی بے حد خوب صورت، اپنے نام کی طرح ہی نرم و نازک کوئل رضا جسے پہلی بار دیکھتے ہی میں اپنا دل اس کے قدموں میں ہار بیٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ بابا کے بہت گہرے دوست سید رضا گیلانی کی بیٹی تھی۔ کرئل رضا نے ریٹائرمنٹ کے بعد



ہمارے قریب اسی کالونی میں گھر لیا تھا۔ مختصر سی فیملی تھی، ایک بیٹا ایک بیٹی۔ بیٹا ہائر ایجوکیشن کے لیے امریکا گیا ہوا تھا۔

بابائے ان کے یہاں شفٹ ہوتے ہی ان کی دعوت کی تھی اور پہلی بار میں نے کوئل کو تب ہی دیکھا تھا۔ کوئل نے میری ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا اور مجھ سے ایک سال جونیئر تھی۔ وہ ایسی تھی کہ اس سے محبت کی جاتی۔ یونیورسٹی میں کئی ہاتھ اس کی طرف پڑے تھے لیکن اس نے بھی اپنا دل میرے سامنے ہی بارا تھا۔ میں بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔ اللہ نے مجھے جی بھر کر نوازا تھا۔ مردانہ وجاہت تو مجھ پر ختم تھی۔ میرا دوست علی بہمن پرنٹسٹ کل کہتا تھا۔ ہمارا بہت سا وقت اکٹھا ہی گزرتا تھا۔

کیا حسین دل تھے وہ
کیا وقت تھا

جب وہ پہرے میرے پاس رہا کرتا تھا میں اسے پیار سے باتوں ہی کہا کرتا تھا اس کی آواز پہ میں ہر روز جینا کرتا تھا جانے کیوں چھوڑ گیا وہ مجھے دھت غم میں لیکن اس نے کہاں مجھے چھوڑا تھا۔ یہ تو میں تھا جس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ ہاں میں نے خود اپنی محبت سے منہ موڑ لیا تھا۔ حالانکہ ہماری راہ میں تو کوئی ظالم سماج بھی نہیں تھا۔ میں نے بابا کو اپنی پسند پنادی تھی، نہ انہیں اعتراض تھا، نہ ماما کو اور یقیناً کوئل کے مام ڈیڈ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ پھر بھی.....

پھر بھی میں نے اس سے منہ موڑ لیا۔ میں صفوان حیدر، سدا کا خود پسند اور نا پسند۔

میں نے کوئل رضا کے بجائے زرفشاں عباس سے شادی کر لی۔ زرفشاں جو میری محبت نہیں تھی لیکن پھر بھی اسے حاصل کرنے کے لیے میں نے سر دھڑکی بازی لگادی اور اپنی تمام توانائیاں اسے حاصل کرنے میں لگادیں اور آخر اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اپنی کامیابی پر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن میں خوش نہیں یا مجھے اس طرح کہنا چاہیے کہ میں اس طرح

خوش نہیں ہوا جس طرح کوئی اپنی مطلوبہ چیز پا کر خوش ہوتا ہے۔

آخر میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے ہر وہ کوشش کی تھی جو میں کر سکتا تھا۔ جائز ناجائز ہر کوشش، لیکن وہ کوئی چیز تو نہیں تھی۔ وہ تو ایک جینی جاتی انسان تھی، جس کے سینے میں ایک دل دھڑکتا تھا۔ جذبوں اور خواہشات سے پر، ہادی عبد الرحمن کی محبت میں دھڑکتا دل۔ میری قربانی تھی جس دل سے ہادی عبد الرحمن کی محبت نہیں نکال سکتی تھی۔ میں نے اسے ایک بے جان ٹکڑا سمجھا تھا۔ جس طرح میں بازار سے کوئی پسندیدہ چیز ہنگے داموں بھی خرید لیتا تھا، اسی طرح میں نے اسے بھی اپنی محبت کی قیمت دے کر اپنے گھر بلکہ اپنے کمرے میں بچالیا تھا لیکن کبھی اپنے دل میں نہ چار کا۔

دل میں تو ہمیشہ کوئل رضا دھڑاتا رہا، مسکراتی رہی، چڑھتی رہی۔ ہاں ہمیں اپنے دل سے نکالو تو جانیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی میرے دل سے نکل ہی نہیں سکتی۔

زرفشاں ٹھیک کہتی ہے کہ سچی محبت تو دل میں اتر جاتی ہے۔ رگ رگ میں سما جاتی ہے۔ روتھ میں کھب جاتی ہے۔ لاکھ نکالو نہیں نکلتی، تو میں بھی زرفشاں سے محبت نہیں کر سکا اور نہ ہی زرفشاں کے دل میں کبھی جگہ بنا سکا۔ وہاں تو پہلے ہی ہادی عبد الرحمن کا قبضہ تھا کہ میں زرفشاں عباس کی نظروں میں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے ایک دھوکے باز اور فریبی کے جس نے اپنی اتالی خاطر چار دل برباد کیے تھے۔

میں جو سمجھتا تھا کہ میں نے اس پر احسان کر کے اسے خرید لیا ہے۔ اسے خود سے محبت کرنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن میں نے اٹھارہ سال ایک غلط فہمی بلکہ خوش فہمی میں گزار دیے۔ کہ وہ جو ہر وقت میرے سامنے لگا ہیں جھکائے رکھتی ہے۔ اس لیے کہ احسان مندی اور محبت کے بوجھ سے یہ نظریں جھکی رہتی ہیں۔ اس نے بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہی نہیں۔ ان اٹھارہ سالوں میں ایک بار بھی نہیں۔

وہ جب میرے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی ہوتی تو میری گردن فخر سے اٹھ جاتی اور جیت کی خوشی میرے اندر دھمال ڈال دیتی اور اس شور میں کبھی میں نے اس کے جذبات سے عاری سیٹ چہرے پر غور ہی نہیں کیا۔ میں نے تو یہ اٹھارہ سال اپنی رنج کے دغم میں گزار دیے اور محبت میرے اندر بین کر لی رہی لیکن میری اتالی نے میری سماعتوں تک یہ بین چنچنے ہی نہ دیے اور اس نے ان اٹھارہ سالوں میں ایک بار بھی نظریں اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ ورنہ میں دیکھ پاتا کہ ان نظروں میں میرے لیے احسان مندی اور محبت کا جذبہ نہیں ہے بلکہ ترس ہے، تاسف ہے، ہمدردی ہے اور شاید کبھی بھی میرے لیے تسخر بھی ہوتا ہوگا لیکن میں کبھی جان ہی نہ پایا اور کیسے جان پاتا اس نے بھی مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

لیکن آج میں نے اس کی آنکھوں میں یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ تاسف، ہمدردی، ترس، تسخر..... ہاں سب کچھ۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ میرے لیے چائے لے کر آئی تھی تو میں نے اپنے سامنے پڑی کتاب کو دیکھا تھا۔

یہ لکھنے والے بھی پتا نہیں کیا کیا کچھ لکھ دیتے ہیں کہ جہاں روح و دل اور جسم کا تنظیم نہ ہو۔ وہاں زندگی پورے من کے ساتھ نہیں گزرتی۔ زندگی پورے من کے ساتھ گزارنا چاہیے۔

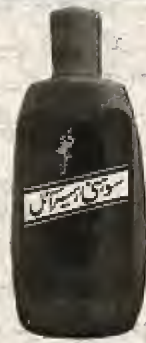
پتا نہیں یہ جملہ کیوں میرے ذہن کے میں چپک کر رہ گیا تھا اور میں اس سے بے اختیار پوچھ بیٹھا تھا کہ.....

”کیا اس نے زندگی پورے من کے ساتھ گزار دی ہے۔“ اور میرے سوال کے جواب میں اس نے اٹھارہ سال میں پہلی بار میری طرف نظریں اٹھائی تھیں اور میری نظروں میں جھانکتے ہوئے جو انکشاف کیا تھا اس نے مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں بھر پوری مٹی کا ڈھیر ہوں، جیسے یک دم کوئی اٹھارہ منزلہ پلازہ گر گیا ہو اور میں اس

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL



- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آواز ہے۔
- بالوں کو شاد اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت - 1500/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ کوئی قدرتی شے یا تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کرنا ہی میں ڈیڑھ یا دو سکا ہے، ایک ڈال کی قیمت صرف 950/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لیے ڈیڑھ کڑی جڑی بوٹیوں سے ملوانے والے کسی آؤ اس حساب سے سمجھائیں۔

- 2 بوتلوں کے لیے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لیے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لیے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز پور، ایکٹ، پیکٹ، قلعہ قمر، ایم اے جٹان روڈ، کراچی
دستی شہر بدین والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں۔
بیوٹی بکس، 53- اورنگز پور، ایکٹ، پیکٹ، قلعہ قمر، ایم اے جٹان روڈ، کراچی
پیکٹ، قلعہ قمر، ایم اے جٹان روڈ، کراچی۔ 37- اورنگز پور، ایکٹ، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

کے لمبے کے نیچے دب گیا ہوں۔ اس کی وہ فاتحانہ مسکراہٹ میری آنکھوں سے جیسے چپک کر رہ گئی ہے۔ ہاں! جب اس نے اپنی بات مکمل کر کے میری طرف دیکھا تھا تو اس کے لبوں پر ایسی ہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جیسے رنگ میں کوئی باکسر اپنے حریف کو شکست دینے کے بعد مسکرا کر دیکھے۔ اس نے بھی تو ایسے ہی دیکھا تھا مجھے۔

میری بیوی زرفشاں نے..... اور میں نے زرفشاں کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا حالانکہ میں نے اس سے بھی محبت نہیں کی۔ میں اس سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے بچپن سے ہی اس سے چڑ اور ضد تھی۔

وہ میرے چچا عباس کی بیٹی تھی۔

☆☆☆

عباس چاچو بابا سے دس سال چھوٹے تھے اور بابا ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ عمر میں اگرچہ صرف دس سال کا فرق تھا لیکن بابا ہمیشہ انہیں عباس بیٹا کہہ کر بلاتے تھے۔ عباس چاچو کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اور بابا نے ان کی پوری حمایت کی تھی۔ حالانکہ دادا جان چاہتے تھے وہ ایم بی اے کر کے بزنس میں ان کا اور بابا جان کا ہاتھ بٹائیں۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر وہ کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ صبح و شام وقت بے وقت مریضوں میں گھرے رہو۔ لیکن پھر بابا جان کے اصرار پر انہوں نے چاچو کو اجازت دے دی اور ہاؤس جاب کرنے کے بعد چاچو نے نوکری کر لی تھی اور ان کی پسند سے ان کی شادی صبا چچی سے ہوئی تھی۔ جو بابا اور ان کی کزن تھیں۔

بابا چاہتے تھے کہ وہ لاہور آجائیں اور اپنا کلینک کھول لیں لیکن چاچو ابھی گورنمنٹ کے اسپتالوں میں نوکری کر کے اپنا تجربہ بڑھاتا چاہتے تھے اور بابا نے ان کی کسی بات سے بھی انکار نہیں کیا تھا۔ سو وہ صبا چچی اور زرفشاں کے ساتھ ملتان میں رہتے تھے جہاں انہیں نوکری ملی تھی۔ لیکن وہ مہینے میں دو تین دن کے لیے ضرور آتے تھے۔

اور وہ تین دن جیسے بابا مجھے بھول ہی جاتے تھے۔ میں جو بابا کا بے حد لڑا تھا، مجھے لگا جیسے میں اگنور ہو رہا ہوں، چاچو کی بیٹی زرفشاں ہر وقت ان کی گود میں ہوتی تھی۔ مجھے لگا تھا وہ جب بھی آتی ہے میری جگہ لے لیتی ہے۔ میں کئی بار سب کی نظریں بچا کر اس کو چنگی کاٹ لیتا۔ وہ روتی تو بابا بے چین ہو جاتے اور میں جل کر راکھ ہو جاتا اور دل ہی دل میں دعا کہیں مانگتا رہتا کہ اگلے ماہ چاچو کو پھٹی نہ ملے۔ یہ نہیں تھا کہ چاچو کے آنے پر بابا مجھے بالکل اگنور کر دیتے تھے لیکن مجھے لگا تھا کہ چاچو اور وہ میری محبتوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔

لیکن میری دعائیں قبول نہیں ہوئی تھیں۔ زرفشاں اور چاچو ہمیشہ کے لیے گیلیانی ہاؤس میں آ گئی تھیں۔ میں سات سال کا اور زرفشاں چار سال کی تھی، جب عباس چاچو کا انتقال ہو گیا۔ وہ حسب معمول دو تین دن کی چھٹی گزارنے گھر آ رہے تھے کہ ایک ٹرک نے نگر مار دی، چاچو تو وہیں پر انتقال کر گئے تھے۔ صبا چاچو زخمی تھیں البتہ زرفشاں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

اس حادثے نے گیلیانی ہاؤس کو بلا ڈالا تھا۔ بابا تو جیسے ہانگل سے ہو گئے تھے۔ دیواروں سے گھس گھس مارتے، چیمیں مار مار کر روتے اور عباس چاچو کو آوازیں دیتے تھے جب کہ دادا جان اور دادی جان نے بڑے حوصلے سے اس صدمے کو برداشت کیا تھا۔ آہستہ آہستہ بابا بھی سنبھل گئے تھے۔ چاچو بھی ہسپتال سے گھر آ گئی تھیں لیکن زرفشاں کو ماما ہی سنبھالتی تھیں بلکہ وہ رات کو بھی ماما کے پاس ہی سوتی تھی۔ اس نے اس بار میرے بابا پر ہی نہیں ماما پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور میں جل جل کر کباب ہوا جاتا تھا۔ بابا کو تو جیسے زرفشاں کے سوا اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

زرفشاں چاچو سے بہت مشابہت رکھتی تھی ویسی ہی گھور سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، ویسی ہی اونچی کھڑی ناک اور ہونٹوں کے خم بھی بالکل چاچو جیسے

تھے تو چاچو کے دیوانے بابا اس کے بھی دیوانے تھے۔ آٹس سے آنے کے بعد وہ ذرا سی دیر نظر نہ آتی تو وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ خود بخود وہ بڑے بابا سے صرف بابا ہو گئے تھے۔ جب وہ انہیں بابا کہتی تو میرے سینے میں آگ سی جل اٹھتی تھی۔ میں سوچتا تھا، وہ صرف میرے بابا ہیں اور اس کو کوئی حق نہیں کہ وہ میرے بابا کو بابا کہے لیکن میرے سوچنے اور کڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ انہیں بابا ہی کہتی رہی اور ماما بابا دونوں کی محبتوں میں میری حصہ دار بن گئی تھی کہ جسمانی طور پر تو صبا چاچو ٹھیک ہو گئی تھیں لیکن ذہنی طور پر ٹھیک ہونے میں انہیں وقت لگا تھا اور زرفشاں کی ساری ذمہ داری ماما نے ہی اٹھا رکھی تھی۔ وادی تو خود بیمار رہتی تھیں۔ اسے کیا سنبھالیں، کچھ وقت گزرا چاچو ٹھیک ہو گئیں تو زرفشاں کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ اس روز میں بہت خوش ہوا تھا اور ضد کر کے ماما کے پاس ہی سویا تھا۔ پھر صبا چاچو کے والدین عدت کے بعد انہیں لینے آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صبا چاچو کی کہن اور شادی کر دیں۔ صبا چاچو جوان تھیں، خوب صورت تھیں اور یہ ان کا حق تھا۔ دادا دادی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

”زری تو آپ فکر نہ کریں، وہ ہمارے پاس رہے گی۔ اچھا رشتہ ملے تو ضرور شادی کر دیں بلکہ میں خود اپنی بیٹی کو رخصت کر دوں گی۔“

وہ وادی کی پھانسی تھیں تو وادی کو ان سے بیٹیوں کی طرح ہی محبت تھی لیکن صبا چاچو نے انکار کر دیا تھا اور گیلیانی ہاؤس میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سب نے ہی سمجھا لیا تھا لیکن ان کا فیصلہ اٹل تھا۔

ایوں زرفشاں ہمیشہ کے لیے گیلیانی ہاؤس میں رہ گئی تھی اسے اس گھر سے نکال نہیں سکتا تھا کہ یہ گھر اس کا بھی انتہائی تھا جتنا میرا۔ سو میں اپنے دل کی بھڑاس اسے تنگ کر کے نکالتا تھا حالانکہ میں اب سوچتا ہوں کہ وہ بہت بے ضرر تھی، ملنسار اور خاموش تھی۔ میں جتنا بھی تنگ کرتا کسی سے میری شکایت نہ

کرتی۔ پھر بابا نے اسے میرے اسکول میں ہی داخل کر دیا تھا حالانکہ میں نے بہت احتجاج کیا تھا اور ماما سے بار بار کہا تھا کہ زرو کسی اور اسکول میں داخل کروائیں لیکن ماما نے میری بات پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا تھا یوں اب میں اسے اسکول میں بھی تنگ کرتا تھا۔ کبھی جب وہ اپنی کلاں میں نہ ہوتی تو اس کا لٹچ باکس نکال کر پھینک دیتا، کبھی کاپیاں بھاڑ دیتا، کتنا میں گندی کر دیتا لیکن اس نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کبھی پوچھا تنگ نہیں کہ میں اس طرح کیوں کرتا ہوں۔ بس بابا سے کہہ کر نئی کاپیاں اور کتابیں منگوائیں۔

میں جانتا تھا کہ اسے پتا ہے کہ یہ سب کچھ میں کرتا ہوں۔ مگر میں کبھی میرا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ اس کے پسندیدہ کھلونے توڑ دیتا، اسے دھکا دے دیتا۔ ایک بار میں نے اسے جھولے سے بھی گرا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ تنگ آ کر چاچو کے ساتھ اس گھر سے چلی جائے، اپنے نانا کے گھر یا کہیں بھی۔ لیکن وہ گیلیانی ہاؤس میں ہی رہی۔

بابا اس کے ایک آنسو پر تڑپ اٹھتے تھے۔ ایک بار میں نے اس کی ایک خوب صورت گڑیا کے بال کاٹ دیے اور بازو توڑ دیا، چہرے پر مار کر سے لکیریں ڈال دیں تو پچھلی بار میں نے اسے کسی چیز کے ٹوٹنے پر روتے دیکھا تھا۔ تب وہ چھ سال کی تھی اور میں نو سال کا۔ بابا نے اسی وقت گھر میں قدم رکھا تھا اسے روتے دیکھ کر اپنی قدموں واپس پلٹ گئے تھے اور جب وہ دو تین گھنٹوں بعد واپس آئے تو ان کے پاس بالکل ویسی ہی گڑیا تھی۔ نہ جانے کتنی مارکیٹوں کی خاک چھان کر انہیں بالکل ویسی ہی گڑیا ملی تھی۔ انہوں نے زرفشاں کو گود میں بٹھالیا تھا حالانکہ اس وقت تک وہ چپ ہو چکی تھی۔ چاچو نے اسے بہلایا تھا لیکن بابا نے اسے بے تحاشا پیار کیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اور اس کی پیشانی پر۔

”میرے بچے تم پھر اس طرح کبھی نہ رو نا۔ تمہارے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔“

بابا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”آپ کیوں روتے ہیں بابا؟“ وہ اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھنے لگی۔

”میں اس لیے تو نہیں روتی تھی کہ میری گڑیا کسی نے توڑ دی۔ میرے پاس تو اور بھی بہت ساری ہیں۔ ماما کی، ماموں کی، نانا اور آپ کی دلائی ہوئی۔ میں تو اس لیے روتی تھی کہ وہ گڑیا مجھے چھوٹے بابا نے دلائی تھی۔ میرے بابا لائے تھے نانا سے میرے لیے اور میں اسے ہمیشہ ایسے ہی اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ کوئی میرے سارے کھلونے، ساری گڑیا خراب کر دیتا پر بابا والی گڑیا کو کچھ نہ کہتا۔“

وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ ٹوٹی ہوئی خراب گڑیا اب بھی اس نے اٹھا رکھی تھی۔

”میری جان!“ بابا بھی جیسے تڑپ اٹھے تھے۔

”کس نے..... کس نے خراب کی یہ گڑیا..... صبا پر عباس خرید کر لایا تھا میری بچی کے لیے۔ چاہیں کس شوق سے، کس چاہ سے خریدی ہوئی اس نے۔ میری بچی کے لیے، میری زر کے لیے یہ کتنی قیمتی، کتنی عزیز بچی اور..... بتاؤ کس نے.....“

صبا چاچی اور زرفشاں دونوں ہی جانتی تھیں کہ میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن زرفشاں خاموش رہی۔ صبا چاچی نے زری سے کہا تھا۔

”چھوڑیں بھائی جان! اب جس نے بھی خراب کی۔ انسان مر جاتے ہیں یہ تو معمولی سی گڑیا ہے۔“

”لیکن زر کے لیے یہ معمولی نہیں تھی صبا! آخر گھر میں کون ایسا ہے؟“

ان کی نظریں میری طرف اٹھی تھیں۔ میں نے فوراً نظریں جھکا لی تھیں پھر ہمارے خانہ ماں، چاچا کی بیٹی صفوی طرف گئی تھیں جو شاید زرفشاں سے کھیلنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

”تم نے؟“

انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ فوراً ہی بول اٹھی تھی۔

”میں نے نہیں صاحب جی! صفوان بھیا نے..... یہ بی زر کی چیزیں اور کھلونے خراب کرتے ہیں۔“

اور میرا جی چاہا تھا کہ کچھ کر اسے تھپڑ لگا دوں لیکن اس سے پہلے ہی بابا نے زرفشاں کو گود سے اتار کر میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا تھا اور اس سے پہلے کہ ان کا ہاتھ مجھ پر اٹھتا، چاچی نے یک دم مجھے ایک ہاتھ سے پچھے کیا تھا۔

”کیا کرتے ہیں بھائی صاحب! بچہ ہی ہے نا۔“

وہ بے حد غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے اور نو سالہ زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے بہت بری طرح ڈانٹا تھا۔ لیکن پھر اسی رات انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر پیار بھی کیا تھا اور بہت دیر تک مجھے سمجھاتے رہے تھے۔

”زر میری چھوٹی بہن ہے اور مجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے، نہ کہ تنگ کرنا چاہیے اور یہ کہ اگر آج کے بعد میں نے اسے تنگ کیا اس کی کسی چیز کو خراب کیا تو وہ زندگی بھر مجھ سے بات نہیں کریں گے اور نہ میری شکل دیکھیں گے۔“

اور میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ بابا میری شکل نہ دیکھیں، مجھ سے بات نہ کریں۔ اس لیے اس روز کے بعد میں نے بھی اس کا کوئی کھلونا خراب نہیں کیا، نہ ہی بھی اسے تنگ کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ میرے دل میں موجود اس کے لیے ملن ختم ہو گئی تھی بلکہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو میں اس کے کھلونے توڑ پھوڑ کر اس کو تنگ کر کے، تکلیف پہنچا کر دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا لیکن اب اندر ہی اندر کھٹنا، چلا رہتا اور دھواں اندر ہی اندر اٹھ کر میرے دل کو سیاہ کر رہا تھا۔ اب میں اس سے بات نہیں کرتا تھا، اس کے ساتھ کھیلتا بھی نہیں تھا حالانکہ کی بار اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے ہمیشہ ہی اسے ڈانٹا تھا۔

☆☆☆

بچپن گزرا۔ لڑکپن بھی گزر گیا۔ لیکن میرے دل میں اس کے لیے جو ملن تھی، وہ کبھی ختم نہ ہوئی۔ بابا ہی نہیں ماما بھی اس پر فدا ہوتی رہتی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی تھی یا ماما بابا مجھے اگتور کر رہے تھے لیکن مجھے اپنی محبتوں میں اس کی شراکت گوارا نہ تھی لیکن میرے جلنے اور کڑھنے سے کچھ نہ ہوا، وہ اسی طرح سب کی لاڈلی بیٹی رہی۔

حتیٰ کہ میرے خیال میں بھی اسے بہت پروتھو کر دیا جاتا تھا۔ وہ ذہین تھی، ہمیشہ اپنی کلاس میں پوزیشن لیتی۔ گندی رنگ، مناسب نقوش اور قد و قامت، بڑی بڑی گھور سیاہ آنکھوں والی وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔

اس میں بلا کا اعتماد تھا۔ سب ہی اسے پسند کرتے تھے اور وہ سب کے لیے بہت نرم خور خوش اخلاق تھی لیکن مجھے تو وہ گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔

ماما کی تو وہ پسندیدہ تھی۔ وہ اکثر میرے سامنے اس کے سلیٹے اور ذہانت کی تعریف کرتیں۔ اس کی کوکب کو سر پر اٹھیں۔ اسے ساتھ اس کی محبت کا ذکر کرتیں۔ کبھی کبھی یہ بھی تمہ دیتیں کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ زرفشاں ہمیشہ ان کے پاس رہے۔ میں ان کا مطلب سمجھتا تھا لیکن نظر انداز کر دیتا تھا کیونکہ میں کوئل سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نے بابا کو بھی بتا دیا تھا کہ کوئل رضا کو پسند کرتا ہوں۔ اگرچہ اس سے محبت کرنے کے باوجود میں نے بھی کوئل سے یہ نہیں کہا تھا کہ کیا ان کی لویو اور نہ ہی بھی کوئل نے اس طرح کی بات کی تھی لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔

میں نے سوچا تھا اچانک رشتہ بھیج کر سر پرانز دوں گا لیکن اس سے پہلے ہی زرفشاں نے میری اتار پر پاؤں رکھ دیا۔ میں ماما کی تلاش میں صبا بچی کے پورٹن کی طرف گیا تھا لیکن پھر اپنا نام سن کر بالکل غیر ارادی طور پر ان کے لاڈلے کے باہر ہی رک گیا تھا۔

”کون صفوان؟“

بہ زرفشاں کی آواز تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی! صفوان کے ساتھ شادی..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تمہاری تائی جان کی خواہش بھی زرا تمہاری تائی جان اور بابا بہت محبت کرتے ہیں تم سے۔ ہمیشہ تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔“ شاید ماما نے ایسی کوئی بات کی ہو چاچی سے ورنہ بابا تو جانتے ہی تھے کہ میں کوئل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

”آپ کی بات تو ٹھیک ہے امی! لیکن صفوان مجھے پسند نہیں ہے امی..... میں.....“

وہ ذرا سا جھجکی بھی شاید۔

”میں ہادی کو پسند کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔“

اس نے اپنے ماموں کے بیٹے کا نام لیا تھا۔ ”لیکن اگر بابا جان اور آپ کو ہادی پسند نہیں ہے تو جہاں بھی میری شادی کر دیں، میں بابا جان کی بات سے انکار نہیں کروں گی لیکن صفوان سے تو مر کر بھی شادی نہیں کروں گی۔ زہر لگتا ہے وہ مجھے سخت نا پسند کرتی ہوں میں اسے۔“

میں وہاں سے واپس پلٹ آیا۔

میرا خون کھول اٹھا۔ یہ وہ لڑکی کہہ رہی تھی جسے میں نے ساری زندگی ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی جو میری نظروں میں کچھ بھی نہیں تھی۔ عام سی شکل و صورت کی عام سی لڑکی سوائے ذہانت کے اس میں تھا ہی کیا۔ لیکن اس عام سی لڑکی نے مجھے..... صفوان حیدر کو نا پسند کیا تھا۔

وہ مجھ سے شادی سے انکار کر رہی تھی۔ میری انا پر سخت چوٹ پڑی تھی۔ میں اسے زیر کرنا چاہتا تھا، اس مقام پر لانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے منہ سے میری محبت کا اعتراف کرے۔ وہ میری محبت میں اتنی شدت سے مبتلا ہو جائے کہ میرے بغیر جی نہ سکے۔ وہ میرے سامنے روئے، گڑگڑائے اور مجھ سے التجا کرے کہ میں اسے اپنی زندگی میں شامل کر لوں اور

اسے اپنی رفاقت بخش دوں اور پھر میں اسے ٹھکرا کر اس کی بے بسی کا تماشا دیکھوں۔ اس سے کہوں میں تو کوئل رضا سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے اپنی ذات پر عجیب سا زعم تھا کہ میرا ذرا سا التفات اسے میرے سامنے جھکا دے گا۔

میں ساری رات یہی سوچتا ہوا سوپا تھا۔ مجھے اسے اپنے سامنے جھکا تھا۔ اگر میں اپنا تجزیہ کرتا تو شاید وہ اپنے رویے میں حق بجانب بھی کہ میں نے کبھی اس کے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھا تھا لیکن میں نے اپنے رویے کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔ میری تو رنجی اتنا گرا گرا کر تھی اس سے بدلہ لینے پر اس کا ساری بھی اور صبح جب میں اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تو وہ اپنے پورشن سے نکل کر گیت کی طرف جانی دکھائی دی تھی۔ مجھے کل رات خود سے کیا ہوا عہد یاد آیا تھا۔

”ہیلو ڈیر کزن! کدھر کے ارادے ہیں؟“ اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا تھا۔

”یونیورسٹی جا رہی ہوں۔“

”کیسے جاؤ گی؟“

میں ایک قدم بڑھا کر اس کے ہم قدم ہوا تھا۔

”جیسے روز جاتی ہوں۔“

میں نے فوراً ہی نمبر ملایا تھا، وہ سخت خفا تھی۔

”ممت بات کر دو مجھ سے صفی!“

”سوری یارا میں نے رات کو فون ساکنٹ پر کر کے دراز میں رکھ دیا تھا کیونکہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی، جلدی ہو گیا تھا۔“

اور وہ فوراً مان گئی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی معصوم سی، کچھ دیر باتیں کر کے میں نے فون بند کر دیا اور آئندہ کے متعلق پلاننگ کرنے لگا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ مجھے اسے اپنے آگے جھکے ہوئے دیکھنا تھا۔ وہ مجھے معقول سمجھتی تھی۔

”لیکھت کر رہی تھی۔ میں اسے چونکا نہیں چاہتا تھا، اس لیے مجھے بہت ہولے ہوئے لمبر کے ساتھ اس پر مہربان ہونا تھا۔“

☆ ☆ ☆

اگلے چند دن یونیورسٹی جاتے ہوئے ہمارے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ بھی بھی اس پر ایک گہری نظر ڈال لیتا تھا۔ ایک روز میں اسے آکس کریم کھلانے لے گیا۔ مجھے پتا تھا اسے آکس کریم بہت پسند ہے۔ چھٹی کا دن تھا، وہ میری آفر پر حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی تھی۔

”اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔ میں آکس کریم کھانے جا رہا تھا، بابا نے کہا کہ میں بھی اس جگہ کی آکس کریم بہت پسند ہے، تمہیں بھی کھلا دوں۔“

میرا خیال تھا کہ شاید وہ میرے ساتھ نہ جائے آخر اس سے پہلے تو ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بابا کا نام لیا تھا لیکن اس نے پھر بھی انکار کر دیا تھا۔

”میرا اس وقت موڈ نہیں ہے، یوں بھی اس وقت میرا پسندیدہ پروگرام چل رہا ہے۔“

”چلی جاؤ ذرا آؤ تنگ ہو جائے گی تمہاری بھی۔ کبھی گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں ہو۔“

صبا جا چکی تھی اور میں دیکھ کر گاڑی نکال کر لے گیا تھا۔

آفس جا کر میں نے فون میز پر رکھا تو دیکھا کہ کوئل کی بے شمار کال آئی ہوئی تھیں اور اتنے ہی سچ

یہ بیٹھ گئی اور اپنا شولڈر بیگ اپنی گود میں رکھ لیا۔

”بڑھائی کیسی جا رہی ہے تمہاری؟“

میں نے گاڑی گیت سے باہر نکالتے ہوئے ذرا سا رخ اس کی طرف موڑ کر پوچھا تھا۔

”ٹھیک ہی جا رہی ہے۔“

وہ بے حد سنجیدہ سی بیٹھی تھی۔ مجھے دل ہی دل میں اس کی سنجیدگی پر ہی آبی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ آج کے لیے انتہائی کافی ہے۔ کہیں مختصر مہارے حیرت کے کوچ ہی نہ کر جائیں اور پھر یونیورسٹی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوتی تھی البتہ جب وہ گاڑی سے اترتی تو میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

”اوکے زرا دیسے میں تقریباً روز اسی راستے سے آفس جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی ڈراپ کر دیا کروں گا۔ واپسی پر ڈرائیور تک کر لے گا۔“

اس کی آنکھوں میں واضح حیرت نظر آئی تھی۔

زرا سے صرف بابا اور بھی کبھا چچی کہہ کر بلاتی تھیں۔ لیکن اس راستے سے تو آپ کا آفس خاصا دور پڑتا ہے۔“

اس کی ذہانت پر مجھے کوئی شبہ نہ تھا۔

”ہاں دور پڑتا ہے لیکن مجھے اسی راستے سے ایک دوست کو پک کرنا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی گاڑی فروخت کر دی ہے، نئی لیٹی ہے اسے۔“ مجھے فوراً ہی بہانا سوچنا تھا۔

”بابا نے کہا ہو گا۔“

اس نے اندازہ لگایا تھا۔

”نہیں، البتہ بابا نے یہ ضرور بتایا تھا کہ تمہیں بتا دوں ڈرائیور چھٹی پر ہے تو وہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔“

”جھٹکس۔“

وہ مسکرائی تھی اور میں دیکھ کر گاڑی نکال کر لے گیا تھا۔

آفس جا کر میں نے فون میز پر رکھا تو دیکھا کہ کوئل کی بے شمار کال آئی ہوئی تھیں اور اتنے ہی سچ

باتیں کی تھیں اور ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار گر گئی تھی۔ میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا پھر شروع شروع میں وہ میرے التفات پر حیران ہوئی تھی لیکن پھر اس نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ خود بھی اپنی یونیورسٹی کی باتیں کرنے لگی تھی۔ وہ سائیکالوجی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ میں ہر روز ایک لمبے راستے سے آکس جاتا تھا۔ چھ ماہ بعد ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

”کیا آپ کی دوست نے ابھی تک گاڑی نہیں لی۔“

”نہیں، لے لی ہے لیکن اب اچھا نہیں لگتا کہ میرے گھر میں ہوتے ہوئے تم ڈرائیور کے ساتھ جاؤ۔“

میں نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں اب بھی کبھی اس کی تعریف بھی کر دیتا تھا، کبھی اس کی ذہانت کی، کبھی اس کے لمبے بالوں کی۔ خوب صورت قد و قامت کی اور اس کی محو رسیہ آنکھوں کی جو بالکل چاچو جیسی تھیں لیکن وہ عام لڑکیوں کی طرح شرابی نہیں تھی بلکہ میری تعریف کو اپنا حق سمجھ کر قبول کر لیتی تھی جبکہ کوئل تو میری ذرا سی تعریف پر گلابی ہو جاتی تھی اور میں مبہوت سا اس کے رخساروں پر ٹھہرتے گلاب کو دیکھتا رہ جاتا تھا۔

فاخر میرا دوست جو میری اور کوئل کی محبت سے واقف تھا، اکثر کہتا تھا تمہارا پگل بہت شان دار ہو گا، پرفیکٹ جوڑی۔ وہ جیسے بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں نا چاند سورج کی جوڑی تو یہ مثال تم پر فٹ آتی ہے۔ تم دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہو۔

”ہاں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا مٹی! بس تمہارے فائل کے فوراً بعد بابا کو تمہارے گھر بھجوا دوں گا۔“

اور اس کے رخساروں پر شفق ٹار ہوئے لگتی تھی، گھنیری پلکیں جھک جاتی تھیں۔

”نہیں، فوراً بعد نہیں۔ ایک سال تو مجھے خوب گھومنا پھرنا ہے۔ پہلے تو ہم بھائی کے پاس امریکہ جائیں گے، پھر لندن، خالدہ جانی کے پاس۔ امی کب سے میری بڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔“
”اوکے۔“
مجھے اس کی مرضی کے خلاف کب کوئی بات گوارا تھی۔

☆☆☆

لیکن سال تو کیا دو سال ہونے والے تھے اسے فارغ ہوئے۔ وہ لوگ گھوم پھر کر واپس آ گئے تھے لیکن پتا نہیں کیوں پہلے تو میں آفس کے ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں بے حد مصروف ہو گیا تھا اور پھر اب یہ ایک نیا پروجیکٹ شروع ہو گیا تھا، جس کا نام تھا زرفشاں۔ اب اس سے فارغ ہو کر ہی کوئل کو پروڈکٹ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اس سے بہت ٹھوس پہانا کیا تھا اور وہ معصوم سی کوئل رضا میری بات مان بھی گئی تھی۔ اگر تاخیر نہ ہوتی تو میں کوئل رضا کے امریکہ سے واپس آنے کے فوراً بعد ہی اپنا پروڈکٹ بھجوا دیتا تو شاید اتنی بڑی ہار میرا مقدر نہ ہوتی۔ لیکن وہ جب واپس آئی تو میں اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں آفس کی طرف سے سبکدوش ہو گیا ہوا تھا۔

شاید اوپر آسمانوں میں میری تقدیر کے پتوں پر کچھ اور لکھا جا چکا تھا۔ اسی لیے تاخیر ہوئی تھی۔ آخر مجھے میرے غرور، میری نفرتوں اور حسد کی سزا بھی تو ملنی تھی۔ کوئل رضا میری اولین محبت، میری شدید چاہت تھی۔

پھر زرفشاں کیا تھی میرے لیے جو میں اس کے پیچھے خوار ہو رہا تھا۔ میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ میں تو اسے سرے سے پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ ہوتا ہے نا کبھی کبھی آدمی کو کسی سے بلاوجہ نفرت ہو جاتی ہے۔ ضد ہو جاتی ہے۔ تو مجھے بھی زرفشاں سے بلاوجہ ہی ضد ہو گئی تھی۔ لیکن اسے اس حد تک لانا چاہتا تھا کہ وہ میری محبت میں سرتاپا ڈوب جائے لیکن وہ نہ جانے

کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ میرے ذوقی فحشوں پر مسکرا دیتی بلکہ ایک بار وہ ہنس پڑی تھی۔
”میں تو آپ کو بہت سڑیل اور کھڑوس سمجھتی تھی صفوان! لیکن لگتا ہے کسی کی محبت نے آپ کو بدل ڈالا ہے۔“
تب مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ کوئل کی بات کر رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کا اشارہ اپنی طرف ہے۔

”ہاں یہ تو ہے۔“

میں نے جیسے اسے نظروں میں سموتے ہوئے کہا تھا۔
”حال ہم نشین برسن اثر کرد (دوست کے حسن نے مجھ پر اثر کیا ہے)“
اور وہ ہنس دی تھی۔

”محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے صفوان! وہ پتھر سے پتھر اور سخت سے سخت دل کو بدل دیتی ہے۔ وہ آدمی کو نرم خور اور عاجز اور فیاض بنا دیتی ہے۔“
وہ جس حوالے سے بات کر رہی تھی میں تب نہیں جانتا تھا اور میں نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ میری محبت میں جھلنا نہ ہوئی آخر میں صفوان حیدر کوئی معمولی انسان تو نہ تھا۔ جب میں اس پر اتنا مہربان تھا اس کا اتنا خیال رکھتا تھا تو اسے مجھ سے محبت ہونا ہی تھی۔ میں نے زبان سے کبھی اسے آئی کوئی نہیں کہا تھا لیکن میرا ہر عمل، میرا اسے دیکھنا، اس کی ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جانا۔ اس کا خیال رکھنا، خود دیتا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔

ایک روز میں نے اس سے اپنے ماضی کے رویوں کی معافی بھی مانگ لی تھی اور اعتراف کیا تھا کہ بابا کی اس بے محبت کی وجہ سے میں اس سے جلد تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”ہاں میں سمجھتی ہوں کہ میں تمہاری محبتوں میں جھبہ دار بن گئی تھی تو تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ چڑ ہو گئی تھی تمہیں مجھ سے۔“

میرے اصرار پر وہ مجھے تم کہہ کر بلانے لگی تھی لیکن جو بات میں اسے سمجھانا چاہ رہا تھا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ وہ بات اس نے اب بھی تھی کہ اس کی محبت نے مجھے بدل دیا ہے۔
مجھے خود پر اعتماد تھا، یقین تھا کہ ایک روز وہ میرے سامنے ہار جائے گی۔ بس کچھ دنوں کی بات تھی کہ وہ اس مقام پر آ جاتی کہ اپنی محبتوں کا اعتراف کرتی۔ مجھ سے کہتی کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اور تب میں اسے انکار کر دیتا۔ وہی الفاظ اسے لوٹا دیتا جو چاہی سے اس نے میرے لیے کہے تھے۔ میں اسے بتاتا کہ میں تو کوئل رضا سے محبت کرتا ہوں، اس نے میرے رویے کا غلط مطلب لیا ہے۔ میں تو بطور کزن اس کے ساتھ خلوص سے پیش آتا تھا اور کچھ میرا مقصد اپنے ماضی کے برے رویے کی طمانی بھی تھا۔

بس ایسا ہی کچھ سوچ رکھتا تھا میں نے لیکن ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری ساری محنت رائیگاں چلی گئی تھی۔ میں جو ہر روز صبح طویل راستے طے کر کے اسے یونیورسٹی چھوڑ کر اپنے آفس پہنچتا تھا، اکثر اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے پسندیدہ پروگرام دیکھتا تھا جو مجھے بالکل پسند نہیں تھے۔ اسے کبھی لچ پر، کبھی ڈنر پر، کبھی کافی پلانے لے جاتا تھا تو میری یہ ساری محنت رائیگاں چلی گئی تھی۔

وہ امتحان دے کر فارغ ہو چکی تھی مجھے انتظار تھا کہ گھر میں اس کی شادی کی بات چلے اور وہ..... ہاں وہ کہہ کر وہ میرے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ میں نے ماما سے سنا تھا کہ اس کے ماموں ممانی اس کے رشتے کے لیے ہاتھ کرنے آنے والے ہیں۔ ان دنوں میں اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگا تھا، اسے ذرا سائلو ہوتا تو کئی گھنٹے اس کے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ اس کے منع کرنے کے باوجود ڈاکٹر سے اس کے لیے دوا کی لایا۔ ماما سے سوپ ہوا کر لایا۔ وہ ہنس دیتی تھی۔

”تم بہت بدل گئے ہو صفوان!“

”تم نے ہی تو کہا تھا کہ محبت انسان کو بدل دیتی ہے تو مجھے بھی محبت نے بدل دیا ہے۔“
اور وہ ہنس دی تھی۔

☆☆☆

اس روز بہت دنوں بعد میں کوئل کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر گیا تھا اگلے رضا کی اجازت سے اسے ڈنر پر بھی لے گیا تھا اور میں نے کوئل سے کہا تھا کہ ماما بابا چند دنوں میں ان کے گھر کا قاعدہ میرا پڑ پڑل لے کر آ رہے ہیں۔

اس روز ہم دونوں بہت خوش تھے۔ پہلی بار کوئل نے اس روز اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا۔ میں تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ کوئل کو گھر ڈراپ کر کے میں بہت خوش خوش گھر آیا تھا۔ ماما میرے بیڈ روم میں کھانے کا پوچھنے آئی تھیں۔

”کھانا کھا کے آئے ہو مٹی یا لگو آؤں اور کہاں تھے تم۔ آفس سے آ کر جو عائب ہوئے ہو تو اب آئے ہو۔“

”دوستوں کے ساتھ تھا سوئٹ مام اور ڈنر بھی ان ہی کے ساتھ کیا ہے۔ آپ نے کھالیا۔“

”ہاں، ہم نے تو کھالیا تھا۔ زرفشاں کے ماموں اور ممانی آئے تھے اس کے رشتے کے لیے۔

بادی اچھا لڑکا ہے۔ تمہارے بابا نے پہلے ہی صبا کے کہنے پر تحقیق کر لی تھی۔ سو ہاں کر دی انہوں نے۔ میرا تو بہت جی چاہتا تھا کہ ڈرو کو ہمیشہ کے لیے اپنے گھر میں رکھ لوں لیکن تمہارے بابا نے بتایا کہ تم کہیں اور انٹرمنڈ ہو۔ خیر زرفشاں کا نکاح ہو جائے تو تم ہمیں لے چلو اس لڑکی کے گھر۔“

شاید بابا نے کوئل کا نام نہیں بتایا تھا۔

”اسکے سنڈے کو نکاح ہے زرفشاں اور ہادی کا۔ رخصتی تین چار ماہ بعد ہادی کے بڑے بھائی کے آنے پر ہوگی۔ وہ اپنی پہنچی کی طرف سے چھ ماہ کے لیے جرجی گیا ہوا ہے۔“

ماما تو بتا کر چلی گئیں اور میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور وہ جو میں ایک سال دو ماہ دس دن سے

اس کے گرد پروانے کی طرح چکر مار رہا تھا، وہ سب ضائع چلا گیا تھا۔ رائیگاں ہو گیا تھا۔ میں صفوان حیدر جو ذرا کسی لڑکی سے بڑی سے مسکرا کر بات کر لیتا تھا، وہ ہواؤں میں اڑنے لگتی تھی۔

ذرا سا التفات پر رتا تو جان ہی ہارنے لگتی تھی اور یہ زرفشاں کیا چیز تھی کہ وہ مجھ سے، صفوان حیدر سے ذرا سی بھی متاثر نہیں ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا ابھی اس کے کمرے میں جاؤں اور اس کی غرور سے اٹھی ہوئی گردن کو دو بادوں۔ غصہ، جلن، ہار کا دکھ، حسد نہ جانے وہ کیا جذبہ تھا جس نے مجھ سے وہ کام کروایا جس نے میری محبت مجھ سے چھین لی۔ میری زندگی میں وہ سب کچھ بدل ڈالا جس کی میں پلاننگ کرتا تھا۔ ایک منہنی جذبہ مجھ پر حاوی ہو کر میرا سب کچھ چھین کر لے گیا تھا۔ میرے سارے کول جذبوں کو کھا گیا تھا۔ وہ جذبے جو کول رضا کے لیے میرے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ رات بھر جاگ کر اسے جھکانے کے کئی منصوبے میں نے بنائے اور پھر رد کر دیے۔ آخر کار ایک منصوبے پر میرا دل مطمئن ہو گیا۔ صبح کے وقت مجھے نیند آئی تھی۔ اس لیے دیر سے اٹھا تھا، دن کے گیارہ بج رہے تھے جب تیسری بار ماما مجھے جگانے آئی تھیں۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا صفا آج آفس نہیں جانا تھا کیا۔ تمہارے بابا بھی تمہارے اتنی دیر تک سونے سے پریشان ہو رہے تھے، ابھی آفس جانے کے لیے نکلے ہیں۔“

”طبیعت ٹھیک ہے بس رات دیر سے سویا تھا اس لیے آٹھ بجیں تھکی اور آفس جانے کا بھی موڈ نہیں تھا۔ آپ باشتا گلو اےیں، میں فریش ہو کر کرتا ہوں۔“ ماما کو کلی دے کر میں واش روم میں گھس گیا اور جب میں ناشتا کر کے ٹی وی لاؤنچ میں بیٹھا ہوں ہی بے مقصد مختلف چینل آگے پیچھے کر رہا تھا تو وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر چاچی کے ساتھ لاؤنچ میں آئی تھی۔

”تم آج آفس نہیں گئے۔ اٹھے بھی دیر سے

ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔“ اس کی یہ نگر بندی مجھے زہر لگ رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ میں نے بمشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف دیکھا۔ نیوٹک دیتے میک اپ میں وہ معمول سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ گالوں پر گلاب کھل رہے تھے یقیناً وہ بہت خوش تھی۔

”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

”زیر فرینڈ کی شادی ہے، دن کی بارات ہے اور ہی جا رہے ہیں۔“ چاچی جواب دے کر لاؤنچ سے باہر نکل گئیں، تو میں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

”مارا کہ ہو بہت۔“ ”جھینک پو۔“ اس کے رخساروں پر جیسے شفق گہری ہوئی تھی۔

”اب تم کب خوش خبری سنارہے ہو۔“ ”بہت جلد۔“ ”زیادہ دیر مت کرنا۔“ وہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی کہ چاچی نے اسے آواز دے کر بتایا تھا کہ بھائی جان نے گاڑی بھجوا دی ہے۔

میں کچھ دیر یوں ہی ٹی وی دیکھتا رہا۔ پھر باہر نکل کر دیکھا ماما شاید اپنے کمرے میں تھیں۔ مجھے زرفشاں کے کمرے میں جانا تھا۔ رات کو میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے لیے مجھے زرفشاں کی پنڈرائٹنگ کی ضرورت تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھتا رہا ان کے پورشن میں آیا۔ مجھے پتا تھا کہ بیڈروم کی چائیاں کہاں لگی ہوئی ہیں لیکن مجھے زرفشاں کے کمرے میں نہیں جانا پڑا، اس کی چند کتابیں اور ایک فائل لاؤنچ میں ہی سینئر ٹیبل پر پڑی تھیں۔ میں نے اس کی نوٹس والی فائل سے ایک صفحہ نکالا اور وہاں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ماما ابھی تک اپنے کمرے میں تھیں۔

☆☆☆

میں بچپن سے ہی دوسروں کی پنڈرائٹنگ کی

نقل کر لیتا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر اور دو تین بار زرفشاں کی پنڈرائٹنگ میں لکھنے کی کوشش کی اور تھوڑی سی کوشش سے ہی میں نے زرفشاں کی تحریر کی ہو، بھول اتار لی تھی۔

اب میں نے کسی نا معلوم شخص کے نام زرفشاں کی طرف سے سات محبت نامے لکھے تھے، جس کے لیے میں نے عام نوٹس والے کاغذ استعمال کیے تھے۔ مخاطب کا نام لکھنے کے بجائے میں نے ڈیر اور پیارے کا لفظ استعمال کیا تھا البتہ آخر میں تمہاری زرفشاں لکھا تھا۔

دو بار ان خطوط کو پڑھنے کے بعد میں نے ایک خاکہ لکھنے میں رکھ کر اپنی الماری میں موجود لاگر میں رکھ دیے تھے اور خود مطمئن ہو کر سو گیا تھا۔ شام کو اٹھا تو ماما نے بتایا کہ زرفشاں کچھ دیر پہلے ہی جنہیں دیکھنے آئی تھی۔ اب کچن میں تمہارے لیے سوپ بنا رہی ہے۔

ہمارا کچن ایک ہی تھا۔ یوں تو کک تھا لیکن اکثر ماما اور چاچی اپنے ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ ضرور بناتی تھیں۔ چاچی یا زرفشاں کو اپنی پسند سے کچھ بنانا ہوتا تو وہ بتا دیتی تھیں۔ ورنہ ماما اپنی مرضی سے پکوا لیتی تھیں۔

”آپ لوگوں نے تو مجھے بیمار ہی بنا ڈالا ماما۔“ میں ہولے سے ہنسا۔

”بس نیند کی کمی سے تھوڑی تھکاوٹ ہو گئی تھی۔“ ”تو پھر آ جاؤ اسٹے مل کر جائے بیٹے ہیں۔“ ماما مجھے باہر آئے کا کہہ کر چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد میں بھی فریش ہو کر آ گیا تھا۔ شام کی چائے پر عمو ہم کم ہی اسٹے ہوتے تھے لیکن آج سب ہی تھے۔ خوش گوشت ماحول میں چائے پی لی گئی۔

بابا نے نکاح کے لیے ایک اچھے ہال کی بکنگ کروائی تھی۔ وہ ماما اور چاچی مہمانوں اور میزبانوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ زرفشاں اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد سب اٹھ گئے تو میں بھی ٹی وی لاؤنچ میں آ کر بیٹھ گیا اور صبح کا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ طبیعت پر عجیب سا اضطراب اور بے زاری طاری تھی۔ نہیں بھی جانے کو دل نہ چاہ رہا تھا حالانکہ پہلے جب کبھی فرصت ملتی تھی تو میں اور میرا دوست فاخر کپن گھومنے نکل جاتے اور آج کل تو فارغ وقت سارا کا سارا کول کے لیے تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اخبار رکھ دیا اور ریوٹ اٹھا لیا تب ہی زرفشاں آ گئی۔

”تمہاری طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بہت بڑ حال لگ رہے ہو۔“ ”نہیں یا ٹھیک ہوں، بس ایسے ہی سستی ہے۔“

میں نے ریوٹ رکھ دیا تھا۔ وہ اتنی سادہ خلص، کیمرنگ اور لوگ تھی۔ میرے گئے بچا کی بیٹی تھی اور یہ میں اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں اس کے ساتھ یہ سب نہ کروں لیکن دوسرے ہی لمحے میرا منی جذبہ مجھ پر غالب آ گیا اور میں نے سوچا مجھے وہی کرنا ہے جو میں نے پلان کیا ہے۔

کچھ دیر وہ بیٹھ کر چلی گئی لیکن جاتے جاتے حلقین کر گئی تھی کہ اگر طبیعت زیادہ خراب محسوس ہو تو ڈاکٹر کے پاس ضرور چلا جاؤں۔

☆☆☆

آج جمعہ تھا اور اگلے اتوار کو اس کا نکاح تھا۔ میں نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا۔ شاپنگ کے لیے صبا چاچی اور اسے ساتھ لیے لیے مارکیٹوں میں پھر رہا تھا کہ نکاح کے جوڑے کی ذمہ داری بھی اس کے ماموں ممانی نے اسی بر ڈال دی تھی کہ اپنی پسند ہے۔ لو۔ ساتھ ساتھ بالکی چھلکی چھینچھڑا بھی ہو جاتی تھی۔ ہادی کے نام پر اس کے گندم رنگ رخسار گلگوں ہو جاتے اور لبوں پر شرابی سی مسکراہٹ بکھ جاتی۔

وہ اس رشتے پر بہت خوش تھی۔ نکاح میں صرف تین دن باقی تھے جب میں نے اس خاکہ لکھنے پر ہادی عبدالرحمن کا نام لکھا اور نام لکھتے ہوئے اس بات

کا دھیان رکھا تھا کہ میری رائٹنگ سے بالکل مختلف ہو۔

اور پھر آفس جاتے ہوئے میں نے یہ لفافہ ہادی کے گھر کے گیٹ کے اندر ڈال دیا تھا اور اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ آس پاس کوئی نہ ہو، اپنی گاڑی میں نے کافی پیچھے کھڑی کی تھی اور پیدل ہی ہادی کے گھر تک گیا تھا۔ اس پوش رہائی کا کوئی میں اس وقت بالکل سنا تھا کہ میں وقت سے کچھ پہلے ہی نکلا تھا۔

بہانا یہ کیا تھا کہ مجھے پہلے فاخر کی طرف جانا ہے اس لیے جلدی نکل رہا ہوں۔

اس روز میں اندر سے بے چین تھا۔ اس لیے آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا۔ صبا چچی مجھے دیکھ کر خوش ہوئی تھیں۔

”اچھا ہوا تم آگے ہو۔ زرد کو ساتھ لے جاؤ، اسے پیچنگ جوتا لینا تھا۔ کل بھی گھوم گھوم کر ملا نہیں، آج جو بھی ملے لے لیتا۔ کل سے اب گھر بیٹھے یہ، ہاں واپسی پر نکاح کا جوڑا بھی اٹھا لیتا، تیار ہو گیا ہوگا۔“

میں اثبات میں سر ہلاتا زرفشاں کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا واپس پلٹ گیا۔

”ارے بیٹا سانس تو لے لو۔ چائے بنواتی ہوں، میرا یہ مطلب نہیں تھا کھڑے کھڑے نکل جاؤ۔“

صبا چچی نے مجھے روکا۔
”نہیں، واپس آ کر چائے پیتے ہیں۔ ایک کام ختم ہو جائے گا۔“

☆☆☆

”کبھی کبھی میں بہت حیران ہوتی ہوں صفوان! تم بہت بدل گئے ہو۔“ ہم جوتا لے کر نکل رہے تھے تو زرفشاں نے اظہار کیا۔ ”ورنہ پہلے تو تم مجھے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ مجھے لگتا تھا تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔“

”نہیں، نفرت تو نہیں کرتا تھا بس چڑتا تھا۔“

میرے بابا ماما کو جو بھیا لیا تھا تم نے۔“ میں مسکرایا۔
”لیکن کوئی لمحہ ایسا آتا ہے زرد! آدمی کی زندگی میں جو آدمی کو بدل دیتا ہے، ایسا ہی ایک لمحہ میری زندگی میں بھی آیا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اللہ نے بہن کی تمہاری صورت میں پوری کی اور میں بلاوجہ ہی ناشکری کر کے تم سے دشمنی پالے ہوئے تھا۔“

”اور پتا ہے مجھے تو تم کبھی برے لگے ہی نہیں تھے صفوان۔“

فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا تھا۔
”میرا کوئی بڑا بھائی نہیں تھا تو میرا جی چاہتا تھا کہ تم سے چھوٹی بہنوں کی طرح فرمائش کروں۔ تم میرے ساتھ کھیلو، تم سے لڑوں، جھگڑوں پھر خود ہی مان جاؤں۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے رخصت کرنے کے لیے اکیلے بابا نہیں ہوں گے، میرے بھائی کا ہاتھ بھی میرے سر پر ہوگا۔“

اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ وہ کتنی سادہ اور معصوم سی تھی اور میں.....

میں نے یہ کیا کر دیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے میرا دل کانپ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میری زخمی انا پھٹکا دے لگی تھی۔
وہ میرے گئے چچا کی بیٹی اور میرے بابا کی بے حد لاڈلی سی اور میں اس کے ساتھ جو کچھ کر چکا تھا اس کے بعد کیا ہونے والا تھا، میں اندازہ کر سکتا تھا لیکن اس وقت مجھے کوئی شرمندگی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

یہ اسی رات کی بات تھی، کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں ہی بیٹھے تھوہ پی رہے تھے۔ موضوع گفتگو زرفشاں کے نکاح کی تقریب ہی تھی کہ زرفشاں کے ماموں اور ممانی کی اچانک آمد نے سب کو حیران کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے بابا نے بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔

”آئیے عبدالرحمن اور بھابھی! ابھی ہم نکاح کی

تقریب کو ہی ڈسکس کر رہے تھے۔“

ماموں اور مامی کے چہرے سننے ہوئے تھے جسے صرف میں نے محسوس کیا تھا۔ چچی جان اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”بھائی جان کھانا کھا کر آئے ہیں یا لگو آؤں۔“
”نہیں، ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔“

عبدالرحمن صاحب کی آواز کی سرد مہری بھی صرف میں نے محسوس کی تھی۔
”تو پھر میں چائے.....“

”بیٹھ جاؤ صبا!“

ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ چاچی بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے چہرے کے سرد اثرات اور مامی کی خوشنظر نظریں جو زرفشاں کی طرف اٹھ رہی تھیں نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ سوائے میرے، جو جانتا تھا کہ اب کیا مسمیٰ ہونے والا ہے۔

”عبدالرحمن صاحب! خیریت ہے نا، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“

آخر بابا نے ہی پوچھا۔
”خیریت ہی تو نہیں ہے بھائی صاحب۔“

عبدالرحمن صاحب نے وہ خاکی لفافہ بابا کے سامنے پھینکا تھا۔
”یہ دیکھیں.....“

بابا نے لفافہ اٹھا لیا تھا۔

”گھول کر دیکھیں، اپنی شہزادی کا کارنامہ۔“

مامی کی آواز کی کئی میں نے بہت شدت سے محسوس کی تھی اور بابا کا رنگ تو یک دم بدلا تھا۔ انہوں نے لفافے میں سے ایک خط نکال کر کھوڑا سا بڑھ کر آخر میں شاید زرفشاں کا نام پڑھ کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا جو بے حد حیرت سے اپنی ممانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماما اور چاچی، بابا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جن کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا تھا۔

”آپ پڑھے لکھے، سمجھ دار شخص ہیں بھائی صاحب! جب ہم نے رشید والا تھا تو آپ نے بچی سے اس کی مرضی پوچھ لی تھی۔“

عبدالرحمن صاحب نے بابا سے کہا۔
”زرد سے مرضی پوچھی تھی صبا نے، اسے انکار نہیں تھا۔“ بابا کی آواز میں لرزش تھی۔ بابا کی حالت دیکھ کر میں پشیمان سا ہو رہا تھا۔ یہ میں نے کیا کر دیا تھا، کیوں کیا تھا۔

”نہیں..... نہیں یہ خط میں نے نہیں لکھے بابا۔“
زرفشاں ایک دم کھڑی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط لرز رہا تھا۔ گود میں رکھا لفافہ نیچے گر گیا تھا۔

”میرا یقین کریں بابا! یہ خط میں نے نہیں لکھے، کسی نے شرارت کی ہے۔“

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی اور اس کی گندمی رنگت میں جیسے زردی گھل گئی تھی۔

”مجھے یقین ہے..... مجھے تم پر پورا یقین ہے۔“
بابا نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خط کس نے لکھے ہیں۔ کون تمہارا ایسا دشمن ہے۔“

ان کی نظریں میری طرف اٹھیں تو میں ان کی نظروں سے بچنے کے لیے نیچے جھک کر وہ لفافہ اٹھانے لگا اور پھر میں نے اس میں سے خط نکالا۔
”ہادی کہہ رہا تھا یہ رائٹنگ زرفشاں کی ہی ہے۔“

عبدالرحمن صاحب نے آہستہ سے کہا۔
”کیوں زرد۔“ بابا نے سوالیہ سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”بالکل، میری ہی ہینڈ رائٹنگ لگتی ہے لیکن یقین کریں، میں قسم کھاتی ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا۔“

آنسواں کی سیاہ آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

”خط تم نے لکھے ہیں یا نہیں لیکن دل تو برے ہوئے ہمارے، اب آنکھوں دیکھی مٹی تو ہم نکل نہیں سکتے۔“

مامی کے لہجے کی کڑواہٹ میں نے اپنے حلق

میں محسوس کی۔

”بہتر تو یہی ہے بھائی صاحب! آپ زرفشاں سے پوچھ کر اس کی شادی اسی لڑکے سے کر دیں۔“

”میں اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے، وہ جو کچھ کہہ رہی ہے صحیح ہے۔ آپ خود سوچیں! آج کل کے دور میں یہ خط لکھنے کی عادت کون کرتا ہے۔ فون، سیل فون، نیٹ، ریلے کے دوسرے بہت ذریعے ہیں۔ اس لیے سو فیصد یہ کہانی نے ہمارے اور آپ کے ساتھ دشمنی کی ہے۔“

بابا کی بات پر میں چونکا۔ بابا نے بڑی مدلل بات کی تھی۔

عبدالرحمن صاحب کچھ متذبذب سے تھے لیکن ان کی بیگم کھڑی ہو گئی تھیں۔

”چلیں اب کیا سوچ رہے ہیں۔ میرا بیٹا اب ایسا بھی گیا گزرا نہیں ہے کہ ہم ایک بدکردار لڑکی سے۔“

”بس۔۔۔۔۔“ بابا نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”اب ایک لفظ بھی میری بیٹی کے متعلق منہ سے مت نکالے گا۔“

وہ اب بھی ایک ہاتھ زرفشاں کے گرد حائل کیے ہوئے تھے۔

”زرفشاں آپ کی بھانجی ہے، یہ رشتہ ختم نہیں ہو سکتا لیکن دوسرا رشتہ۔۔۔۔۔“

”دوسرا رشتہ اب ختم ہے۔“ مامی نے بابا کی بات کاٹی تھی۔

وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ لڑکی پگھلوں پر موتی پروئے ہوئے تھے جو ٹوٹ ٹوٹ کر رخساروں پر گر رہے تھے۔ بابا اس کے گرد یوں ہی بازو حائل کے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

”چلیں جی اب گھر بھاگی کو بہو بنا رہے تھے۔ سارے رشتہ داروں میں کیا عزت رہ جائے گی ہماری۔“

کیا کہیں گے کہ بھائی نے منہ پر کالک مل دی۔

عبدالرحمن صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن مامی انہیں بازو سے پکڑ کر زبردستی باہر لے گئی تھیں۔ چاچی اور ماما رو رہی تھیں، اور وہ زرفشاں، وہ تو جیسے مرنے

والی ہو رہی تھی۔

”چاچی پلیز مت روئیں، اس طرح مت روئیں۔“

میں بے اختیار ہی اٹھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا ہو گیا صفوان! کس نے دشمنی کی۔ دونوں بعد نکاح تھا، رشتے داروں کو کارڈ بھجوا دیے، ہال کی بکنگ ہو گئی۔ کیا کہیں گے سب کو کہ کیوں۔۔۔۔۔“

چاچی اور شدت سے رونے لگی تھیں۔

”صبا بنی! حوصلہ کرو۔ مت رو، کچھ نہیں ہوگا۔ ہماری عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ نکاح اسی روز ہوگا ان شاء اللہ۔“

بابا اٹھ کر ہمارے قریب آئے تھے اور انہوں نے چاچی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر میری طرف دیکھا تھا، اٹھا کر سوال کرنی نظر میں۔

”صفوان تم۔۔۔ کیا تم زور سے۔۔۔۔۔“ ان کی آواز خراب ہو گئی تھی۔

”جی بابا۔۔۔ میں بیک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔“

”ہم اپنی عزت خاک میں نہیں ملنے دیں گے۔ میں کروں گا نکاح زور ہے۔“

بابا کی آواز جذبات سے ٹوٹ رہی تھی۔

انہوں نے مجھے یک دم گلے لگا لیا تھا اور مجھے بے تحاشا چوم رہے تھے۔

”مجھے تم پر فخر ہے صفوان! تم نے میرا دل رکھ لیا۔“

بابا۔۔۔ زرفشاں آپ کی بیٹی ہیں میری بیٹی عزت ہے۔“

میں نے ان سے الگ ہو کر ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا تھا۔

”بابا جب بات گھر کی عزت پر آ جائے تو۔۔۔۔۔“

میں نے جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا تھا۔

بابا کچھ کہنے کے لیے منہ کھولی تھی پھر بند کر لیتی تھی۔

بابا نے کہا۔

”بابا۔۔۔۔۔ بابا پلیز۔۔۔۔۔“

”تم کچھ نہیں کہو گی زرا میرے اس فیصلے کو قبول کر لو گی، میرا مان رکھو گی زرا ایسے ہی جیسے صفوان نے رکھا۔“ اور اس نے بابا کی بات سن کر لب سمجھنے لپے تھے لیکن اس کے آنسو اس کے رخساروں پر روانی سے بہنے لگے تھے۔

ماما نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

”بس میری جان۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔“

اور میں خط اٹھائے کچن میں آ گیا تھا اور انہیں چلے پر رکھ کر آگ لگا دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سارے خط جل کر اڑا کھڑے ہوئے تھے اور میرا دل عجیب سی اداسی میں گھر گیا تھا۔ یہی تو چاہتا تھا میں، پھر یہ سب کچھ میں نے کیوں کیا تھا۔ شاید میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے ایک پلان بنایا تھا اور اس پر عمل کرنا تھا۔ شاید میں نے بہت دور تک نہیں سوچا تھا، میں اسے پرانا چاہتا تھا اور میں نے اسے پروا دیا تھا۔ بات دے دی تھی۔ میری ذہنی انا کو بڑی تسکین ملی تھی، اس نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اسے مجھ سے ہی شادی کرنا پڑی تھی۔ نہ صرف مجھ سے شادی کرے گی بلکہ ساری زندگی میری احسان مند بھی رہے گی، ساری زندگی اس کی نظر میں میرے سامنے بھی رہیں گی۔ مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن یہ کیسا احساس زیاں تھا جو مجھے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ کیا اپنی محبت کھودنے کا احساس۔۔۔۔۔

ابھی وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ ابھی میں اس نکاح سے منع کر سکتا تھا۔ میں ان جلے ہوئے خطوط کی راکھ اکٹھی کر کے ڈسٹ بن میں ڈالنے لگا تھا جب زرفشاں نے کچن میں قدم رکھا۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں، چہرہ ستا ہوا تھا۔ یہ وہ زرفشاں تو نہیں تھی، ابھی ہوئی گردن والی خود شناس اور خود اعتماد زرفشاں، یہ تو کوئی سبھی ہوئی، ذرا پوک سی لڑکی لگ رہی تھی۔ اعتماد سے عاری، گھبرائی ہوئی۔

ایک دم سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی لہر پیدا ہو گئی تھی۔ احساس زیاں بڑھ گیا تھا، یہ کیا کر دیا تھا میں نے، کتنے دل زخمی کر دیئے تھے۔

”ایم سوری صفوان۔۔۔۔۔“

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو ان روئی روئی آنکھوں میں مجھے وہی اعلیٰ نظر آیا تھا ہمیشہ والا۔

”میری وجہ سے تمہیں پریشانی ہوئی ہے۔ اس وقت سب جذباتی ہو رہے ہیں، کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں ہے لیکن میں صبح خود ہادی سے بات کروں گی۔ وہ یقیناً میری بات سمجھ لے گا۔ مجھ پر اعتبار کرے گا۔ تم بے فکر رہو، تمہارے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم۔۔۔۔۔“

”پلیز زور۔۔۔۔۔“ میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

”اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں بہت ڈسٹرب ہوں۔“

”اوکے، لیکن تم پریشان مت ہونا۔ میں خود صبح بابا جان سے کہہ دوں گی۔“

”پلیز زور۔۔۔۔۔“

اور وہ چلی گئی تھی لیکن میری انا کا ناگ اپنا پھن اٹھائے مجھے بار بار ڈنک مار رہا تھا۔ میں اس بدنامی کے باوجود اس سے شادی کے لیے تیار ہو گیا تھا اور یہ اب بھی۔۔۔۔۔ اب بھی مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر رہی تھی۔

میرا سارا احساس زیاں کہیں کھو گیا تھا اور کوئل رضا کی محبت بھی کہیں دور چھپے رہ گئی تھی۔ مجھے اب زرفشاں سے ہی شادی کرنی تھی، جیسے وہ بابا سے کچھ بھی کہتی۔

میں بے حد خراب موڈ کے ساتھ اپنے کمرے میں آیا تھا لیکن وہاں بابا کو بیٹھنے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”بابا آپ۔۔۔۔۔ حیرت ہے نا۔“

وہ شاید لاؤنج سے اٹھ کر میرے کمرے میں ہی آ گئے تھے۔

”ہاں۔۔۔“ انہوں نے سر ہلایا تھا۔

”صفوان بیٹا! میں جانتا ہوں تم کوئل سے محبت کرتے ہو۔ باتوں باتوں میں ایک روز رضا سے یوں

ہی میں نے ذکر کر دیا تھا تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے کاکس کو پتا ہوتا ہے، میں سوچ رہا تھا زرفشاں کے نکاح کے بعد باقاعدہ تمہارے رشتے کے لیے رضا کی طرف جاؤں گا لیکن میں تمہارا احسان مند ہوں تم نے.....

”کیسی بات کرتے ہیں بابا۔“ میں تڑپ گیا تھا۔ ”بیٹے والدین پر احسان نہیں کرتے۔ یہ تو میرا فرض تھا اور آپ مجھے شرمندہ تو نہ کریں بابا اور میں کوئی کول سے محبت و محبت نہیں کرتا تھا، بس اچھی لگتی تھی وہ مجھے اور پھر آپ ہی تو کہتے ہیں کہ شادی کے بعد سب لڑکیاں ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔“

میں ہنسا تھا لیکن میرے اندر کہیں بہت ساری کڑیاں ٹوٹ کر بکھری تھیں، وہی احساس زبیاں کول رضا کو کھودینے کا احساس۔ بابا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ”زر بہت اچھی ہے صفوان! تمہاری ماما کہتی ہیں ہماری زر جس گھر میں جائے گی، اجالا کر دے گی۔ مجھے یقین ہے تم بہت خوش رہو گے۔ مجھ سے وعدہ کرو مئی! اسے بھی کوئی دکھ نہیں دو گے، ہر طرح سے اس کا خیال رکھو گے۔“

”وعدہ..... آپ کی بہو کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“ میں نے بابا کے بڑے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

اور میں نے صرف وعدہ نہیں کیا تھا، اسے نبھایا بھی تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھا۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کی، کبھی اسے کوئی دکھ نہیں دیا۔ اس کے کہنے سے پہلے ہی اس کی ہر خواہش پوری کی۔ بابا، ماما، چاچی سب ہی خوش تھے۔ مطمئن تھے۔

کیا میں اور زرفشاں بھی خوش تھے، ان اٹھارہ سالوں میں ایک بار بھی میں نے نہیں سوچا تھا لیکن ہم خوش نہیں تھے۔ ایسے خوش جیسے ہونا چاہیے تھا، ہم دونوں نے ہی زندگی پورے من کے ساتھ نہیں جی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میرے پوچھنے پر زرفشاں نے بتایا تھا کہ وہ بھی پورے من کے ساتھ جی نہیں سکی۔

”کیوں زر..... کیوں.....“

میں جیسے تڑپ اٹھا تھا۔

”کیا میں نے ان اٹھارہ سالوں میں کبھی تمہیں کوئی تکلیف دی۔ کیا تمہارا خیال نہیں رکھا۔ ہر لمحہ ہر مشکل لمحے میں تمہارے ساتھ رہا۔ جب روحان کے وقت تمہاری حالت بگڑ گئی تھی اور جب چاچی بیمار ہوئی تھیں تو کیا کسی لمحے میں نے تمہیں اکیلا چھوڑا۔“

”نہیں.....“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”لوگ ہماری زندگی پر رشک کرتے ہیں زرارہ تم.....“

”ہاں لوگ.....“

وہ میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”لیکن میں نے بھی اپنی زندگی پر رشک نہیں کیا بلکہ ترس آتا ہے مجھے خود پر اور تم پر بھی۔“

”کیا باودی یاد آتا ہے..... کیا تم اب بھی باودی سے محبت کرتی ہو۔“

بالکل غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے نکلا تھا۔

”ہاں۔“

کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی، جس نے مجھے ساکت کر دیا تھا۔

”میں اسے بھول جاتی۔“

اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بڑی سی زخمی نظریں تھیں۔

”میں یقیناً اسے بھول جاتی اور تم سے محبت کرنے لگتی کہ میاں بیوی کے درمیان نکاح کا بندھن خود بخود ہی محبت کے تانے بانے بن دیتا ہے۔ نکاح کے اس کرشمے پر بنا گیا محبت کا رشتہ۔ بہت مضبوط بہت پائیدار ہوتا ہے۔ ان ساری بغیر کی محرم رشتے کی محبتوں سے زیادہ پائیدار اور مضبوط۔ ہاں میں بھول جاتی اس محبت کو جو اگر مجھے علم نہ ہوتا کہ میرے اور تمہارے رشتے کی بنیاد دھوکے پر رکھی گئی ہے۔

میرا اہم سفر فریبی اور دھوکے باز ہے۔ اس نے مجھے ایک دھوکے سے اپنی زندگی میں شامل کیا اور دھوکا بھی وہ جس نے میری عزت کی چادر میں ڈھک ڈالے

تھے۔ مجھے میرے اپنوں کے سامنے شرم سار کیا تھا۔“

ہوئے ہوئے لگا ہیں جھکائے بول رہی تھی اور میں ساکت بیٹھا سر ہلاتا تھا۔

”میں جانتی تھی صفوان کہ تم کول سے محبت کرتے ہو۔ تمہیں تو علم نہیں تھا لیکن جب انکل رضا چلا آ کر رہے تھے تو کول سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ یہاں تنہا ہی محسوس کرتی تھی تو میں بھی کھار اس سے ملنے چلی جاتی تھی لیکن تم مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ تمہیں میرے متعلق نہ بتائے کہ کہیں تم اسے منع نہ کر دو۔ کول مجھ سے بہت باتیں کرتی تھی اور میں اتنی خود غرض نہیں تھی کہ تمہیں اپنی محبت کی قربانی دے دیتی۔

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر باودی نے میری بات نہ بھی سمجھی تو بھی تم سے شادی نہیں کروں گی۔ میں بابا کو بتا دوں گی تمہارے اور کول کے متعلق، وہ ضرور میری بات سمجھ جائے گا اس طرح نہ تم خوش رہ سکو گے نہ میں لوگوں کے ڈر سے، وہ دو زندگیاں بھی خراب نہ کرتے۔

لیکن ہوا یوں کہ باودی نے خود ہی رات کو فون کر لیا اور نہ صرف یہ کہ ماما کی معذرت کی بلکہ یقین بھی دلایا کہ اسے مجھ پر پورا یقین ہے اور ماسوں آج بابا سے بات کرنے آئیں گے۔

میں بابا سے بات کرنے سے پہلے تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ رات کو تم بہت ڈسٹرب تھے لیکن میری آنکھ کچھ دیر سے کھلی تھی۔ میں تمہاری طرف آتی تو تم کمرے میں نہیں تھے۔

شاید تم جلدی آؤں چلے گئے تھے۔ میں واپس مڑی تو پھر باؤں کی ٹوک سے ڈسٹ بن اٹھ گئی تھی۔ وہ پانچ گھنٹے تمہاری رائیگ نیند کے نیچے ہونے کے بجائے سائینڈ پر کیوں پڑی تھی۔ میں نے اس میں سے گرنے والے کاغذ جھک کر اٹھائے تاکہ دوبارہ ڈسٹ بن میں ڈال دوں لیکن ایک کاغذ نے مجھے چونکا دیا۔

یہ میرے نوٹس کا ورق تھا۔ میری پیٹن رائیگ میں میرا ہی لکھا ہوا لیکن یہ یہاں کہاں..... میں نے

وہ باسکٹ پھر الٹ دی اور مڑے مڑے کاغذوں کو کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ تم میری پیٹن رائیگ کی پریکٹس کرتے رہے تھے، ایک ٹکڑے پر چند سطریں اس محبت نامے کی کجی تھیں جو میں نے پڑھا تھا۔ وہ سارے خط و قلم نے جلادئے تھے پھر.....

ہر مجرم کی طرح تم سے بھی چوک ہو گئی تھی۔ تم نے ابھی تک یہ کاغذ ضائع نہیں کیے تھے شاید تمہیں ابھی تک موقع نہیں ملا تھا اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی بھی تمہارے کمرے میں نہیں جاتا اور ماما اگر معافی بھی کر دیتا تو تمہارے کاغذوں کو نہیں چھینے دیتا۔ (حتیٰ کہ تمہاری ڈسٹ بن کو بھی نہیں، جس میں تم ردی کاغذ چھینتے تھے) تو یہ تم تھے صفوان لیکن تم نے یہ سب کیوں کیا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پچھلے ایک سال سے تمہارا ہم زبان رویہ، تمہارے مٹی خیز جملے چند لمحوں کے لیے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ شاید تم مجھ سے محبت کرنے لگے تھے کہ محبت بھی تو ایک بڑا غیر اختیاری سا جذبہ ہے، کہیں بھی کجی کجی بھی وقت دل پر شب خون مار دیتا ہے۔

لیکن اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے تو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی نہیں۔ بابا، ماما، امی سب یہی تو چاہتے تھے، نہیں بات کچھ اور بھی صفوان! مجھے سمجھنے میں دیر لگی تھی لیکن میں سمجھ گئی تھی۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے، کسی بات کا بدلہ لینا چاہتے تھے مجھے۔ لیکن بابا کی مٹی نظروں نے تم سے وہ جھلوا دیا جو کبھی بھی تمہاری خواہش نہیں ہو سکتی تھی۔

تم پھنس گئے تھے صفوان! لیکن مجھے اب کیا کرنا تھا۔ میں وہ کاغذ لے کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا میں یہ ثبوت لے کر سدھی بابا کے پاس چلی جاؤں اور انہیں سب بتا دوں لیکن یہ سب جان کر انہیں کتنی اذیت ہوئی وہ تو ٹوٹ جاتے صفوان! کتنا مان تھا انہیں تم پر، کتنی محبت کرتے تھے وہ تم سے۔ میں ان کا یان نہیں توڑ سکتی تھی۔ انہیں ٹوٹنے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی، وہ یہ سب جان کر کیسے زندہ رہ پاتے۔ میں انہیں کچھ بتائے بغیر بھی تمہاری اور کول

کی محبت کا ذکر کر کے ہادی کی ندامت کا پتا کرتے سے شادی کرنے سے انکار کر سکتی تھی۔

”لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں نہیں کیا زرفشاں۔۔۔۔۔ کیوں ہادی سے شادی نہیں کی اور میرے ساتھ آدھے سن سے زندگی گزار لی۔“

میں اندر سے پانی پانی ہوا جاتا تھا پھر بھی پوچھ لیا۔ ”میں نے بہت سوچ سمجھ کر تم سے شادی کا فیصلہ کیا تھا اور ہادی کو صبح کر دیا کہ وہ ماموں کو نہ بھیجے اور نہ ہی خود آئے۔

ہاں وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، بہت اچھا تھا۔ نرم خور اور کمرنگ۔ میں اور اسی نانا کے گھر بہت کم جاتے تھے لیکن جب بھی جاتے تھے، وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ بچپن کا یہ خیال جوان ہونے پر محبت میں ڈھل گیا لیکن وہ ایک مرد تھا صفوان! آج وہ اعلا ظرنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنانے کے لیے تیار تھا لیکن پھر کبھی کسی لمحے وہ مجھے ان غلطو کا طعنہ دے بیٹھا۔ مجھ سے پوچھ بیٹھا وہ کون تھا جسے میں نے خط لکھے تھے۔ اس کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ کک ضرور رہتی کہ اس کی بیوی نے کیا خبر کسی کے نام وہ خط لکھے ہی ہوں۔

یہ شک مجھے کھاجاتا صفوان! اور اگر ہادی کے علاوہ میری شادی نہیں، کسی اور سے ہو جاتی تو ہمارے چھپانے کے باوجود بھی کبھی نہ کبھی اسے پتا چل جاتا کہ میرا نکاح ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اسکی خبریں تو جتنا بھی چھپاؤ، گھر کے چور دروازوں سے نکل جاتی ہیں اور ہوا میں انہیں اپنے پلو میں باندھے اڑا کر گھر گھر پکڑا دیتی ہیں۔

ایک تم تھے صفوان! واحد شخص جو جانتے تھے کہ میں بے گناہ ہوں۔ تم بھی مجھ پر شک نہ کرتے، اس لیے میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ تمہارے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنے کے لیے کہ یہاں بابا اور ماما بھی تھے میرا سہارا۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ بابا کہتے تھے میری زر بہت ذہین اور عقل مند ہے۔ وہ واقعی عقل

مندھی اور میں کیا تھا ایک اجنبی، بے وقوف مرد، جس نے اپنی محبت ہادی کی تھی۔ ایک مٹتی جذباتی کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ اس طرح ہاتھ گویہ میں رکھے نگاہیں جھکا کر ہوئے ہوئے بول رہی تھی۔

”اس روز کوئل میرے پاس آئی تھی۔ رورور کر اس کی آنکھیں سوکھی ہوئی تھیں۔ تم نے اپنی اس قربانی کا بتا دیا تھا، وہ اپنی محبت کے پھڑپھڑانے پر ٹوٹ رہی تھی اور اپنا دل ہلکا کرنے اور اس سارے واقعے پر افسوس کرنے میرے پاس آئی تھی۔ تم آفس میں بیٹے تب، وہ ہمیشہ ایسے ہی وقت میرے پاس آتی تھی جب تم گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ وہ بہت رورور ہی تھی لیکن اسے تم پر فخر تھا۔

اس نے مجھ سے کہا مجھے صفوان سے کوئی گھر نہیں، مجھے فخر ہے کہ میں نے جس شخص سے محبت کی وہ ایک عظیم انسان ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے لیکن اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے اس نے قربانی دی ہے۔ میرے پایا کہتے ہیں کہ وہ شخص جسے اپنے رشتوں کا پاس ہو اور جو ان کی خاطر قربانی دینا اور ان کا بھرم رکھنا جانتا ہو، وہ قابل قدر شخص ہے اور میرے پایا کے دل میں صفوان کی بڑی قدر ہے۔

میں دل ہی دل میں ہنسی مٹی کہ یہ کیسا پاس خواہ رشتوں کا کہ تم نے اپنے پیسے بچا کی بیٹی کو رسوا کیا تھا۔ تم نے قربانی تو نہیں دی تھی صفوان! تم نے مجھ سے بدلہ لیا تھا لیکن میں آج تک نہیں جان سکی تھی کہ تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا تھا۔

بچپن کی ضد اور جلن کے لیے کوئی اپنی محبت پر نہیں لگتا لیکن تم نے اپنی محبت داؤ پر لگا دی۔

پتا نہیں کیوں۔ میں نے بابا کو تمہارے عقل پر کچھ نہیں بتایا تھا کہ تمہارے حلق جان کر شاید وہ زندہ رہے۔ ماما مجھ سے نظریں نہ ملتا تھا اور اسی شان گیلیاں ہاؤس کو چھوڑ دیتیں تو وہ بھی زندہ نہ رہے ہاتھیں لیکن کوئل۔۔۔۔۔ ہاں کوئل کو دکھ تو ضرور ہوتا تھا تمہارا اصلی چہرہ نظر آ جاتا۔ میں نے ساری صبح تقریب

کر لی تھی اور میں نے کوئل کے سامنے وہ کاغذ رکھتے ہوئے سب کچھ بتا دیا تھا۔

میں نے بچپن سے لے کر اب تک تمہاری کسی زیادتی پر اف تک نہیں کی تھی لیکن اب جس نے تم سے بدلہ لے لیا تھا۔ وہ جو تمہیں دیوتا سا بناتی تھی، اس کے دل میں بتا تھا کہ یہ بت ٹوٹ کر پڑی ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے میں نے کوئل کے ساتھ اچھا ہی کیا، یہاں سے جا کر بھی شاید وہ تمہیں نہ بھلا پاتی لیکن تمہاری عظمت کا یہ بت ٹوٹنے کے بعد شاید وہ پھٹن اب سیٹ فورے کی لیکن پھر سنبھل جائے گی۔ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنا آسان ہوگا اس کے لیے اور ایسا ہی ہو۔

اگر یہ کہ جانے کے صرف دو سال بعد اس کی شادی ہوگئی تھی اور وہ بہت خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے، پورے گنا کے ساتھ۔ ہاں یہ اس کی بڑائی ہے کہ اس نے اپنے والدین کے سامنے تمہارا بھرم رکھ لیا تھا، اس محبت کے مدد سے جو اس نے تم سے کی تھی۔ انکل رضا آج بھی تمہاری تعریف کرتے ہیں۔

شاید میں بھی بھی تم سے ذکر نہ کرتی صفوان! لیکن آج جب تم نے پوچھا کہ کیا میں نے زندگی بھرے سن کے ساتھ جی ہے تو میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔

میں جانتی ہوں تم چاہتے تھے میں کہوں ہاں۔ میں اعتراف کروں کہ وہ احسان جو تم نے مجھ پر کیا اس کے عوض میرا پور پور تمہاری محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

تم آج بھی سب کے لیے دیوتا سا بن رہے ہو، اپنے سگھاس پر بیٹھے لیکن میرے لیے نہیں تو میں وہ نہیں کہہ سکتی جو تم سننا چاہتے تھے۔

ہاں میں نے زندگی آدھے سن کے ساتھ گزار دی ہے۔ ادھوری سی لیکن پرسکون اور مطمئن۔“

میں تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا یا پھر مٹی کا ڈھیر کہ راکت بیٹھا اسے بولتا رہا تھا۔ اور میری انا کا ناگ چھن اٹھا اٹھا کر مجھے ڈسٹا تھا کہ اسے ابھی قارغ کر دو کہہ دواسے کہ وہاں چلی

جائے۔ جہاں پورے سن کے ساتھ جی پائے لیکن وہ نفسیات کی ماسٹر بابا کی ذہن اور عقل مند بیٹی چہرے سے دل کا احوال بھی جان پیتی تھی شاید کہ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی بول آئی تھی۔

”کچھ بھی کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا صفوان کہ تمہارے بچے تمہیں اپنا آئیڈل سمجھتے ہیں۔ تم مجھے اپنی زندگی سے نکال دو گے تو وہ سب کچھ جو اٹھارہ سالوں سے چھپا ہوا تھا، ظاہر ہو جائے گا۔“

وہ زرفشاں جسے میں ایک بے وقوف سی لڑکی سمجھتا رہا، اسے اپنے سارے بچے اچھی طرح کھیلنے آتے تھے۔

وہ لیوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

عقلمند اور روحان میں میری جان تھی، حرا کے بغیر تو میں ایک سانس بھی نہ لے پاتا۔ وہ نظریں جو میری طرف محبت و عقیدت سے اٹھتی تھیں۔ میں ان نظروں میں اپنے لیے نفرت کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

وہ تاسف اور ہمدردی سے مجھے دیکھتے ہوئے لاؤنچ سے چلی گئی تھی۔

میں کسی بارے ہوئے شخص کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔ اٹھارہ سال میں نے اس خوش بختی میں گزار دیے تھے کہ میں ایک قانع ہوں لیکن میں جیسے اپنی جیت سمجھتا رہا۔ وہ تو میری مات تھی۔

زرفشاں نے ساری عمر کی زیادتیوں کا بدلہ لے لیا تھا مجھ سے۔۔۔۔۔ اور اب میری پانی کی عمر اس شکست کے زخموں پر مرہم رکھتے گزار جاتی تھی۔ زرفشاں نے مجھے بہت بڑی مات دی تھی اور اس مات کی اذیت برداشت نہیں ہو رہی تھی مجھ سے اور میں صفوان حیدر ایک مرد ہو کر رو رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر، بلند آواز میں۔۔۔۔۔!!



جواب

”بس بھی کیا کریں آج کل وقت کے تقاضے کچھ اور ہو چکے ہیں۔ اب لڑکیوں کی شادی کرتے وقت بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔“ میمونہ کھیر لہجہ میں بولیں۔

”کیوں نہ دیکھیں آپا.....“ ان سے چھوٹی شمعونہ نے چمک کر کہا۔ ”اب ہم اپنی سادہ لوح ماں کی طرح آنکھ بند کر کے ایسے دینے رشتے تو کرنے سے رہے۔ ہماری اماں نے تو مجھے کیا دیکھ کر ہماری شادیاں لی تھیں۔ انہوں نے تو نہ ہماری اچھی صورتیں کیش کروائیں اور نہ ہی اپنی مضبوط مالی حیثیت ہی کے مطابق سوچا ہے۔“

انہوں نے بات کے اختتام پر اسے زور سے گردن جھٹکی کہ گردن کی ہڈی چیخ مچی ہوگی۔

”تو اور کیا۔“ میمونہ نے شدت سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بس جو بھی جیسا بھی رشتہ میرا یا معمولی سی چھان بین کے بعد جھٹ سے ہاں کر دی۔ جیسے خدا خواست ہم بہنوں میں کوئی عیب تھا۔“

”حالانکہ ایک زمانہ ہم بہنوں کی خوب صورتی، خوش لباسی اور اخلاق کا معترف تھا۔ مگر نہیں۔“ شمعونہ نے دائیں ہاتھ سے اپنی چٹخی ہوئی گردن کی ہڈی سہلاتے ہوئے غمی میں سر ہلایا۔

”جیسے بھی کالے پیلے لٹے پڑ کر بیاہ دیا۔“

دراصل انہیں اپنی خوب صورتی اور ان کی دانست میں بے جوڑ شادی کا کچھ زیادہ ہی قلق تھا۔ ان کی اس بات پر میمونہ بے ساختگی سے ہنس پڑیں۔

”کالا تو چلو تمہارا شوہر واقعی ہے۔ مگر پیلا تو کوئی بھی نہیں۔“

”آپ کو بہت ہنسی آرہی ہے۔“ وہ ان کے یوں ہنسنے پر باقاعدہ براہ راستے ہوئے بولیں۔ ”کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب میری سہیلیوں نے جہاں کو دیکھا تھا تب کتنا مذاق اڑایا تھا میرا۔“ وہ رو ہنسی کی ہوئیں۔

”ارے ہاں ہاں! میمونہ ان کی خفگی محسوس کرتے ہوئے جلدی سے منہ بولیں۔

”سب یاد ہے مجھے کہ تم نے کیسے آٹھ آٹھ آنسو بہائے تھے کہ تمہیں اس کالے لکونے سے ہرگز بھی شادی نہیں کرنی۔ اور کیا تم بھول گئیں جب میرا ہاتھ منور کے ہاتھ میں تھما تو کتنی قیل تھوہی ان کی۔ شادی کے ابتدائی ایام میں نے کیسی تنگی، ترشی میں بسر کیے ہیں بس میرا ہی دل جانتا ہے۔“ وہ اپنے کربناک ماضی میں کھنسی گئیں۔

”اور ایک وہ ہماری چچی صاحبہ تھیں۔“ شمعونہ جیسے دانت پیستے ہوئے بولیں۔ ”وہ بھی تو اماں غمی کے دور کی عورت تھیں۔ مگر کسی ذریعہ اور دور اندیش نکلیں..... اپنی چاروں تک چڑھی بیٹیوں کو ڈاکٹروں سے بیاہا..... ایسے نرے جاہل تو ہم بھی نہ تھے۔ اس زمانے میں بی ایس سی کیا تھا۔ اماں ذرا ڈھونڈ لیتیں تو انہیں بھی ڈاکٹر نہ ہی کم از کم انجینئر داماد مل ہی جاتا مگر نہیں..... ہمیں تو کسی بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔“

”کے بوجھ کی طرح اتار پھینکا بھی؟“ میمونہ کے اس وقت کے کم آمدنی والے شوہر تاہم جواب ایک بڑے آفیسر بن چکے تھے اور خاصی بگڑی تھوہی حکومت پاکستان سے پاتے تھے، نے آکر دونوں بہنوں کی باتوں کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”بس دولہا بھائی!“ شمعونہ نے ذرا احتیاط لہجے میں کہا۔ ”ہم نہیں ذرا اپنے ماضی کی یادوں میں کھو گئیں۔“

”اچھا..... اچھا سمجھ گیا۔“ وہ سامنے کے صوفے پر رونق افروز ہوتے ہوئے زور و شور سے

اثبات میں ہلاتے ہوئے بولے۔ ”یعنی آپ لوگ اس وقت اپنا سن پسند موضوع چھیڑے بیٹھی ہیں۔“

”آپ کیا جانتیں، ہمارا سن پسند موضوع کیا ہے؟“ میمونہ کو اسے شوہر کا پر اعتماد انداز نہیں بھایا اسی لیے تنگ کر بولیں۔

”ارے بیگم!“ منور ہنس پڑے۔ ”ہماری شادی کو یہ پچیسواں سال ہے کیا اب میں اتنا بھی نہیں جانوں گا کہ جب بھی کسی لڑکی کی شادی میں شرکت کر کے واپس لوٹی ہیں آپ لوگ..... تو آپ کے درد یونہی بیدار ہو جاتے ہیں۔“

”درد؟ کون سے درد؟“ میمونہ نے ان کے کھلکھلاتے چہرے کو کڑی نظروں سے دیکھتے گھبراتے ہوئے استفسار کیا۔

”آپ کا درد یہ ہے کہ آپ کی اماں نے آپ کو جھپٹے معمولی خواہ دار سے بیاہ دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں اپنی تعلیم مکمل کر کے بنایا نوکری پر لگا تھا۔ ترقی کے مواقع تھے..... میں خفگی اور شریف تھا۔ آپ کے والدین نے غالباً یہی اوصاف مد نظر رکھے ہوں گے۔ اور ہماری شمعونہ، جو بلاشبہ آج بھی بے حد خوب صورت ہیں انہیں ہمیشہ اپنی شادی ایک کم رو انسان سے کر دیے جانے پر اپنی والدہ سے گلہ رہا جبکہ میرے خیال سے جہاں ایک بہترین انسان ہے۔ اس نے شمعونہ کو ہمیشہ اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھا..... انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور وہ ہیں چھوٹی نعمانہ..... جہاں تک مجھے یاد ہے۔ آپ کی والدہ اور گھر والوں نے ان کی شادی تو بڑی دیکھ بھال کر کی تھی..... ظاہر ہے بڑا داماد ہونے کے ناتے آپ کے گھر والے مجھے غمی لے کر گئے تھے فاروق کو دیکھنے کے لیے۔ فاروق تعلیم یافتہ خاندانی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی تھے۔ نوکری بھی اچھی خاصی کر رہے تھے..... اب اگر بعد میں حالات بگڑ گئے تب اس میں آپ کی والدہ کہاں سے قصور وار ہو گئیں؟“

اس وقت منور صاحب نے اپنی ازلی خطرناک

صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا اور دونوں بہنوں کے ماتھے پر پڑنے بل صاف ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں، منور صاحب کا یہ بے لاگ تبصرہ و تجزیہ بالکل پسند نہیں آیا۔

”جائے دس منور؟“ بیگم ہی نے جملہاتے ہوئے لب کشائی کی۔ ”جب آپ کو جتنی حالات کا کوئی علم نہیں ہے تو آپ کیوں ہماری گفتگو میں دخل دے رہے ہیں۔“

”اور کیا دولہا بھائی۔“ شمعونہ نے رکھائی سے



کہا۔ ”برا مت مایہ مگر میرے شوہر سمیت اماں کے تینوں داماد ہی معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ دیکھنے میں بھی بس گزارے لائق اور گھرانے بھی معمولی۔ اس کے برعکس ہماری چچی صاحبہ نے اپنی چاروں بیٹیوں کے لیے کیسے چھان چھان کر بڑھونڈے..... ڈاکٹر، اوپر سے پنڈت اور تو اور گھر بھی ایک سے بڑھ کر ایک شان دار۔“ شمعون ناراضی سے پوچھیں۔

”آپ یہ کیوں فراموش کر گئیں کہ آپ کے چچا کی چاروں بیٹیاں ڈاکٹر ہیں۔ لہذا وہ ڈاکٹروں سے بیانی گئیں تو اس میں اچھے کی تو کوئی بات نہ تھی۔ اور میں نے بھی دیکھا ہے ان کے دامادوں کو..... تین تو صرف قبول صورت کہہ جاسکتے ہیں البتہ وہ مچھلا والا ڈاکٹر جبران واقعی بہت خوب صورت ہے۔ مگر آپ یہ کیوں نہیں دیکھ رہیں کہ کبھی خوب صورت، پنڈت ڈاکٹر اپنی زمین طبیعت کی وجہ سے زندگی بھر اپنی پیوی کے لیے کیسا امتحان ثابت ہوئے..... اور ان کا دوسرا داماد جس نے اتنا بڑھا لکھا ہونے کے باوجود اولاد نہ ہونے کا قصور دار اپنی بیوی کو گردانتے ہوئے دوسری شادی رچا لی اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اولاد اسے دوسری سے بھی نہیں ہو سکی۔“ منور صاحب نے ذرا سنجیدگی سے ان دونوں کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی سعی لاحاصل کی۔

”اب یہ تو خیر ہمارا اور صبا کی قسمت کی بات رہی۔ مگر نہ سیمارا اور نیما بھی تو ہیں۔ ایسی بھرپور زندگی گزار رہی ہیں دونوں۔“ شمعون کا لہجہ حسرت سے نکل کر حد کی حد دو دہیں داخل ہو گیا تھا۔

منور نے انہیں ہنسٹ سے دیکھا۔ ”ایسی بھانک اور حسرت ناک زندگی تو خیر آپ نے بھی نہیں گزاری۔ ہزاروں سے اچھے حال میں بفضل تعالیٰ میں نے رکھا ہے ہمیشہ آپ کو۔“

”اولی اللہ؟“ وہ شوہر نامدار کے اس بیان پر یوں اچھلیں گویا انہیں کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اپنی تعریفیں تو کوئی آپ سے کروائے

بس..... ارے آپ تو رہے سدا کنویں کے مینڈک آپ کیا جانیں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور آپ چن کر آج بھی اپنی ذاتی چھت، دو وقت کی روٹی اور تن پر موجود کپڑے ہی کو کافی خیال کیے بیٹھے ہیں ہو نہ ہا۔“

”چھوڑیں اس لایعنی بحث کو۔“ اس سے قبل کہ منور صاحب انہیں جواب دینے کے لیے منہ کھول پاتے۔ شمعون نے بڑے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

”ہماری اماں نے تو کیا سو کیا..... اب اہم بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کے رشتے ناتے طے کرتے وقت ان تمام پھلوں پر نظر رکھی ہے جو ہماری اماں نظر انداز کر گئی تھیں۔ خیر پھر چل رہی ہیں نا آپ پرسوں عنایہ کے لیے لڑکا دیکھئے؟“

☆☆☆ پھر جو فاش غلطیاں، شمعون کا رشتہ طے کرتے سے اس کی ناقص اہل والدہ سے سرزد ہوئی تھیں، انہیں نہ ہرا کر عین دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے اپنی اکلوتی نور نظر عنایہ کا برابر آخر تلاش کر ہی لیا۔

سمیر مشتاق اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ پوسٹ بھی اچھی تھی اور گاڑی بھی..... کلشن میں والد کا چار سو گز کا بنگلہ بھی سمجھو اس کا اپنا ہی تو تھا۔ دو کمینیں تھیں اور دونوں ہی شہر کے مختلف کونوں میں میاں جا چکی تھیں۔ گویا سارے ہی پیرے اس جھومر میں جڑے تھے۔ جو عنایہ کے ماتھے پر سجے والا تھا۔

عنایہ بھی بہت شاداں و فرخاں، خوش نما و خوب صورت سی تھی کی مانند ادھر ادھر اڑی بھر رہی تھی۔ اسے بھی خوب رویہ میرا اپنے لیے ہر لحاظ سے موزوں لگا تھا اور وہ اس بات پر ”تھیک گاڈ..... تھیک گاڈ“ کہتے نہ تھک رہی تھی کہ اس کی والدہ نے اپنی امی والی جانتیں نہ دہرائیں، مگر نہ اسے تو یہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ بھی اس کے لیے کوئی بے جوڑ رشتہ نہ ڈھونڈ بیٹھیں مگر نہیں۔

شمعونہ کوئی پچھلے زمانے کی نادان عورت نہ تھیں..... وقت کی رفتار اور زمانے کے تقاضوں سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے سبب اس امر سے بخوبی واقف تھیں کہ سودہ حال زندگی کا راز روپے پیسے ہی میں مضمر ہے۔ اور جہاں تک شوہر حضرات کا تعلق ہے، وہ تو سارے ہی بعد میں ایک جیسے ثابت ہوتے ہیں اتو اسی لیے انہوں نے اپنی سادہ لوح والدہ محترمہ کی طرح کسی بھی قسم کی بے وفائے جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا تھا اپنی عنایہ کے معاملے میں۔ یوں انہیں تھوڑا وقت تو ضرور لگا مگر بالآخر وہ گوہر مقصود انہیں مل ہی گیا۔ جو خود ان کے لیے ان کی والدہ نہ تلاش کر سکیں۔

یوں عنایہ بڑی دھوم دھام سے سمیر کے سنگ رخصت ہوئی اور پورے خاندان میں شمعونہ کے داماد کی دھاک بیٹھ گئی۔

☆☆☆ ”اسے کہتے ہیں نا جوڑ، جو تم نے اپنی بیٹی کا ڈھونڈا..... بس بھی، اب تو میری رحمہ کے لیے بھی پرتم ہی نے تلاش کرنا ہے۔“ شمعونہ بولیں..... تو شمعونہ فخر و انبساط سے پھولی نہ ساتے ہوئے جھٹ اثبات میں سر ہلا کر کہنے لگیں۔

دراصل آج وہ بیٹیوں بڑے دن بعد بہت فرصت سے شمعونہ کے ہاں اکٹھا ہوئی تھیں..... اور بڑے مروجہ ہوئی تھیں کہ آج سوئے اتفاق تو یہاں تھا ہی رات ٹھہرنے کی غرض سے اپنی والدہ کی طرف آئی ہوئی تھی اور اس وقت سادہ سے سوئی جوڑے میں ملیں، صوفے پر دونوں پاؤں اوپر کیے، خلاف عادت بڑی خاموشی سے بیٹھی ان سب کو بولنے سن رہی تھی۔

”ہاں بھئی.....“ دھان پان کی نعمانہ بھی ہمشیر کان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے عنایہ کی جانب دیکھ کر گویا ہوئیں۔ ”تم خوش قسمت ہو جو ہماری ماں کی کچھ داری کی بدولت ہمیں ایک امیر کیر سسرال ملا۔“ انہیں تو ایک ہماری اماں تھیں۔ جنہوں نے پتا نہیں کیا دیکھ کر ہمیں تو جیسے تیسوں سے بیاہ کر اپنے سر سے

گویا بلا ٹالی۔“

انہوں نے جملے کے آخر میں ان سب کا من پسند مخصوص قہرہ دہرایا تو اتنی دیر سے لب بستہ عنایہ ایک دم، بے ساختہ، بے اختیار بول پڑی۔

”خالہ..... آپ لوگوں کو ہمیشہ ہی سے یہ سوال پریشان کرتا آیا ہے نا کہ آخر ثانی نے ”کیا“ دیکھ کر آپ تینوں کو ایسے دیسے اور ”معمولی“ لوگوں سے بیاہ دیا تو اس سوال کا جواب مجھے سسرال میں گزارے گئے ان تین ماہ میں مل چکا ہے۔ کیا آپ وہ جواب سنتا پسند کریں گی؟“

”کک..... کک..... کیا مطلب؟“ نعمانہ نے بہت الجھ کر اس کی اتنی صورت دیکھی اور اس کا چہرہ تو خیر اس وقت بڑی حیرت سے شمعونہ اور بڑے لپٹے سے میونہ بھی تک رہی تھیں۔ تب ہی وہ رندھی ہوئی آواز میں دوبارہ گویا ہوئی۔

”مطلب یہ خالہ کہ ثانی نے دیکھے سادہ، مخلص اور قدردان لوگ..... وہ لوگ..... جنہیں میری امی میرے لیے تلاش نہ کر سکیں..... اور میں نے یہ جانا کہ نمود و نمائش کے شوقین، مادہ پرست لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا کسی آزمائش سے کم نہیں..... ثانی تو بڑی مردم شناس خاتون رہی ہوں گی جو انہوں نے آپ لوگوں کے لیے نیک اطوار و وضع دار گھرانوں کا انتخاب کر کے آپ کی زندگی کو مکمل و گلزار بنا دیا۔ شکایت تو مجھے ہوئی چاہیے مگر میں کروں گی نہیں کہ جانتی ہوں امی نے اپنی دانست میں میری خوشیوں ہی کا سامان کیا تھا اب یہ اور بات کہ ان کا پیمانہ غلط نکلا۔“

وہ اتنا کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بنا کسی جانب دیکھے سرعت سے کمرہ عبور کر گئی۔

اور پچھے، آنکھوں میں آنسو لیے دم بخود بیٹھی رہ گئیں وہ بیٹیوں کہ جنہیں آج اپنے دیرینہ سوال کا جواب کی طمانچے کی صورت مل چکا تھا!!



عنیزہ سید

انٹی وکی ہمار

مکمل ناول

اس کے چھوٹے سے لان کی کیار پاں بے
ترتیب تھیں۔ اشوکا اور میکولیا کے درختوں کے پتے
چمڑے تھے، موسیقی اور امرود بے تو جی اور غفلت
کے باعث مرجھائی ہوئی شکل کے ساتھ سر پہوڑائے
لکھ نظر آرہے تھے۔

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ رنگ آلود پھل والی
کھر بی باتھ میں لیے کیار یوں میں بھرے مرجھائے
پتے نکالتی ان کی تراش خراش میں مصروف تھی۔



کھربا کا دستہ ڈھلا تھا اور اس کا ہاتھ کئی بار اس پر سے پھسل چکا تھا، ڈھیلے دے کر کیل بھی اس کے ہاتھ میں پھیر رہی، لیکن اس روز وہ اس اجڑے، بے ترتیب لان کو ایک بہتر شکل دینے کا تہیہ کر کے اس میں داخل ہوئی تھی۔ ہاتھ کی ہر جنبش کے ساتھ اس کا جھکا سر بھی ہلتا اور اس کے گردن تک کٹے بال جھکا کھا کر گردن، کانوں اور ماتھے پر چھو لے لگتے تھے۔

”خود سے ضد لگانا بھی کسی عجیب سی کیفیت ہوتی ہے۔“ وہ اس مشقت بھری مصروفیت کے دوران سوچ رہی تھی۔ انسان اپنی ہٹ دھرمی کے سامنے شکست کھا جائے تو اپنی ہی نظروں میں شرمندہ شرمندہ رہنے کا حوصلہ کرنا ہوتا ہے اور اگر اپنی ضد میں جیت جائے تو جتنا سرخرو خود کو اپنے آئینہ دل میں دیکھ پاتا ہے وہ نظر کسی دوسرے کی نظر میں سمائی نہیں سکتا۔ ”اپنے آپ کے سامنے دو انگلیوں سے رخ کا نشان بناتے، خود اپنے آپ سے ہائی فائیو کے انداز میں ہاتھ ملانے، خود اپنی نظروں کے سامنے پھوٹک سے پیشانی پر آتے بال ہٹانے اور کار اوچے کرنے کا مزہ اسی کچھا لگ ہوتا ہے۔“

اور یہ آخری الذکر سوچ ہی اس کے عزم اور جوش میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ سر جھکائے، نظریں کھربا اور ہاتھ کی جنبش پر ہمائے، دماغ کو کام پر یکسو کیے وہ اپنے کام میں پوری طرح مگن تھی جب ہی تو کچھ دیر تک اسے دبے پاؤں چلتے، اپنے عقب میں آ کر کھڑے، دلچسپی سے اپنے کام کو سمجھنے کسی دوسرے وجود کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا

تھا۔ لیکن وہ قاریہ سعودی جس کی قوت شامہ غیر معمولی تھی۔ اپنے عقب پر موجود کسی دوسرے ذی روح کی موجودگی کا احساس اسے اس وجہ سے اتنی خوشبو کے ذریعے ہی ہوتا تھا۔ بل بھر میں اس کا کام میں مصروف ہاتھ رکھا تھا۔ یقیناً وہ خوشبو اپنی مونگی قیمت کا احساس چہار سو پھیلانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ اس نے دنیا کی پہلی ترین خوشبوؤں کے بارے میں

تفصیل سے پڑھ رکھا تھا۔ یہ یقیناً ایسے ہی کسی برائے کی خوشبو تھی جس کے صرف ایک اونس کی قیمت ہزار ڈیڑھ ہزار ڈالر بتائی جاتی تھی۔

اس نے لمحہ بھر میں انداز لگایا اور اگلے ہی لمحے گردن موڑ کر دیکھنے پر یچین میں پڑی کہانیوں میں لگے الفاظ ”پچھلے مڑ کر نہ دیکھتا پھر کے ہو جاؤ گے“ یکدم جھگڑنے لگے تھے۔ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس کی بے یقین نظریں اپنے سامنے کھڑی لڑکی پر جمی تھیں۔ اس کی اسے گھر میں موجودی پر وہ اتنی حیرت زدہ تھی کہ اس کے ارد گرد کا پورا منظر کہیں غائب ہو چکا تھا۔

اگر کوئی احساس باقی تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس کے گھر میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی اسی شان و شوکت، خوب صورتی اور انداز کے ساتھ جس نے پورے چار سال اسے ایک عجیب — اور ناقابل بیان احساس کثرتی میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں سر اٹھا کر جینے کی عادی تھی، اس لڑکی نے اسے چار سال مرعوب کیے رکھا تھا اور اس وقت بھی اسے اپنے سامنے کھڑے پا کر وہی مرعوبیت اچانک اس کے ذہن پر طاری ہوئی تھی۔ اسے لگا وہ بولے کی تو اس کی زبان بھی لڑکھا ہٹ کا شکار ہوئی۔ شاید اس لیے وہ جب چاب کھڑی اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ ”ہیلو.....“ اس کی طرف سے استقبال الفاظ سے مایوس ہو کر آنے والی نے اپنی حرکتی آواز میں خود ہی اسے مخاطب کیا۔ جواب میں اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیلنے کی ناکام سی کوشش کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

”آ.....“ آنے والی نے ایک مرتبہ پھر اس کی طرف سے جواب سے مایوس ہو کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”بیٹھے کو نہیں کہو گی کیا؟“ ”اوہ، ہاں!“ دماغ کو ذرا سا جھکا لگا تھا اور ارد گرد کا منظر واپس اپنی جگہ آ کر سج گیا تھا۔ ”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا اور بغیر سوچے اپنے منہ بھرے ہاتھوں کو سفید قمیص کی پشت سے رگڑتے ہوئے

دائیں بائیں گردن گھمائی مینگو لیا والی کیاری کے قریب لوہے کی برائی رنگ آلود کرسی رہی تھی جس پر کبھی کبھار ”ہا“ بیٹھے مڑج کا اخبار پڑھتے نظر آتے تھے۔ اس کی نظریں اس کرسی پر جا کر روک گئیں، تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے وہ کرسی اٹھائی ہاتھ جھٹک کر اس پر گرے زرد پتے جھاڑے اور مختصر لان کے درمیان لاکر کھڑی۔

وہ جاتی تھی کہ یہ کرسی اس کے شبانہ شان نہیں تھی۔ وہ ضرور ناک بھول چڑھائے کی۔ اس کرسی کا پیش کیا جانا اسے سراسر اپنی بے عزتی محسوس ہوگا، لیکن اس وقت اس کا ذہن اس کے قابو میں نہیں تھا وہ بری طرح مرعوب تھی۔ لیکن اس کی توقع کے برعکس آنے والی مہمان ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ شکر یہ کہتی ہوئی اس کرسی پر براجمان ہوئی۔ تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

”بیٹھو نا تم بھی تو بیٹھ جاؤ نا قاریہ!“ وہ اس غیر آرام دہ کرسی پر خامے آرام وہ انداز میں بیٹھنے کے بعد اس سے مخاطب تھی۔

”قاریہ!“ اس نے زیر لب اپنا نام دہرایا اسے تو میرا نام بھی یاد ہے۔ لیکن یہ یہاں — کیسے، آخر کیوں؟“ اس کے ذہن میں سوال اٹھا تھا۔ ”کم آن مار..... میں تمہارے گھر تم سے ملنے آئی ہوں۔“ اس کی مخاطب جسے صرف دور دور سے دیکھ کر ہی متاثر ہوتے اس نے چار سال گزار دیے تھے اس کے ساتھ یوں بات کر رہی تھی جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ ”جانتی تھی ہو کہ کتنی مشکل سے گھر ملا ہے تمہارا۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”مارا کا کوئی شہر ہے کچھ زیادہ ہی فاصلے پر نہیں ہے۔ اور تمہارا گھر تو اس آخری لین میں ہے۔ میرے ذرا نیور نے تمہارا گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے گاڑی کا آدھے سے زیادہ فیول تو ضرور ہی جلا دیا ہوگا۔“ اس کے چہرے پر ابھی بھی وہی دلکش مسکراہٹ تھی۔

”لیکن تم..... تم تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے یہاں آنے پر تم خوش نہیں ہو..... ہے نا؟“ وہ جو کمر پر ہاتھ رکھے پورے دھیان سے اس

کی بات سن رہی تھی ایک دم چونکی۔ ”نہیں۔“ اس نے بے اختیار سر ہلایا۔ ”نہیں تو اور پھر گھر اسانس لینے ہوئے دوسری آواز میں بولی۔“ ”میں نا خوش تو نہیں البتہ حیران ضرور ہوں۔“ ”خیر۔“ وہ وہیں اس کی کرسی کے قریب بیچلان کی گھاس پر بیٹھ گئی۔ ”ارے نیچے..... نیچے نہیں بھی۔“ وہ مضطرب ہو کر کھڑی ہوئی۔

”اس اوکے، تم بیٹھو پلیز۔“ قاریہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس بیٹھنے کا کہا۔ ”میں نہیں یاد بھی ہوں یا ایک سال کے وقفے میں سب بھول گئیں۔“ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اسے نہ صرف یاد تھی بلکہ شاید اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس سے نا صرف مرعوب تھی بلکہ وہ اس جذبے کو کوئی نام دینے سے بھی قاصر تھی جو اس کے دل میں اس کے لیے پلٹا تھا۔ کوئی جان لینا تو نجانے اس کو کیا نام دیتا، رشک، حسد یا پھر کچھ اور۔

”ہاں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے بے نیازی کا سا چولا اوڑھنے کی کوشش کی۔ جبکہ اسے پکا یقین تھا کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہی رہی ہوگی۔ جب ہی تو اس کے گھر آنے والی مہمان نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ناک سیکڑ کر موندنا انداز میں اس سے پوچھا تھا کہ اسے پینے کو پانی مل سکتا تھا۔

”اوہ..... ضرور!“ قاریہ کے دماغ میں کرنٹ سا دوڑا، وہ اس کی مہمان تھی اور مہمان تو ازی کا تھا خدا تھا کہ وہ اسے خوش دلی سے چائے پانی کا پوچھتی۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ ”میں ابھی لائی“ وہ رہائشی عمارت کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔

کچن تک پہنچتے پہنچتے اس نے شاید سو طرح کے مشروب سوچ لیے تھے جو اس کی مہمان کو پینے کی عادت ہو سکتی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی مشروب اس کے گھر میں موجود نہیں تھا۔

”نہیں۔“ جواب میں حرم کا سر بھی انکار کی صورت ہی میں ہلاتھا۔ ”میں جانتی تھی وہ یہاں نہیں مل سکتا تھا، یہی بھی نہیں۔“ فاربیہ نے اس کی نظروں اور لہجے میں چھلکاٹا مسخرہ محسوس کیا اور دل ہی دل میں تلخ ہوئی۔

”یقین۔“ حرم کی آنکھیں چند لمحوں کے وقفے کے بعد دوبارہ سے برسنے لگیں۔ ”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا مسئلہ اس دنیا میں صرف تم حل کر سکتی ہو صرف تم۔“

فاربیہ اسے نا سنجی سے دیکھتی رہ گئی۔ اب وہ صرف وہ الفاظ سن رہی تھی جو حرم خرم خان کے منہ سے نکل کر اس کی سماعت تک پہنچ رہے تھے۔

☆☆☆

”اس نے تم سے کہا اور تم نے مان لیا۔“ عموماً ابنا ناشتے کی میز پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے اس کی بات دھیان سے نہیں سنتے تھے۔ لیکن یہ بات ایسی تھی جس نے انہیں بھی بری طرح چونکا دیا تھا۔ انہوں نے اخبار سے نظر ہٹا کر فاربیہ کو دیکھا وہ سر جھکائے ہاتھ کی انگلیاں چٹختی نظر آئی۔

”مطلب تم نے واقعی؟“ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آپ کو کیا پتا وہ کس بری طرح رو رہی تھی۔“ فاربیہ جانتی تھی اب اس کی یہ بات سن کر بری طرح چٹکیں گے۔ پھر بھی اس نے شکوہ ہماری نظروں سے انہیں یوں دیکھا جیسے ان کے چونکنے پر پرمانہ لگی ہو۔

”وہ روئی اور تمہارا دل پہنچ گیا۔“ ابانے تشویش کے مارے آنکھوں پر لگا چہرہ بھی اتار دیا۔

”جانتی بھی ہو کہ تم نے اس سے کس کام کا وعدہ کر لیا؟“

جواب میں فاربیہ کا انکار میں ہلکا سر دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئے۔

”نہیں جانتی کیا؟“

”اس وقت مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ میں اس

کے سامنے کس کام کی ہامی بھر رہی تھی۔ میں صرف اس کی روٹی آنکھیں دیکھ رہی تھی جو مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی اور کھڑکی کے قریب جا کر رک گئی۔ کھڑکی کے شیشے کے پار اس کا جانا پچھانا منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

”وہ کہاں ایسے رونے کی عادی ہے۔ آپ کو کیا معلوم۔“ اس نے گردن موڑ کر ابابا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”مجھے واقعی نہیں معلوم کہ وہ لڑکی کون ہے۔ کہاں سے آئی تھی اور اپنا کام نکالنے کے لیے اس کی نظر کرم تم ہی پر کیوں پڑی میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ دو طاقت ور بیویوں کی لڑائی کے درمیان تم اپنے سینک گھسانے کا وعدہ کر چکی ہو، جبکہ تمہارے اپنے سینکوں کے کنارے گھسے ہوئے ہیں، بلکہ تمہارے سینک بالکل ناکارہ ہیں۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ جو سینک اس لڑائی کے درمیان گھسیں گے وہ میرے ہوں گے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”مطلب؟“ ابابا ایک بار پھر چونک گئے۔ ”اس بات سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب، حرم سے وعدہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں تو آپ تھے۔ آپ کر سکتے ہیں اس کا کام۔“

اسے لگا ابابا کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا جب ہی وہ اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے جواب کے بعد بھی وہ اپنا سوال بار بار دہرا رہا ہے۔

”آپ کی بات سن لے گا وہ، آپ کہیں گے تو۔“ اس نے ابابا کے قریب جا کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے تئیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اپنا شانہ جھٹک کر اس کا ہاتھ گرادیا۔

”بہت غلط توقع لگا بیٹھیں تم مجھ سے۔“ انہوں نے غصے سے انداز میں کہا۔

”دیکھیں ابابا!“ اس نے عقل مند بننے کا مظاہرہ

کیا۔

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

”ہم اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔“

”مطلب آپ چاہتے ہیں کہ یہ کام میں خود کروں، میں اس حکم پر مقرر، خود کو آسان سمجھ کر زمین پر رہنے والوں سے بھی بکھارنا طلب ہونے والے سے بات کروں۔“ وہ ان کی نظروں کے عین سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔

”میرے چاہنے نہ چاہنے کا تو یہاں سوال ہی نہیں۔ اس لڑکی سے وہ جو کوئی بھی تھی اس کی مدد کا وعدہ تم نے کیا تھا میں نے نہیں۔“ ابانے خود کو اس سارے قصے سے صاف نکال لیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔“ وہ قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا لہجہ دھیما ہوا اور اس نے ملتویانہ نظروں سے ابابا کی طرف دیکھا تھا۔

”لیکن یہ کہ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے تم کو اس بے مقصد اور فضول وعدے سے بچر جانا ہے یا اسے نباہنا ہے۔“ ابابا اپنے اخبار اور ناشتے کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئے۔

”وہ لڑکی بھی اسی شہر میں رہتی ہے اور اس کا محبوب بھی، وعدے سے مکر نے اور نہ اپنے دونوں کے راستے ایسے ہیں جن سے تم واقف ہو۔“

”آپ جانتے ہیں میں یہ دونوں کام ہی نہیں کر سکتی۔“ فاربیہ کا لہجہ بچھ گیا تھا۔

”یہ خیال تو نہیں بلا سوچے سمجھے وعدہ کرنے سے پہلے آنا چاہیے تھا اور یہ بات میں تمہیں ہمیشہ سمجھاتا آیا ہوں۔“ وہ اس کا جواب مستانہ نہیں چاہتے تھے جب ہی اخبار پر پوری طرح متوجہ ہو گئے۔

”ٹھیک ہے۔“ کچھ دیر ابابا کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنی کرسی ٹھیک کر میز کے قریب کی۔ ”یونہی تو ہوئی تھی۔“

نوسٹ کے سلاکس پر جیم لگاتے ہوئے وہ دانستہ بلند آواز میں بولی تھی تاکہ اباس لیں کہ اس نے چیلنج قبول کر لیا ہے۔ لیکن ان کی نظروں نے جنبش کی نہ ہی

زبان نے، گویا وہ اس معاملے سے مکمل لائق اختیار کرنے کے موذ میں جا چکے تھے۔

☆☆☆

”دیکھیں نا باجی! کتنی عجیب سی بات ہوئی۔“ ریشماں نے فرش پر پونچھا لگاتے ہاتھ روک کر کہا اور اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کی خاطر فرش پر بیٹھ گئی۔

”جب مراد نے پچھلے علاقے سے اس نئی کالونی میں آ کر بس جانے کا پروگرام بنالیا تو میں بڑی اداس ہو گئی۔“

ریشماں نے رک کر کن آنکھوں سے فاربیہ کی طرف دیکھا جو لپ ٹاپ گود میں رکھے اس کی روٹیں اسکرین پر نظریں بھائے کچھ دیکھ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر مایوسی اور نظروں میں الجھن کا عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا لیکن وہ ریشماں بھی جس کا دھیان اپنے مخاطب کی توجہ یا بے توجہی پر کم ہی جاتا تھا وہ صرف اپنی بات کرنے اور کرتے چلے جانے کی عادی تھی۔ سو اس وقت بھی اس نے فاربیہ کی بے توجہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”یقین مانیں باجی! یہاں آ کر کتنے ہی مہینے میرا دل نہیں لگا۔ میں مراد سے کتنی بھی لوبھارہ بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے، کہنے کو کالونی مگر اتنی بے آباد اور پران، اس وقت تک تو اس ہلاک میں کتنی کی صرف تین کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں، اب تو خیر سے کوئی چودہ سولہ تو ہو ہی گئی ہوں گی۔“ اس نے تصور میں گفتی کرتے ہوئے کہا۔ ”یقین کریں باجی جس وقت مراد نے مجھے بتایا کہ اس نے چھوٹے صاحب جی کو یہاں دیکھا ہے اور یہ بھی کہ وہ ابھی اپنی نئی کوئی ادھر ہی ہنوار ہے ہیں تو مجھے کتنی دیر یقین ہی نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے رات کافی میں نے، صبح ہوتے ہی بھاگی ادھر چلی آئی، یہاں آ کر جو دیکھا تو صاحب جی تو واقعی ادھر کھڑے ٹھیکے دار سے باتیں کر رہے تھے۔ باجی ٹھیکے دار بشیر رشتے میں مراد کے مامے کا پشلا لگا ہے۔ بشیر اور چھوٹے صاحب جی کو اکٹھے کھڑے دیکھ

شہر کے نواح میں بسی بسی بستی سے شہر کی طرف جانے کے دوران ایک بار اسے حرم نے فون پر یاد کیا تھا۔

”تمہیں میرا کام یاد ہے نا تم نے اس سلسلے میں کچھ کیا یا نہیں۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”دیکھو ابھی تو میں اپنے بچن کے لیے گروہری کرنے جا رہی ہوں۔ اس موضوع پر تم سے بعد میں بات کروں گی۔ میرا مطلب ہے گھر واپس آ کر۔“

فاریہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے حرم سے غلط بیانی کیوں کی تھی، شاید اپنی ہم میں کامیابی کی ایک فیصد امکان کے نتیجے میں وہ اسے حیران کر دینے والی خبر سنا کر خوش کر دینا چاہتی تھی یا پھر نانوے فی صد ناکامی کے امکان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی کو کوئی بھی بہانا بنا کر ٹال دینے کا آپشن زندہ رکھنا چاہتی تھی۔

”بچن کے لیے گروہری..... اوہ!“ حرم کے لہجے کا تسخیر جو بہت حد تک ناخوش تھا، اس کی انا کو ہلکی سی ضرب دے گیا۔ ”وہی بچن نا جو اتفاق سے تمہارا اسٹوڈنٹ بھی ہے، تم نے بتایا تھا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں وہی بچن۔“ فاریہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

”میں نے کوشش کی تھی تمہاری ایک دو ویڈیوز دیکھنے کی، لیکن ایمان داری سے بتاؤں تو سچ میں وہ بہت خوف ناک تھیں۔“

”ہوں۔“ فاریہ کو یہ لفظ بولنے کے لیے خون کا ایک بڑا گھونٹ پینا پڑا تھا۔

”میرا خیال ہے، مجھے تمہیں بتا دینا چاہیے کہ ایسے قابل رحم کیرے اور لائف اسٹائلس اور ایسی مسکین ریکارڈنگ کے ساتھ تم شاید کبھی وہ نتیجہ حاصل نہ کر پاؤ جو تم نے اپنے لیے سوچ رکھا ہے۔“ حرم میں خرم خان کی بیٹی ہونے کا رنگ جھلکے لگا تھا۔

قدموں کو واپس مڑنے نہیں دینا چاہتی تھی لیکن اگر حرم اسی طرح گفتگو کرتی رہے تو کون جانے وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں کیا فیصلہ کر لیتی۔

”چلو ایک ڈیل ڈن کر لیتے ہیں۔“ لیکن حرم بات ختم کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

”بولو۔“ اس کی لولہ وکین میز و اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ وہ فون کان سے لگائے وکین سے اتر کر اسٹیشن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”اگر تم نے میرا کام کر دیا تو میں تمہیں تمہارے گھر میں ایک اسٹیٹ آف دی آرٹ جگن سیٹ کر کے دوں گی۔ بہترین کیرے اور ویڈیو ریکارڈنگ سسٹم بھی گفٹ کروں گی۔ ہر طرح سے تمہاری مدد کے لیے موجود رہوں گی، تم دیکھنا میں تمہارے لیے کیا کیا کروں گی۔ بولو منظور ہے؟“

فاریہ کے تیزی سے چلتے قدم سست پڑنے لگے۔

”بولو نا، چپ کیوں کر گئیں۔ کچھ کی رہ گئی ہو اس ڈیل آفر میں تو وہ تم خود سے شامل کرلو۔ شاید میں کچھ بھول گئی ہوں۔“ حرم کہہ رہی تھی۔

فاریہ کی نظریں جھیل چیر پر بیٹھے ایک بزرگ اور ان کی وکیل چیر کو آگے بڑھانی ایک ادیب عمر خاتون پر جا رہی تھیں۔

”بولو فاریہ! خاموش کیوں ہو گئیں۔ منظور ہے یا نہیں۔“ حرم کی آواز کان میں گونجی۔

”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دینے کے بعد فون بند کر دیا۔

”رکھیں۔ میں لے جاتی ہوں اٹکل کو۔“ فون بیک میں رکھنے کے بعد وہ بے اختیار ادیب عمر خاتون کی طرف بڑھی تھی۔

”اس برقی زینے پر چلی تو جانے کی نا ذلیل چیر۔“ خاتون پوچھ رہی تھیں۔

”جی ہاں۔“ بزرگ اور خاتون کو گفٹ کاؤنٹر پہنچا کر گفٹ کر دیتے وہ بھول گئی تھی کہ کچھ دن پہلے اسے حرم کی باتیں بہت بری لگ رہی تھیں اور اسی

ناگواری کے نتیجے میں وہ حرم کی خاطر جبران محمود سے ملے جانے کا ارادہ ترک کر چکی تھی۔

”شکریہ، اللہ تمہیں جزا دے۔“ ادیب عمر خاتون اپنی نشست پر بیٹھ کر اس کو دعا دے رہی تھیں اور وہ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے بس میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ منزل پر پہنچ کر حرم کا کام کرنا تھا یا یوں ہی واپس آ جانا تھا۔

☆☆☆

”محمود صاحب تو مجھ کو دنیا سے بالکل بیزار ہی ہو چکے ہیں۔“

پچھلے گھر میں ریشماں نے فاریہ کی عدم موجودگی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچن کا پچھلا دروازہ کھول کر مراد کو بچن میں گھسایا تھا اور اب دھلے برتن جاذب کپڑے سے خشک کرتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

مراد کو اس روز فاریہ نے گھر کی بالائی منزل کے کمروں کی کھڑکیوں کے خشکے باہر سے صاف کرنے کے لیے بلا رکھا تھا۔ فاریہ کے گھر سے نکلنے سے پہلے تک وہ ادیب میز پر بیٹھ کر صاف کر رہا تھا اور اب بچن چیر پر بیٹھا جانے کا کپ ہاتھ میں پکڑے ریشماں کی وہ باتیں سن رہا تھا جو پہلے بھی کئی بار سنا چکی تھی۔

”بتایا تو تمہیں، محمود صاحب نے اچھا نہیں کیا محمود صاحب کے ساتھ۔“ مراد نے جانے کا گھونٹ بھرنے کے بعد ریشماں کی تسلی کے لیے کہہ اس کی بات سن رہا تھا، کئی بار کا دہرایا جواب ایک مرتبہ پھر دہرایا۔

”یہ بھی تو سنی سنائی ہی ہے نا کہ محمود صاحب کے پاس پیسہ نا جائز کمائی سے آیا۔“

ریشماں کو محمود صاحب کی پیگم جو اس کی پرانی بانی تھیں بھلائے نہیں بھولی تھیں، کیسا سونا سادہ دل تھا ان کا نرم گفتار، دیالو، کھڑ، سلیقہ مند، ہر کسی سے پیار، محبت کا رشتہ۔ وہ کیسے مان لیتی کہ اس کی بانی شوہر کو ناجائز کمائی کرنے دے سکتی تھیں، اتنی تو وہ اللہ والی

بانی تھیں۔

”یوں ہی تو مسعود صاحب نے اپنے اس بھائی سے لافٹنی اختیار نہیں کر لی جس کو کچھ دیکھ کر جیال کرتے تھے۔“ مراد نے کندھے پر رکھا کپڑا اتار کر بچن ٹیبل کے خشکے پر گرے جانے کے قطرے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھ محمود صاحب کی وہ پرانی اور اب والی حیثیت نہیں دیکھتیں تم، زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”ہوگا بھئی اندر چوری جیسے کھاتے کوئی غلط، حج کا چکر۔“ ریشماں نے خشک چٹیل ریک میں رکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ”میرا دل تو بس ان چھوٹے صاحب کو دیکھ کر دکھتا ہے، ایک تو بھائی الگ ہو گیا، اوپر سے ریناڑ بھی ہو گئے۔“

”ریناڑ منٹ خودی ہے، چھوٹے صاحب نے، ابھی ان کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں۔“ مراد نے یاد دلایا۔

”چلو یوں ہی سہی مگر وہ بھی تو بیماری کی وجہ سے لینی پڑی نا، صابرہ خالد بتا رہی تھیں اتنے بیمار بڑ گئے تھے کہ بچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔“ ریشماں مراد کے سامنے رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

”سدا کا ساتھ تھا بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کا۔ دونوں بھائیوں کے سلوک اور محبت کی لوگ مثال دیا کرتے تھے۔ اماں بتایا کرتی تھیں کہ جب فاریہ باجی کی۔ امی کا انتقال ہوا تو بڑے صاحب کی، بی بی جو تمہاری پرانی بانی تھیں نے بچی کو ماں کی جی محسوس نہیں ہونے دی۔ کامران، عثمان اور چچان بھائی کی طرح چالا، فاریہ باجی کو یوں جیسے کوئی سکی اولاد کو پالتا ہے۔“

مراد کی مرحومہ والدہ اس گھرانے کی پرانی ملازمہ تھیں، اسی لیے مراد کو خاندان کی تاریخ ریشماں سے زیادہ یاد تھی۔

”اللہ ہی جانے کس کی نظر لگ گئی دونوں بھائیوں کو۔“

ریشماں نے میز پر جی ہنری کی نوکری سے شاپم

کمال کر چیلے شروع کیے۔

”اب کوئی دونوں بھائیوں کو دیکھے تو کبھی نہ مانے کہ یہ بھی مسلم تاون والے گھر میں اکٹھے رہا کرتے تھے یہ چھوٹے صاحب کا گھر۔۔۔۔۔“ اس نے نظر اٹھا کر ارد گرد نظر ڈالی۔ ”اتنا چھوٹا اور ایسی ویران کالونی میں، مانو جنگل ہی میں آج ہے۔“

”اور ادھر جا کر دیکھو کبھی بڑے صاحب کی ڈیفنس والی کوٹھی، کوٹھی کیا محل ہے کل۔ انگریزی میں ویسے گھروں کو کچھ اور ہی بولتے ہیں نہ جگہ نہ کوٹھی کچھ اور ہی بلا ہے وہ۔“ مراد کی آنکھوں میں چمک اتری۔ ”اور سنا ہے اب تو ادھر بیدیاں روڈ پر فارم ہاؤس بھی خرید لیا، انہوں نے خدا جانے کتنے کمال کا تو رقبہ ہے اس فارم ہاؤس کا۔“

”چھوڑو۔“ ریشماں کو بڑے صاحب کی موجودہ حیثیت کا تصور کر کے ہی جھرجھری سی آ گئی۔ ”اب ہم جیسوں کو تو وہ ملازم بھی نہ رہیں اپنے گھر میں۔ خود ہی تو بتا رہا تھا کہ ان کے ہاں ملازم ٹریننگ کے بعد رکھے جاتے ہیں۔“

”اور کیا۔“ مراد کے چہرے پر رشک ابھرا۔ ”ایک بار میں ملنے کا یہانا کر کے گیا تھا۔ ان کے بچن کا اسٹاف ہاتھوں پر دستانے پہنے بغیر کام نہیں کرتا۔ یہ چھوٹے صاحب کا گھر ہی ہے جہاں تم عام صابن سے ہاتھ دھو کر سبزی چھلنے بیٹھ گئے ہو۔“

”ہمیں وہاں کام کرنا بھی نہیں ہے، اپنے چھوٹے صاحب ہی چھلے۔ سیدھے سادے، نہ کوئی خرا نہ شوشا۔ جیسے ہم خود سیدھے دیسے ہمارے صاحب۔ میں تو شکر کرتی ہوں، یہ بھی اسی کالونی میں آجے ورنہ مجھے ان سے نئے پیسے والی باجیوں کے گھر کام کرنا پڑتا جو بات بے بات۔ رعب ہمارے پرانی رہتی ہیں۔“ ریشماں نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بس ایک ہی مسئلہ ہے ادھر۔“

”وہ کیا؟“ مراد مسکرایا۔

”فاریہ باجی کا چکن اور کیا۔“ ریشماں نے مراد کی طرف دیکھا اور دونوں بے اختیار ہنس دیے۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے وہ بھی۔ فاریہ باجی کا کچن ہی تو ہے جو مجھے بھی کیمرا پکڑنا اور ویڈیو بنانی آ گئی۔ تھوڑے پیسے بھی مل جاتے ہیں اور جو کھانا وہ پکاتی ہیں، اس میں سے حصہ بھی۔“ مراد نے سنجیدہ نظر آتے ہوئے کہا۔

”کھانا۔“ ریشماں نے منہ بتایا۔ ”کھانے بھی تو وہ اپنی وادی اماں والے انداز میں پکاتی ہیں اور چیزیں بھی جن کے نام بھی لوگ نہ مانتے ہوں۔ خلیج مالک، میٹھرے، میتھی کی روٹیاں، لسی اور ساگ، مکھڑی حلوہ، ساگوادے کی کھیر۔“

”یہی تو اسٹائل ہے بھئی۔“ مراد مسکرایا۔ ”فاریہ باجی کہتی ہیں آج کل کے مارڈن لوگ برانی چیزوں پر مرنے لگے ہیں۔ انہیں ہی دوبارہ ذمہ کر رہی ہیں۔ کیا کر کے بولتی ہیں وہ وہ یاد کرنے لگی۔“ وینچ یاد آ جانے پر اس نے پشلی بجاتی، وینچ اور پرمیٹو۔

☆☆☆

اس علاقے کو شہر کی معاشی و اقتصادی سرگرمیوں کا دل کہا جانے لگا تھا اور ایسا گزشتہ دس پندرہ سال کے عرصے میں ہی ہوا تھا۔ شہر کے اس حصے کا حلیہ بھر بدل کر رہ گیا تھا۔ آسمان کو چھوٹی کثیر المنزلہ عمارتیں سر اٹھائے قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی تھیں۔ کشادہ سڑکیں، دکانیں، ریستورانس، کیفے، یوں جیسے ایک خاص ترتیب دے کر سب کو ان کی باری اور جگہ دی گئی ہو۔

وقت جتنی تیزی سے گزرتا ہے اتنی ہی تیزی سے آنکھ کے سامنے کے منظر بھی بدل جاتے ہیں۔ اس نے تیز رفتار بس سروس کی بس سے اترنے کے بعد ایک دولھے اپنے ارد گرد دیکھنے کے بعد اپنی منزل کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ بھی ایک کثیر المنزلہ عمارت تھی جس کے اندر اسے جا کر اپنی مطلوبہ کمپنی کا دفتر ڈھونڈنا تھا۔

کثیر المنزلہ عمارت کے اندر داخل ہونے کے بعد اسے ادھر ادھر خوار نہیں ہونا پڑا تھا۔ عمارت کا مکمل نقشہ ایک بڑے بورڈ کی شکل میں سامنے دیوار پر اپنی

جگہ دکھا رہا تھا۔ تیروں کے نشان اور منازل کے نمبر اسے بتاتے کہ کسی سے ان کے بارے میں پوچھنے کی دقت بھی نہیں پیش آئی گی۔

”اور لوگ اپنے تئیں کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔“ برقی زبے پر سواتیری منزل کی طرف جاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ دل ابھی بھی دو حصوں میں بٹا ہوا تھا اسے یہیں سے واپس چلے جانا چاہے یا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جانے میں صرف ایک قدم کا فرق تھا۔

”کیا ہے یہی فارہ تم کون سا کسی سے قرض مانگتے جا رہی ہو یا پھر کوئی پچھلا حساب پکانے کا معاملہ ہے۔ سیدھی سی بات ہے تم ایک دھمی دل کے درو کے مدد سے کی خاطر یہاں پہنچی ہو تو پھر اپنا کام کے بغیر واپس چلے جانا کا کیا مطلب۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا اور پھر گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول کر مرکزی دروازے کو اندر کی طرف دھکیل کر اس سی اور اچھی دنیا میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

”میں نے پوچھا تھا ٹھیکے دار صاحب ہے۔“ مراد نے چھوٹے صاحب کے قدموں میں بھی سونگی گھاس اور بے ضرر رشک جھاڑیوں پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”اس بار انہوں نے اس جھیل میں پونگد نہیں ڈلوایا تھا جی چھلی کا۔“

اس کی نظریں جھیل کے پانی کی کمرائی میں سے نظر آتے کانے پر جمی تھیں۔ جس کا ایک سرا چھوٹے صاحب کے ہاتھ نے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے چھوٹے صاحب کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر سکوت تھا اور ٹھہرا ہوا بھی۔

”چھلی نہیں چننی جی۔“ مراد نے انہیں یقین دلانے کے انداز میں سر ہلایا۔ ”ہوئی تو چننے کی تا جی۔“

”تم جانتے ہو، میں یہاں آنا چھوڑوں گا نہیں۔“ جواب میں وہ ساٹ لہجے میں بولے تھے۔ ”تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں ادھر مچھلیاں

پکڑنے آتا ہوں۔“ وہ ہلکا سا مسکرائے۔ ”مچھلیاں پکڑنے نہیں آتے تو پھر کیوں جی؟“ مراد نے اس سوال کو الفاظ نہیں دیے تھے لیکن سوال اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا۔

”خود کو، مطلب اپنے آپ کو پکڑنے آتا ہوں میں۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔ ”اور اس میں مچھلیاں بھی پھنسا لیتا ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کاٹنے کی ڈوری ہلاتے ہوئے کہا۔

”مچھلیاں؟“ مراد نا بھگی کے ساتھ بھی کانٹے کو اور کبھی چھوٹے صاحب کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آس کی مچھلیاں، امید کی رنگ برنگ مچھلیاں، آنے والے دنوں کے خواب بٹی مچھلیاں۔ سب چھپتی ہیں، مہرے کانٹے میں۔“ ان کی آواز معمول سے ذرا بلند ہوئی مراد کو بڑا کر رہ گیا۔

”میں نے بتایا نا۔ میں یہاں یوں ہی نہیں آتا۔“ وہ مراد کو گھبراتے ہوئے دیکھ کر مسکرائے۔ ”اب جا کر اپنے ٹھیکے دار کو بتا دینا، وہ چاہے کچھ بھی کوٹش نہ کرے اس جھیل کو آباد رکھنے کی، میں پھر بھی یہاں آتا ہی رہوں گا۔“

”جی۔“ مراد نے احمقوں کی طرح سر ہلادیا۔ ریشماں کو سنانے کے لیے اس کے پاس ایک ٹی کہانی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

صاف چمک دار فرش، جس پر نظریں نہیں قدم بھی جھکتے تھے، پر نظریں جمائے وہ ریسیشن کاؤنٹر کے ساتھ رکھی نرم گداز کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ اسے جبران محمود سے ملنا تھا، وہ ریسیپشن پر بیٹھی جدید انداز میں جی سنوری لڑکی کو وہ اپنی آمد کے ساتھ ہی بتا چکی تھی اور اس کے بعد پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اس لڑکی کو آؤپر بینگ بورڈ پر سجے مختلف رنگوں کے ٹیٹن دیا تے بجانے کہاں کہاں بات کرتا دیکھنے میں مگن تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے جبران

محمود..... میں منٹ کے انتظار کے بعد فاریہ نے گلا کھٹکھا کر کہنے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے یاد ہے۔“ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی تو اس کے گلے میں لٹکتا اسپلائی کارڈ واضح نظر آنے لگا۔ وہ صالحہ تھی، بے حد پراعتماد اور بے نیاز تھی۔

”میں باس کے آفس ہی جا رہی ہوں، انتظار فرمائیے۔“ واپس آ کر آپ کو بتاتی ہوں۔“ اس نے اپنے بسانے میز پر دھری، فائلیں اٹھا کر ان کو میز پر بچھا کر برابر کرتے ہوئے کہا اور اپنے سیاہ بند جوتوں کی اونچی ہیل پر تک تک کرنی کمرے سے باہر چلی گئی۔

”بہت بے وقوف، کم عقل اور بے ذمگی ہوں میں۔“ اس کے جانے کے بعد فاریہ نے ایک بار پھر خود کو لامنت کی۔ وہ کیوں اس وقت اس جگہ پر موجود تھی اس کا اس جگہ اور اس کے مالکان سے کیا لینا دینا تھا۔ مروت اور لحاظ کے مارے یوں کسی کے کہنے پر ایسی ناپسندیدہ جگہ پر کوئی سر پیرا ہی برا بھلا ہو سکتا تھا۔

”چلیں جی، آجائیں میرے ساتھ۔“ باس کے پاس آپ کے لیے چندرہ منٹ خالی ہیں۔“ ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ لڑکی کمرے میں واپس آئی تھی۔

”چندرہ منٹ۔“ فاریہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں ٹھیک چندرہ منٹ، ایک سیکنڈ کم نہ ایک سیکنڈ زیادہ۔“ اپائنٹمنٹ کے بغیر آنے والوں سے باس کسی صورت نہیں ملتے۔“ کمرے سے باہر نکل کر چلتے ٹائیکلر والی ایک طویل راہداری میں چلتے ہوئے وہ بتا رہی تھی۔

”لیکن تمہارا نام سن کر انہوں نے چندرہ منٹ دے دیے، شاید تمہارے ساتھ کوئی پرانی شناسائی ہو۔ کیوں؟“ اس نے رک کر پوچھا تھا۔

جواب میں فاریہ نے ہونٹ میچ کر انکار میں سر ہلادیا۔

”حیرت ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”بغیر اپائنٹمنٹ کے

صرف تمہارا نام سن کر چندرہ منٹ ملاقات کے لیے دیے۔ یقین نہیں آ رہا۔“ رک کر کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

”خیر.....“ اس نے اپنا رخ دائیں طرف موڑتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے دبا کر تھوڑا سا کھول کر پیچھے ہٹ گئی۔ ”جاؤ، باس تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

فاریہ اس کے قریب سے گزر کر نیم واردوازے کو ذرا سا اور کھولتے ہوئے اندر چلی گئی اور اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
اسے گھونٹنے کے دو گھنٹے گزر چکے تھے اور مسعود انور اب اس کی واپسی کے انتظار میں مضطرب ہو رہے تھے۔

”عجب لڑکی ہے۔“ انہوں نے لاؤنج کی دیوار پر فاریہ کی تصویر دیکھتے ہوئے سوچا۔ بنا سوچے سمجھے کوئی بھی کام کر لینے کی ہائی بھر لینا اس کی پرانی عادت تھی۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ اس طرح کے ایڈ وچر میں وہ دو یا تین بار ہی کامیاب ہوتی تھی۔

وہ آہستہ قدموں سے چلتے دیوار کے قریب پہنچ گئے اور فاریہ کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔ یہ اس کے گریجویٹن کا نوڈیشن کی تصویر تھی۔ سیاہ گاؤن میں لمبوس سر پر یونیورسٹی کی مخصوص ٹوپی پہنے وہ ذرا ترچھی کھڑی فوٹو گرافر کی طرف گردن موڑے ہلکا سا مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ردول کیا ہوا کانڈکا وہ ٹکڑا اور آنکھوں میں بے خواب یقینا کسی شان دار مستقبل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک ایسا شان دار مستقبل دو سال گزر جانے کے بعد بھی جس کی شروعات نہ ہو سکی۔ وہ دیوار سے دور ہتھتے ہوئے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ انہیں یاد آیا۔

اس کے کانوڈیشن پر وہ چاہ کر بھی نہیں جاسکے تھے، صرف اسی جبران محمود اور اس کے باپ کی وجہ سے جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ملنے چلی گئی تھی انہوں نے جھلا کر سر جھٹکا۔

”کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ اس لڑکی حرم کو سہولت سے انکار کر دیتی۔ لیکن اب یہ کہاں رہ گئی آخر۔“ انہوں نے بے چینی سے وال کلاک پر نظر ڈالی تھی۔

☆ ☆ ☆
صالحہ اسے جس طرح کمرے میں گھسا کر خود دروازہ بند کر کے جا چکی تھی وہ اس شخص کا ہرگز نہیں تھا جس سے ملاقات کرنے وہ یہاں آئی تھی۔ کسی ماہر انٹریڈیز انٹرنل کے ہاتھوں سے اس شاندار آفس کے وسیع و عریض آفس ٹیبل کے پیچھے ایک بڑی اور آرام دہ آفس چیئر پر ایک چھوٹی اور تکلیف دہ شخصیت بیٹھی تھی، جو پچھلے باج منٹ سے اسے یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک خود سر اور داغ دار باب کی بیٹی کو اپنی کسی ضرورت کی خاطر آخر کار ان کے پاس آنا ہی پڑا تھا۔ وہ بھی اپنے قدموں پر چل کر۔ یہ چھوٹی اور تکلیف دہ شخصیت نمود آور تھے جو رشتے میں اس کے گئے نایا لگتے تھے اور جن کے ساتھ وہ اپنی پیدائش کے بعد کئی سال تک ایک ہی چھت کے نیچے رہتی رہی تھی۔

”دیکھیے میں ان باج منٹ میں پانچویں بار آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں آپ سے ملنے ہرگز نہیں آئی تھی، آپ کی ریسپنشنٹ نے کانوں میں ٹیل ڈال رکھا ہے یا پھر وہ قدرتی بہری ہے، اس کو سنا ہی نہیں دیا کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔“ اس کے ماتھے پر تل اور آنکھوں میں شرارے تھے۔

”اس کے کان بالکل صاف اور سماعت موزیفید درست ہے۔“ بولنے والے کے چہرے پر طنز بھرا ہنس تھا۔ ”ہم اپنے ہاں ہارنگ کرتے ہوئے امیدوار کے جسمانی اور ذہنی طور پر فٹ ہونے کی مکمل جانچ کرتے ہیں۔“

”تو پھر آپ سے جانچ میں غلطی ہوئی ہے۔“ فاریہ نے سر جھٹکا اور واپسی کے لیے قدم موڑے۔ ”جس سے ملاقات کرنے آئی تھیں، وہ تو تمہیں یہاں نہیں ملے گا۔ بہتر ہے جو کہتا ہے مجھ ہی سے کہہ دو۔“ وہ پیچھے گولے۔ ”اگرچہ میں تمہارے

کے بغیر ہی تمہارا مدعا سمجھ چکا ہوں۔“ ”اچھا۔“ وہ واپس مڑی۔ ”تو پھر آپ ہی بتادیں میرا مدعا کیا ہے۔“

”یہاں چھپیں درکار ہی کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے کسی چھوٹی موٹی نوکری کے۔“ ان کی نظر بھری مسکراہٹ میں شخڑا تھا یا حقارت، فاریہ سچ اندازہ نہیں لگا پائی۔ ”کسی پرانے، کھوئے ہوئے ملحق کا، کسی رشتے کا واسطہ دے کر تم سے قائل کرنے آئی ہو ناں کہ وہ کسی پروجیکٹ میں تمہیں ایڈ جسٹ کر لے گا۔“ فاریہ ان کے سامنے کھڑی غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں حیر چلانے کی ان کی عادت ابھی تک نہیں گئی تھی۔

”معلوم نہیں تم نے سائل بن کر یہ سوال جبران ہی سے کرنے کا کیوں سوچا، یہ سوال تو میں بھی سن سکتا تھا اگرچہ میں جبران کی طرح ایک صابر سماع نہیں ہوں۔“ حیر میں ہوں یا جبران۔ ہمارے پاس تمہارے سوال کا ایک ہی جواب ہوتا، سوری۔“ انہوں نے سر جھٹکا۔ ”نی الوقت ہمارے پاس کوئی دیکھنی موجود نہیں ہے، تم جانتے ہوئے ایچی وی دی ریسپنشن پر مجھ کر دیا جاؤ۔ اگر کبھی کوئی ایسی پوسٹ خالی ہوتی جس کے معیار پر تم پوری اتر سکتی ہو تو تم سے ضرور رابطہ کریں گے۔“ ویسے وہ کہاں رہی ہو آج کل، اسی اجازت ویران کالونی میں جہاں رات بھر گیڈرول اور گتوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔“

”نہیں۔“ فاریہ نے سر ہلایا۔ ”میں ایک ایسی کالونی میں رہ رہی ہوں جو گیڈرول اور گتوں کی ہنسی سے خاصی دور اور بہت پرسکون جگہ ہے۔“

انہوں نے بے اختیار پہلو بدلا۔

”رہی بات سائل اور سوال کی تو یہاں آتے ہوئے مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ آپ خود اپنے ہاتھوں بسائی ہوئی جس ہنسی میں آج کل رہ رہے ہیں، وہاں کتے اور گیڈرول کیور اور عام انسان چھوٹے چھوٹے بولنے رہتے ہیں۔ معاف کیجئے گا مہاراج۔“ اس نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ”خدا نہ کرے ہم جیسے

عام ہوں کو آپ جیسے گلیوز سے کوئی کام پڑ جائے، وہ بھی آپ کے کسی پروجیکٹ میں ایڈجسٹمنٹ کا۔“ اس کی آنکھوں سے نکلنے شرارے اب براہ راست ان کو اپنی لپٹ میں لے رہے تھے۔

”ارد گرد کی چکا چوند آپ کی نظر اس قدر کوتاہ کر چکی ہے کہ آپ یہ بھی دیکھنے سے قاصر ہیں کہ زندگی اور اس کا کیوں بہت بڑا ہے۔ انسانوں کے آپس کے معاملات کئی رنگ اور شکلیں اختیار کر چکے ہیں۔ میں بھی آپ کے بیٹے کے کسی ایسے ہی عجیب رنگ و شکل والے معاملے کے سلسلے میں ہی اس سے ملنے آئی تھی۔ مگر نہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”آپ کے دماغ میں لگتا ہے ہمہ وقت آپ کے پروجیکٹس اور ان کی ایڈجسٹمنٹ ہی گول گول گھومتی رہتی ہیں جب ہی ملاقاتی کو مسائل اور اس کے مدعا کو سوال قرار دینے میں آپ کا دل خوب تسلی پاتا ہے۔ آپ کو آپ کی یہ خیالی دنیا مارک ہو۔ آپ اس میں رہتے رہیں میں چلتی ہوں، کیونکہ میرے پاس اس ملاقات کے لیے چندہ منٹ تھے۔ وہ ختم ہو چکے بلکہ چند منٹ اوپر بھی ہو چکے۔ میرے قیمتی وقت کے دس بارہ منٹ ضائع کرنے پر آپ کو کیا کہوں۔ کہ تو بہت کچھ کتی ہوں لیکن آپ عمر میں سید بڑے ہیں اور لحاظ اور مروت میری نگاہ میں شروع سے ہی ڈال دیا گیا ہے کیا کروں۔ خیر چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔“ وہ ایزیوں پر گھوم کر دروازے کی طرف چل دی۔

”سنو! وہ ایک مرتبہ پھر عقب سے بولے۔“ ”کیا کہا تم نے؟“ معاملہ کیسا معاملہ؟“

فارہ نے لمحہ بھر رک ان کی بات سنی اور پھر جواب دیے بغیر دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور کن پٹیاں چھنے لگی تھیں۔ ”گیڈر اور کتے“ ان کے ہاتھ پھڑکے سب سمجھتا ہوں میں سب کا سب ڈاب جسم میں دوڑتا خون بھی کھولنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆ وہ آندھی کی طرح ان کے آفس سے باہر نکلی تھی اور اسی کی رفتار سے چلتی اس دروازے کی طرف بڑھی تھی جس پر انگریزی کے چار حروف ”EXIT“ درج تھے۔ اور اس دروازے تک پہنچتے ہوئے اس نے ایک بار بھی ادھر ادھر نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتی تو فائل ہاتھ میں کھولے کسی کلائنٹ کو اس پر درج کوئی نکتہ سمجھاتے، اسی آفس کی طرف آتے ”جبران محمود“ کو ضرور دیکھ لیتی جو خود اتفاقی نظر اٹھ جانے پر اسے وہاں موجود دیکھ کر بری طرح چونک گیا تھا۔ وہ منتظر رہا کہ جاتے جاتے کسی لمحے فارہ کی نظر بھی اس پر پڑ جائے مگر وہ ناک کی سیدھ چلتی باہر جانے کا دروازہ کھول کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

وہ کچھ دیر یونہی ساکت کھڑا اسے نظروں سے دور جانا دیکھتا رہا اور اس کے غائب ہو جانے پر چونک کر اپنے قریب کھڑے شخص کو فائل تھماتے ہوئے اس کا شانہ چھتیا کر اسے پاس کے آفس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے خود تیز قدموں سے چلتا اس سمت چلا گیا تھا جہاں سے گزردہ آندھی باہر نکلی تھی۔ چند قدم آگے جا کر وہ کچھ سوچ کر رکھا تھا۔ فارہ کے پیچھے جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ ریسپشن روم کی طرف بڑھا تھا۔ اس آفس میں باہر سے آنے والے ہر شخص کی انٹری ریسپشن کے ریکارڈ میں ڈالی جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆ مروت میں آکر اور انسانیت کی خاطر مدد کے جھنڈے ہاتھ میں بلند کیے سر کی جانے والی وہ پانچویں مہم تھی جس میں اس روز وہ بری طرح ناکام ہو کر واپس لوٹی تھی مگر واپسی کے سفر میں میٹرو بس کی وہ آرام دہ سیٹ اسے مل گئی تھی جو کھڑکی کے ساتھ تھی اور جس پر بیٹھ کر وہ اس جدید شہر کی سڑکوں

راستوں اور بلند و بالا عمارتوں کا نظارہ کر سکتی تھی یہ اور بات کہ اس کی نظرسے منظور پرچی تھیں لیکن دھیان نہیں اور تھا۔ وہ شان دار دفتر، اور اس کی آفس میز پر بیٹھا وہ شخص سے وہ سر کر بھی ملاقات کی طلب گار نہ ہوتی اور اس کا وہ سمجھنا اور غرور اس کے دماغ میں جیسے گڑے گئے تھے۔

مسائل اور سوال، گیڈر اور کتے اس کا حلق کڑوا ہونے لگا تھا۔ دوسروں کو لیٹ ڈاؤن کرنے کا شوق تو انہیں اس وقت بھی تھا جب وہ ریلوے کے محکمے میں بطور سپروائزر کام کرتے تھے۔ محکمے کی کسی ایسے گھرانے تھے جو ان کے خیال میں ذات کے کی کمین تھے اور دولت کے عمل پر اپنے نام کے ساتھ فلاں، ڈھکال کی تختیاں لگائے بیٹھے تھے۔ اپنے حسب نسب پر غرور بھی سدا سے ہی تھا۔

یہ اور بات کہ آج ہمارے طبقاتی اور بلندی کے لحاظ سے ”مڈل کلاس“ کے زمرے میں ڈھکیل دیئے گئے لیکن ہمارے بزرگ ہمارے آباؤ اجداد رئیس الرکسا جانے جاتے تھے۔

فارہ نے ان کو اکثر ہنساتے سنا تھا۔ شاید انسان کے دل میں بیٹھی خواہش بھی اتنی طاقت پکڑ سکتی ہے کہ قسمت بھی اسے پوری کرنے کا ارادہ کر سکتی ہے۔ اس روز وہ ان کے دل میں بیٹھی خواہش کے پورا ہونے کے بعد کا نظارہ کر کے آئی تھی۔

داوا کے مکان کی فروخت اور ان سے جدا ہو جانے کے بعد اس کا ان سے یہ پہلا آمتنا سامنا تھا۔ وہ ان کے بارے میں کیا گمان کر سکتی تھی۔ اس نے سڑک کے اس پار ایک اونچی عمارت کی جھللائی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ کبھی وہ اسے دیکھ میں تو ”وہ میری جان سے پیاری بیٹی“ کہتے ہوئے اسے سینے سے لگائیں گے۔ ”ہونہا“ اس کے چہرے پر طر بھری مسکراہٹ ابھری۔

لیکن اسے ان سے ملاقات کی خواہش ہی کب تھی وہ تو اونہا بیٹے نے کون سا باپ سے مختلف

سواگت کرنا تھا۔ وہ تو شاید ملاقاتی کا نام سن کر چندرہ منٹ تو کیا ایک لمحہ بھی دینے سے انکار کر دیتا۔ اسے ایک بار پھر نئے سرے سے غصہ آیا۔

بھاڑ میں جائے حرم خرم خان کا عشق مجبوب کے فراق میں روتے روتے چاہے وہ اتنے اشک بہائے کہ پورا شہر ان کی زد میں آکر ڈوب جاتا اس کی بلا ہے۔

اس نے غصے کے مارے اگلی سیٹ کو جوتے سے ٹھوک ماری! مگر ایک وہ بھی تھیں جو اسے اور بہت سے بچے کی باتوں کے ساتھ ایک بچے کی بات یہ بھی بتایا کرتی تھیں کہ کبھی کسی مصیبت کے وقت میں اگر شاہ، گداہن کر دروازے پر کھٹکول لیے آن کھڑا ہوتا یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ تو خود بادشاہ ہے اسے ہماری مدد کی کیا ضرورت یا یہ سوچ کر کہ جب یہ بادشاہ تھا تب ہماری کون سی مستی تھا اسے جب تک نہیں دینا چاہیے۔

اس نے نظر کے سامنے آئی بیٹی اس شبیہ سے ناراض ہوتے ہوئے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا سب کی سب نصیحتیں مجھے ہی کر گئیں۔ کاش چار اچھی باتیں اپنے شوہر اور بیٹوں کو بھی سکھا جاتیں۔

”بات تو اسی سے کروں گی تا جس کے کان سنتے ہوں۔ جو ہوں ہی کانوں کے بہرے انہیں کیا سناؤں۔ اشاروں کی زبان مجھے آتی نہیں۔“ ایک دو بار ہنستے ہنستے انہوں نے نجات کس کو بتایا تھا اپنے شوہر کو یا پھر کسی بیٹے کو یہ یاد آیا اور اس کا دل مزید بو جھل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆ ”سر میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ پاس سے نہیں آپ سے ملنے آئی تھی۔ اس لڑکی کا نام۔“ ریسپشن سالن نے اس دن کے ملاقاتیوں کی فہرست پر نظر دوڑائی۔ فارہ، بیٹی فارہ یہ سہو، یہی نام تھا اس کا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے جبران کو بتایا جو اس کے جواب کا منتظر تھا۔

”مجھ سے ملنے آئی تھی تو وہ وہاں کے آفس سے کیوں باہر آئی نظر آئی۔“ جبران کے چہرے پر درشتی

اتری۔

”پاس نے مجھے آپ سے رابطہ کر کے آپ کو میٹنگ روم میں جانے کی یاد دہانی کا بلا تھا۔ میں نے انہیں صرف اتنا بتایا کہ آپ کے لیے ایک ملاقاتی میرے پاس بیٹھی ہے جس سے ملاقات اگر آپ کرتے تو میٹنگ میں چند منٹ لیت ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جھلا کر بغیر اپائنٹمنٹ کی ملاقاتی کا تعارف مانگا۔ میرے بتانے پر انہوں نے کہا اسے میرے پاس بھیج دیں۔“

صالح نے مکا کی انداز میں کارروائی دہرائی۔ ”بھیک منگے، خبریاتی، کچھ ایسے الفاظ بھی پاس نے بولے تھے غالباً اسی لڑکی کے لیے۔“ کارروائی کا اگلا ناکا اس نے اپنے پاس سے لگایا تھا۔ اس قسم کے جیلے اس کے نزدیک دلچسپ گوسپ بن سکتے تھے۔ ”ہوں ا“ جبران نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے سر جھٹکا۔ ”آئندہ خیال رکھنا، مجھ سے ملاقات کے لیے آنے والوں کے نام، پتے ادھر ادھر ڈس کوز کرنے کے بجائے صرف مجھ ہی تک پہنچنے چاہئیں یا پھر تمہاری اس اینٹری بک تک محدود رہیں تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔“

”میں بہت خیال رکھتی ہوں سر، صالح نے خود کو کلیئر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لڑکی حرم خرم خان نہیں تھی۔ اس کا نام فارہ سود تھا اور یہ نام آپ کی بتائی بلک لسٹ میں شامل نہیں تھا۔“

”یہ نام اس لسٹ میں شامل تو جب ہوتا جب مجھے گمان بھی ہوتا کہ فارہ مجھے ملے یہاں آنے کا قصد کر سکتی ہے۔“ جبران نے یہ جواب خود کو دیا اور صالح پر صرف ایک تیز نگاہ ڈال کر ریشٹن روم سے باہر آ گیا۔

”وہ مر سکتی تھی لیکن اس آفس میں مجھ سے کیا کسی چرچی سے ملے بھی نہیں آ سکتی تھی آج کیوں، کیسے۔“ اس کی آمد اور مقصد یہ سوال جبران کے ذہن سے چپک چپکے تھے۔

☆☆☆

”پھر یوں ہوا کہ یہ جو ہمیں پہلے سے معلوم تھا۔ اب اس نے اسے گلے میں پڑا اس کا رفاہ انداز کھڑکتے اور تہ کر کے وارڈ روم میں واپس رکھتے ہوئے دیکھ لیا۔

”آپ مزہ لینے کے موڈ میں ہیں۔“ فارہ کے لہجے میں ناراضی اتری ”ہرگز نہیں۔“ انہوں نے سادگی سے سر ہلایا۔

”میں تو بلکہ تم سے کوئی تفصیل سننے کے موڈ میں بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ بغیر سے سب جانتا ہوں۔“ ”اچھی بات ہے۔ مجھے کچھ سنا نا بھی نہیں۔“ وہ نزوٹھے پن سے بولی۔

”سچ ہے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھے ”چینج کر لو تو کچن میں چلی جانا۔ مراد بک سے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے۔“

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے بیڈ کی چادر اٹھا کر اسے جھاڑتے ہوئے، ہیڈ سائیکل پر سے چیزیں اٹھا کر بیچ کر واپس رکھتے ہوئے اپنا قصہ اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک فضول سی مروت کے چپچپے اس کا وقت برباد ہوا تھا۔ جبکہ اس روز اسے فارہ یا ز آل ان ون کے لیے آلو موگرے بنانے کے علاوہ کچھ ہونے دووہ سے خبر بنانے کا مظاہرہ بھی کرنا تھا۔

☆☆☆

لاٹری لکٹا، جبکہ پاٹ ہاتھ آ جانا، سونے کی چڑیا پر ہاتھ پڑ جانا، سونے کی کان کا نکل آنا جیسی باتیں عموماً ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کی جاتی ہیں جو اتفاقاً یہ طور پر امیر ہو جاتے نظر آتے ہیں۔

محمود صاحب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جاتا تھا۔ اپنی وفا شعار اور سکھڑی پوری کی بچت کے نام پر بیسٹ بیسٹ کر رکھے پیسوں کو ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں لگا دے تھے چند ہی مہینوں کے بعد ان کی برسوں سے ایک جیسی چلتی قسمت نے چپکنے کا کردیا۔ یہ انکشاف پہلے پہل خود ان ہی پر ہوا تھا اور

کئی روز تک انہیں اس پر یقین نہیں آیا تھا۔ یہی انہوں نے اس کا تذکرہ کسی دوسرے سے کیا تھا۔

پھر چند اور مہینوں کے بعد جب انہوں نے اپنے بینک اکاؤنٹ کی اسٹیٹمنٹ دیکھی تو انہیں احساس ہوا کہ ہمیشہ کے پڑھے ہوئے جیلے ہواؤں میں اڑنا۔ والی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔ ان کا ہاتھ آسان اور کشادہ ہو رہا تھا۔ پیسہ بارش کی طرح ان پر برساتا تھا۔

ان کی خوشی اور ان پر چھائی سرمستی کی کیفیت دیکھتے ہوئے ان کے دوست نے فوراً انہیں بتایا کہ ان کی پہلے والی رقم تو محدود تھی اسی لیے منافع بھی محدود تھا اگر وہ ایک بڑی رقم اس کے کاروبار میں لگا دیں تو ایک سال کے اندر اندر لکھ چھوڑ کر دوپٹی بھی بن سکتے تھے کیونکہ یہ کاروبار سکنت عملی اور کام سے زیادہ قسمت پر چلتا تھا۔ چند مہینوں میں پہلے سے کہیں زیادہ حاصل کردہ معاشی استحکام مسعود صاحب کو مزید کے حصول والے راستے پر چڑھ چکا تھا۔

”بڑی رقم!“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ”بڑی رقم کہاں سے آ سکتی تھی۔“ انہوں نے اپنے گھر کے اندر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ جس میں وہ اپنی، تین بیٹوں، ایک چھوٹے بھائی اور ایک بیٹی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان کے بیٹے کالج، پونیورسٹی جانے کی عمر میں تھے اور بھائی یونیورسٹی پر ویس تھا۔ وہ خود ایک بڑے بینک میں اسٹنٹ منیجر کی نوکری کر رہے تھے۔

گھر ان معاشی طور پر بہت مستحکم نہ سکی۔ لیکن اچھے حال کی زندگی گزارتا تھا۔ گھر کا ہر فرد ایک دوسرے سے ڈھنی اور جذباتی وابستگی رکھتا تھا۔ محبت، پیار اور خلوص آسودگی کا احساس قائم رکھے ہوئے تھے۔ جس گھر میں وہ رہ رہے تھے وہ ان دونوں بھائیوں کو دراخت میں ملا تھا۔ پہلے وقتوں کا پتا وہ گھر دستا اور کشادہ تھا۔ جس علاقے میں وہ گھر واقع تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہاں جائیداد کی قیمتیں دوسرے علاقوں سے کئی گنا بڑھ چکی تھیں۔ ”بڑی رقم“ کے نام پر مسعود کی صاحب کی نظریاتی گھر پر تھی۔ اور

جب انہوں نے اپنی خواہش کو گھر میں الفاظ کی شکل میں ظاہر کیا تو۔ برسوں سے سکون سے چلتا زندگی کا نظام ورہم برہم ہو گیا تھا۔

دراشت میں ملے اس گھر کی فروخت کے خواہش مند اور ان کے بھائی اور ان کے درمیان ایک بڑی خلیج بن کر حائل ہو چکی تھی۔ ان کا بھائی کسی صورت وہ گھر بیچنے کو تیار نہیں تھا اور انہیں ہر صورت وہ گھر بیچنا تھا۔ پہلے پہل ان کی بیوی اور بیٹوں نے بھی ان کی خواہش کی بھرپور مخالفت کی تھی لیکن بیٹوں کی آنکھوں میں وہ ایک خوش حال مستقبل کے خواب سجانے میں آسانی سے کامیاب ہو گئے تھے۔ البتہ ان کی بیوی، جو دیوڑھی اس گھر سے جذباتی وابستگی کو خوب سمجھتی تھی ان کی خواہش کی مخالفت کرتی رہی تھی۔

”ہم اس گھر کو فروخت کر کے پہلے کسی اچھے علاقے میں ایک عمدہ گھر کرائے پر لے لیں گے اور پھر ان شاء اللہ جلد ہی ہم اس حیثیت میں ہوں گے کہ اپنے لیے نیا گھر خرید سکیں۔“ انہوں نے بھائی کو قائل کرنے کے لیے کہا تھا۔

”کوئی بھی دوسرا گھر اس گھر کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ جس کی ہرائٹ کی خرید میں میرے باپ کی خون پسینے کی کمائی لگی ہو۔ میرے باپ نے عمر بھر کی محنت سے کمائی اور بیٹائی رقم اس گھر کو بنوانے میں لگا دی۔ مجھے یاد ہے اس کی تعمیر انہوں نے کس شوق سے کروائی۔ اور امان سے کس شوق سے اس کا کوٹا کوٹا ستوارا۔“ انہوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں اس کو کسی بھی مول نہیں بیچوں گا اور میں اسے کیوں بیچوں جبکہ مجھے یہاں کوئی تکلیف بھی نہیں ہے میں یہاں خوش ہوں اور محفوظ بھی۔“

”اچھا تو پھر ایسا کرو۔ اس کی قیمت پتا کروالو اور اس قیمت کا نصف مجھے دے دو۔“ محمود صاحب مسعود کے سختی سے کے انکار پر ہلکا اٹھے۔ ان کی نظروں میں انتہائی خوش حال مستقبل کے خواب سجے تھے جن کی ان کے بھائی کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں تھی جبکہ وہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے خوش حال مستقبل میں

اسے حصہ دار بنانے پر بھی پوری طرح راضی تھے۔
”وہ میں نہیں دے سکتا کیونکہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔“ وہ ہنسنے پر تیار تھا۔

”تو پھر میرے پاس اس کو فروخت کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔“ مسعود کے لہجے کی چیراوری اور بے نیازی نے انہیں بری طرح تباہ کیا تھا۔ کبھی غصہ تھا جسے اسودہ اور خوشحال مستقبل میں کسی قسم کی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”اور میرے پاس آپ کی خواہش کے راستے کی رکاوٹ بننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ مسعود کی بے نیازی عروج پر پہنچ گئی۔

”یہ میں نہیں جانتا ہوں کہ کیسے رکاوٹ بننے ہیں کسی کی خواہش کے راستے میں۔“ وہ پوری طرح بھڑک چکے تھے۔ جب ہی دانت پیس کر جواب دے رہے تھے۔

انہیں کاروبار کرنے اور دو بیٹے مزید جمع کر کے چار بنانے کی لت لگ چکی تھی۔ خالی بینک اکاؤنٹ کی تفصیل میں امداد کے ساتھ بڑھتے سفر، مزید مزید کی پیاس بھڑکا چکے تھے۔ انہیں ہر حال میں سرمایہ درکار تھا اور سرمائے کا حصول صرف وہ گھر بچ کر ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ انہوں نے گھر کے خریدار تلاش کرنے شروع کیے۔ مسعود ہر خریدار کے سامنے اپنے حصے کا علم اٹھائے ڈٹ جاتا۔

محمد صاحب نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ جو بھی سیدھی انگلیوں سے نہیں ہوتا اسے انگلیاں ٹیز کر کے نکالنا پڑے تو کرکٹیں چائیں۔ اپنے شراکت دار دوست کے مشورے سے والد کے وصیت نامے میں ناقابل تردید اور قانونی حیدر بنی کرانے کے لیے انہیں تھوڑی بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ ترمیم شدہ وصیت نامے کے مطابق باپ کی چھوڑی جائیداد میں مسعود صاحب بڑے بھائی کے فیصلے کے پابند قرار پائے تھے۔ محمد صاحب، ضرب، جمع، تقسیم کے ماہر بن چکے تھے اور مسعود صاحب کو اپنے طالب علموں کو فلسفہ پڑھانے کے سوا کوئی کام نہ آتا تھا۔

کے وہ ماہر تھے مگر حساب کتاب کے کھبے اور قانون سے سراسر ناواقف۔ ہزار بار کا پڑھا وصیت نامہ ان کی نظروں کوئی کہانی بنا رہا تھا لیکن قانون کا شہسوار کی ہر منطق اور دلیل کی ٹٹی کرنے کو کافی تھا۔

”یہ وہ اس قدر ششدر تھے کہ الفاظ ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور ہاتھ کاٹنے لگے تھے۔ انہوں نے بے یقینی سے صرف ایک بار اپنے بڑے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ فتح و شادمانی کے احساس سے تھمارا ہوا تھا۔

مسعود صاحب کے بھائی نے ان کے علم اور اصول کو ایسے محاذ پر ٹھکرت دی تھی جہاں سکندر کو بھی قانع ہوتے ہوئے اخلاقی طور پر اپنے ہتھیار ڈال دینے پڑتے۔

وہ جس کی اینٹ اینٹ میں ان کے باپ کی خون پسینے کی کمائی لگی تھی جس کے کونے کونے سے انہیں صرف محبت نہیں شدید عقیدت تھی۔ ان کی نظروں کے سامنے نکا، ایک معقول رقم ان کے حصے کے طور پر ان کو تھما دی گئی کہ اس رقم کے عوض اس گھر سے ہمیشہ کی بے دلی اور خون کے رشتوں سے ہمیشہ کی حر دی ٹھہری۔

گھر سے بے دلی محمد صاحب نے ان کی قسمت میں لکھوا دی تھی اور رشتوں سے حر دی ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ ان کے یقین پر دان دہائے ڈاکا ڈال دیا تھا۔ انہوں نے ذکیت پر پرچا کھانے اور اسے سزا دلوانے کے بجائے ہمیشہ کے لیے اس سے کنارہ کر لینے کو ترجیح دی تھی۔

☆☆☆

بھائی بھی جب اس گھر سے نکلے تو یوں کہ گھر کا سامان مکمل ہزارے کے بعد الگ الگ بندھا دو الگ الگ ٹرکوں پر لدا تھا۔ دونوں بھائی رخصت ہوئے تھے لیکن ایک دوسرے سے ایک بار بھی نظر نہیں ملائی تھی۔

اس ہزارے اور بھائیوں میں دوری کی اصل وجہ کیا ہوئی تھی یہ بہت سے البت پھر بھی جان نہ پائے تھے کیونکہ محمد صاحب کسی کو اپنی کارستانی سنا نہیں سکتے تھے اور مسعود صاحب کو اپنی انا اور خودداری بہت عزیز تھی۔ انہیں کسی کے سامنے شکوہ کتنا اور واو بلا بھی اپنی بے عزتی لگتا تھا۔

اس علیحدگی کو آٹھ برس بیت چکے تھے۔ محمد صاحب اپنا سامان اور بال بچے اٹھائے ایک بڑی کالونی میں بنے بڑے گھر میں بطور کرایہ وار رہائش پزیر ہوئے اور مسعود صاحب ایک عام سے علاقے کے مختصر سے مکان میں کرایہ پر رہنے لگے۔ محمد صاحب کے خوابوں کو حقیقت میں ڈھلنے میں ڈیڑھ دو سال کا عرصہ مزید لگا۔ محنت، منصوبہ بندی، بہترین حکمت عملی وقت سکھاتا چلا گیا اور ترقی ان کے قدم چوٹی چلی گئی۔

مسعود صاحب کی ضد اور انا پسندی کے حصے میں شہر سے ہٹ کر ایک ایسی کالونی جو تو سب سے بڑے شہر کے اندر ہی آج بھی گھر بنایا آیا۔ وہ پہلے بھی خاموش طبع انسان تھے بھائی کے نظریں پھیر لینے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ کم کو ہوتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ انہیں گھر کی ذمہ داریوں اور ان کے سلسلے میں کسی بھاگ دوڑ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سب کام ان کا بھائی اور بچے نبھالیتے تھے اور خود وہ مزے سے صرف نوکری کرتے تھے۔

تھا۔ ایک ایسا دوست جس سے کوئی بھی بات بلا جھجک کی جا سکتی تھی۔ ایسے لاڈلے اور بے فکر مسعود صاحب کو جب نئے گھر کی تعمیر بھاگ دوڑ اور شہر کے ایک کونے سے دوسرے انتہائی کونے تک کا سفر کرنا پڑا تو آدھی صحت تو وہیں خراب ہو گئی۔

اگرچہ گھر کی تعمیر کی ذمہ داری ایک دیرینہ دوست نے اپنے سر لے لی تھی جو اتفاق سے ٹھیکے دار تھا لیکن نگرانی تو بہر حال کرنا پڑنی تھی۔ پھر جوان ہوئی بیٹی کی ذمہ داری الگ تھی۔ قاریہ کا کاج جانی تھی اسے وہاں چھوڑنا اس کی واپسی کا بندوبست، خود اپنی نوکری، بھائی کا پلٹ کر خبر نہ لینا۔ بچیوں کی بے اعتنائی۔

مسعود صاحب کی عمر اتنی نہیں تھی دو سال کے اندر جتنے بوڑھے وہ دکھائی دینے لگے تھے۔ نئے گھر میں قفل ہونے کے ٹھیک ڈھائی ماہ کے بعد وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے۔ علاج، دوا دارو کا تیا چکر شروع ہوا۔ پیار دل زندگی سے اجاٹ ہونے لگا۔ قاریہ اور دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی۔ اور ریٹائرمنٹ کے بعد تاحال نوکری ہی نہیں ہر مشغلے سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔

دوسری طرف محمد صاحب ہر نئے دن کے ساتھ پہلے سے زیادہ جوان دکھنے لگے تھے۔ بہترین طرز زندگی، صحت مند خوراک، ہاتھ میں آئی دولت میں دن بدن اضافہ وہ رئیس کہلانے لگے تھے۔ شہر کی بڑوں سے تعلق بڑھ گیا تھا۔ سب سے بھگی کالونی میں کل نما گھر اور شہر سے باہر ایک بڑے فارم ہاؤس کے مالک بن چکے تھے۔

دو بڑے بیٹے تعلیم سے فارغ ہو کر ان کے ساتھ کاروبار میں بھی مصروف ہو چکے تھے۔ تیسرے بیٹے کا داخلہ شہر کی بہترین یونیورسٹی میں ہو چکا تھا۔ بڑے دو بیٹوں کی نسبت ان کی امیدیں تیسرے بیٹے سے زیادہ وابستہ تھیں۔ وہ لائق فائق اور ذہین تھا۔ گھنٹوں میں سمجھا آنے والی بات منٹوں میں سمجھتا تھا۔

برنس کے سلسلے میں ان کے ساتھ شامل ہونے سے کہیں پہلے سے انہیں مشورے دینے لگا تھا اور اس کے مشورے ہمیشہ ہی بہت سودمند ثابت ہوتے تھے۔ ایسے کانیاں اور ذہین بیٹے پر وہ جتنا بھی غر کرے تم تھا۔ اگرچہ یہی ان کا وہ بیٹا تھا جو پہلے ان کی نسبت اپنے چچا سے زیادہ قریب تھا۔ اسکول کے زمانے میں بھی کسی ٹیوشن سینٹر جانے کے بجائے گھر پر چچا سے پڑھا کرتا اور اسکول کے بعد تو اس نے داخلہ بھی اسی کالج میں لیا تھا جہاں چچا پڑھاتے تھے۔ ان کی بیوی اکثر کہا کرتی۔

”جبران چچا کا عاشق ہے یا چچا جبران کے میں کبھی فیصلہ نہیں کر پاتی۔“ اسی بیٹے سے انہیں خدشہ تھا کہ چچا سے دوری پر احتجاج کرے گا۔ ان کی توقع کے برعکس ایسا نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ زندگی کو بھول جانے والوں میں جبران سب سے آگے تھا۔ وہ اپنی طرز زندگی اور آسائشات سے بہت خوش تھا۔ اب اس کا باپ اس کا رول ماڈل بن چکا تھا۔

”آپ جو حاصل کرنا چاہتے ہو اسے حاصل کرنے کا بہترین کلیہ ”لیڈنگ فرام وی فرمٹ“ ہے۔ باقی لوگ خود بخود آپ کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ آپ بھی سب سے آگے چلنے کے عادی ہیں۔ اسی لیے کامیابی آپ کے پیچھے چلتی رہی۔ اور آپ کی اس ہی عادت نے مجھے آپ کا یقین بنادیا۔“ وہ کئی بار انہیں بتا چکا تھا۔ اس کی ایسی باتیں سن کر محمود صاحب کو اپنے افعال پر مزید غر محسوس ہونے لگا تھا۔ چچا تو اب بھی ان کے قریب بھی پٹنگ نہ پایا تھا۔

☆☆☆

وہ اسی دن کی شام بھی جب محمود اتفاقاً فرصت کے باعث اپنے گھر کے لاونچ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب جبران ان کے پاس آیا تھا۔ ”صبح فاریہ آفس میں آئی تھی؟“ اس نے کوئی تنہید باندھے بغیر ان سے سوال کیا تھا۔

”ہاں! جبران کو یہ خبر کس نے دی تھی وہ حیران ضرور ہوئے تھے لیکن انہوں نے اس حیرت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سادہ سا جواب دیا تھا۔ ”کیوں؟ وہ کیوں آئی تھی؟“ وہ ان کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”اور ایک بات اور آپ سے ملنے تو نہیں آئی تھی غالباً وہ مجھ سے ملنے آئی تھی؟“ اس نے یہ سوال اس طرح کیا تھا جیسے اسے خود کو ملنے والی خبر کا یقین تھا لہذا وہ اسے ٹال نہیں سکتے تھے۔

”ہاں پھر؟“ انہوں نے جاننا چاہا تھا وہ ان سے دراصل کیا پوچھنا چاہتا تھا۔

”پھر یہ کہ میرے بجائے آپ اس سے کیوں ملے؟“ انہیں جبران کے لہجے نے ایک مرتبہ پھر چوٹا دیا تھا اور اس بار بھی انہوں نے اپنی حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس سے میں ملایا تم، ایک ہی بات ہے۔“

”ایک بات تو نہیں ہے۔ اگر فرق نہ پڑتا ہوتا تو وہ کہہ سکتی تھی کہ اسے کسی سے بھی ملوایا جائے۔ آپ کا مران، عثمان یا میں، کسی سے بھی۔“ وہ ناراض تھا یا الجھا ہوا محمود صاحب اندازہ نہیں کر پاتے۔

اس نے سر جھکا۔ ”کیا آپ بتائیں گے کہ وہ کیوں آئی تھی؟ کس سلسلے میں؟“

”اس سوال کا جواب تو تمہیں بغیر پوچھے ہی معلوم ہونا چاہیے تھا۔“ وہ مسخراڑانے کے انداز میں بولے۔

”میں اتنا ذہین ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا۔“ وہ الجھا نہیں اکھڑا ہوا تھا اب کے انہیں ٹھیک سے اندازہ ہو گیا۔

”کمال ہے اتنی سادہ سی بات نہیں سمجھ پاتے تم۔“ وہ جبران کے لہجے سے دل میں پیدا ہونے والی گھبراہٹ کو چھپانے کی خاطر ہنسنے۔ ”مسائل کی کمی اور مسائل کے انبار نے ایک نیا کیل روز اسے ہماری طرف آنے پر مجبور کرنا ہی تھا۔ مجھ، آج وہی ایک

روز تھا۔

”نہیں!“ اس نے سختی سے کہا۔ ”اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فاریہ اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے یا گھر ہم سے مدد مانگنے کی خاطر۔ نہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ بھی نہیں۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔“ اس کے لہجے کا یقین محمود صاحب کو آگ لگا گیا۔ ”جانتے بھی ہو کس حال میں زندگی گزار رہا ہے پھر میں۔“ ان کا اپنا بیٹا ان کی بات پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ وہ جتنا بھی چپے کم تھا۔

”تمہاری نسل اور تمہارے مقابلے میں اس نے بیٹی کو منگی پوند رشتی سے منگی ترین ڈگری تو دلوالی لیکن پھر اس کے آگے کیا۔ بتاؤ کیا آپشن تھا اس کے پاس۔

”کس کوئی چاہ لی اسے؟ نہیں نا۔“

”چار پیسے جو مسعود کے پاس بچے تھے انادہ بھی ضائع ہو گئے اس ڈگری کے حصول میں۔“ وہ استے غصے میں تھے کہ مسخراڑاتے ہوئے مسکراتا بھی بھول گئے۔

”یہ سب میری بات کا جواب نہیں ہے۔“ جبران نے متاثر ہونے سے انکار کیا۔ میں آپ سے صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ فاریہ آج صبح ہمارے آفس کیوں آئی تھی۔ وہ بھی مجھ سے ملنے۔“

”نہی بتا رہا ہوں۔ اسے نوکری دور کا تھی جس کی کوئی دستخطی ہمارے ہاں آج کل دستیاب نہیں۔ میں نے اسے سی وی ڈراپ کرنے کا بول دیا اور بتا دیا کہ جب بھی اس کی صلاحیت سے ملتی جلتی جگہ خالی ہوئی اسے بلا لیں گے۔“ وہ رکھائی سے بولے اور قریب رکھاڑ موٹ اٹھا کر بی بی آن کیا۔

وہ کچھ دیر بے یقینی سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔

خدا جانے اسے سرد کار فاریہ کے آنے سے تمایا اس سے ملنے آنے پر تھا۔ جو بھی تھا ان کے نزدیک یہ ایک بے کار موضوع تھا جس پر بات کرتے ہوئے استے منٹ ضائع نہیں ہونے چاہیے تھے جتنے کیے گئے تھے۔

☆☆☆

”فاریہ بھوکى مرکتى ہے۔ نوکری مانگتے ہمارے آفس نہیں آسکتی وہ بھی میرے پاس۔“

یہ بات جبران نے محمود صاحب سے بات کرنے کے بعد عذرا یعنی اپنی ماں سے کہی تھی جو اس روز پہلی منزل کی طرف چڑھتی سڑکیوں کے نیچے جائے نماز بچانے نماز پڑھنے کی تیاری میں تھیں۔ ہر روز گھر کے کسی نئے کونے میں نماز پڑھ کر اسے پاک کرنا ان کا معمول تھا۔ نمانے کیوں اتنے برس گزر جانے کے باوجود انہیں گھر میں آئی دولت کے حلال ہونے کا یقین کیوں نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ ان کا شوہر اور تینوں بیٹے قسم کھا کر انہیں یقین دلانے میں مصروف رہتے تھے کہ وہ چاروں تن سن دھن کے ساتھ محنت کر کے وہ روپیہ کماتے تھے سادہ کے دل سے یہ شک شاید اس لیے نہیں جاتا تھا کہ وہ جانتی تھیں کہ اس حلال رزق کی بنیاد بددیانتی زیادتی اور دھوکے پر ڈالی گئی تھی۔ اب وہ چاروں بیٹے بھی محنت کا دعویٰ کرتے بنیادی غلط ہو تو عمارت کیسے ٹھیک ہو سکتی تھی سو وہ اپنے شک کو عبادت کے جھوٹے میں جھلا کر سلانے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔

”ارے تم معلوم تو کرو۔ کیا خدا نخواستہ وہ لوگ کسی ایسی مشکل میں ہوں کہ بیٹی کو نہ مانگے ہوئے بھی آنا پڑ گیا۔“ جبران کی بات سن کر وہ بھی ٹھیک گئی تھیں۔

”تو آپ فاریہ کو نہیں جانتیں۔ یا چچا کو؟“ جواب میں اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ آپ کو لگتا ہے کہ سخت سے سخت مشکل میں بھی وہ ہم سے مدد مانگنے ہماری طرف آئیں گے۔ نہیں امی ایسا ممکن ہے۔“

”تمہارا خیال ہے تمہارے ابو کچھ چھپا رہے ہیں یا غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔“ ”یہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے سر ہلادیا۔ ”میں صرف اتنا جانتا چاہتا تھا کہ فاریہ مجھ سے ملنے آفس کیوں آئی اور یہ وہ مجھے بتا نہیں رہے۔“

”دوبارہ مت پوچھنا ان سے۔“ وہ جائے نماز پر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ اگر وہ خاص تم سے ملنے آئی تھی اور اسے تم ہی سے کوئی کام تھا تو دوبارہ کوشش کرے گی۔ انتظار کرو لیکن اپنے ابو سے دوبارہ ذکر مت کرنا۔ انہیں برا لگے گا۔“

اسے سمجھا کر انہوں نے نماز کی نیت باعدہ لی تھی لیکن جبران کا ذہن ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔

”ہوں! کچھ دیر وہیں کھڑے رہنے کے بعد اس نے سوچا تھا شاید ای ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ ضرورت ہوگی تو دوبارہ آجائے گی۔ مجھے ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کمال ہے۔ میں کس نقیشت میں پڑ گیا اور وہ بھی کس کے لیے۔ فار یہ مسودہ! اب کے اس کے ہونٹوں پر بھی تسخرانہ مسکراہٹ ابھری دنیا کا ہر دوسرا کام جس سے زیادہ اہم ہے۔“

فار یہ نے تیار آلو مونگرے سفید رنگ کی ڈش میں نکالے۔ سفید برتن میں ڈالا گیا کھانا صاف اور واضح دکھائی دیتا تھا۔

”آلو مونگرے کی سبزی کو ڈش آؤٹ کرنے کے بعد ہم اس کو باریک کٹے ہر ادھیا اور ہری مرچ سے گارنش کریں گے اور لیچے جناب ہماری مزے دار اور خوش رنگ آلو مونگرے کی سبزی تیار ہے۔“ وہ قمیض کے کالر پر لگے مائیک میں بول رہی تھی۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر چہرے پر مسکراہٹ بکھیری، اسے اپنے چمیل کو بسکراہٹ کرنے اور تیل آنگیوں کا ٹنن دبانے کا پیغام دہرانا تھا لیکن اس کی قسمت اسے یہ پیغام دہرانے کے بجائے مائیک بند کر کے مراد پر چلا نا پڑ گیا تھا۔

”کیمبرہ سیدھا رکھو مراد، تمہاری اسی لاپرواہی کی وجہ سے شیلڈز اور کلرڈ بگڑ جاتے ہیں۔“ دانت پیستے ہوئے بولی تھی۔

”میرا کوئی قصور نہیں باجی۔ کیمبرے کی اپنی کوالٹی ہلکی ہے۔“ مراد نے کئی بار کہا جلد دہرا تھا۔ ”کیمبرے کی تو نہیں تمہارے دماغ کی کوالٹی ضرور ہلکی ہے۔“ وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر مراد کی

طرف آئی تھی۔ دوبارہ کیمرا سیٹ کر کے مراد کے ہاتھ میں دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنی پوزیشن پر واپس جا کر لاوڈی جیلے دہرائے گی۔

”دودھ اچھی طرح ابال دیا ہے باجی! ویڈیو مکمل کر کے ایک بار پھر مائیک اتار دینے کے بعد وہ کچن میں رکھے اسٹول پر بیٹھی ہی تھی کہ ریشماں دودھ سے ہمراہین اٹھا کے کچن میں داخل ہوئی۔

”میں اب اس میں ثقافت کیوں کارں ڈال لیتے ہیں۔“

”اوہ میرے خدا!“ فار یہ کا سر پیٹ لینے کوئی چاہتے لگا۔ ریشماں کا ڈسٹر پر رکھے لمبوں کا کاٹ کر دودھ میں ڈالنے ہی والی تھی اگر وہ تیزی سے اٹھ کر ریشماں کا ہاتھ نہ پکڑ لیتی تو ایک کلو دودھ بھی پھٹ کر ضائع ہو جاتا اور وہ اس روز وہ بچنے دودھ سے بچ کر بنانے کی ویڈیو بھی نہ بناتی۔

”آلو مونگرے جن کی آپ اتنی تعریف کر رہے ہیں اور بھی اچھے بن سکتے تھے اگر میرا عملہ مستعد اور ہوشیار ہوتا۔“

اس رات کھانے کی میز پر اس کا موڈ سخت بگڑا ہوا تھا۔ اس روز وہ اپنی مہم میں نہ صرف ناکام رہی تھی بلکہ وہ اپنی پرسنل کا ایک دل جلاتا احساس بھی اس کے ہمراہ گھر آیا تھا اور اسی روز آلو مونگرے اور جیرو وال ویڈیوز بھی اس کی مرضی کے مطابق نہیں بن پائیں تھیں۔

”عمل۔“ اب اس کی بات سن کر بے اختیار ہنسنے لگی تھی۔ ”تمہارا اشارہ ریشماں اور مراد کی طرف ہی ہے نا؟“

”جی ہاں! اس نے ہاتھ میں پکڑا آنگیوں میں پختے ہوئے جواب دیا۔“ ریشماں نے پیاز چر کر کے نہیں رکھے اور انہیں اور ک کو بھی چوپ کر کے بجائے باریک چوس دیا۔“

”اور مراد..... اس نے کیا کوئی ای کی؟“ وہ..... اسے آج تک کیمبرے کا ایٹلنگ تھا رکھنے کا ڈھنگ نہیں آیا۔ اتنی بار کھا چکی ہوں

پھر بھی ہر بار غلطی کرتا ہے۔“ وہ سخت جھلائی ہوئی تھی۔ جانتے ہیں اب صرف ان دو ویڈیوز کی ایڈیٹنگ پر کتنا وقت صرف ہوگا میرا اس نے اب کوئیوں جتایا تھا جسے اس سارے میں اصل قصور انہی کا ہو۔ وہ خاموش رہے تھے۔

”نہیں..... نہیں چلے گا یہ کام۔“

”میں بتا رہی ہوں زیادہ دیر نہیں چلے گا۔“ تاہم جھلا آٹھ مہینوں میں صرف آٹھ سو تین مسکرائز، روز دہشتی ہوں کبھی پچھلے دن سے تین کم ہو جاتے ہیں اور کئی دنوں بعد شو کی قسمت بڑھے تو ایک آدھ سے زیادہ نہیں بڑھتا مزید کتنی دیر ممبر سے کام لے پاؤں گی میں۔ اتنے کم لائکس، اس سے بھی کم شیئر، میرا چمیل بہت جلد بند ہو جائے گا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں۔“ کچھ دیر اب کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بڑے یقین سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جو بھی کام یا شروع کیا جائے وہ اتنی جلدی کامیاب نہیں ہوتا۔“ انہیں فار یہ کے لیے پکارا گیا تھا اور اس بھی۔ اسی لیے نری سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”جلدی!“ اس نے تیزی سے ان کی طرف اٹھل۔ ”آٹھ مہینے ہو رہے ہیں یہ ابھی جلدی ہے؟“ ”کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے لیے کبھی کبھار برسوں انتظار کرنا پڑ جاتا ہے، حوصلہ مت ہارو ایک دن تم اس ایورسٹ کو ضرور سر کر لو گی جو کامیابی کا استعارہ بنا کر تمہارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔“

”نہیں۔“ فار یہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”آپ بھی وزٹ کر کے دیکھیں ان گت فوڈ چینل چل رہے ہیں۔ بے شمار ایک سے بڑھ کر ایک، اس کھانا کے دن میں۔ میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو پاؤں گی۔“ اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔

”ایسا کرتے ہیں، اسے بند کر دیتے ہیں۔“ آنسوؤں کا گولہ حلق سے اُتارتے ہوئے اس نے ایک سیرا بھران کی طرف دیکھا۔ ”یہ جو کم کوالٹی کا کیمبرہ اور اس کی اسیر یز ہیں یہ بکتے بکتے کچھ قیمت تو نکال

ہی جائیں گی۔“ ”ہرگز نہیں۔“ انہوں نے سختی سے منع کیا۔ ”ہم نے یہ سب چسپہ کمانے کو یا کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے لیے نہیں تمہارا شو پورا کرنے کے لیے خریدا تھا۔ مصروف رہنے کے ایک بہانے کے طور پر لائے تھے ہم انہیں یہ سب دیے ہی چلائیں گے جیسے اب تک چلا رہے ہیں چاہے ایک بھی سبسکرائبر نہ بڑھے چاہے ان ویڈیوز کے ویوز چند سیکڑوں تک ہی محدود کیوں نہ رہیں۔“

وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کہتے ہوئے وہ فار یہ کا حوصلہ بڑھا رہے تھے یا اپنا لیکن اتنا ضرور جانتے تھے کہ ان کی بات سن کر فار یہ پہلے کی نسبت پر سکون ضرور نظر آنے لگی تھی جیسے انہوں نے اس کے سر پر رکھا کوئی بو جھاتا دیا ہو۔

☆☆☆

”تم نے کسی سے پتا کیا فار یہ اس روز تمہارے آفس تم سے ملنے کیوں آئی تھی؟“ امی جو معاشی استحکام ملنے کے بعد اس کے دوسرے دو بھائیوں اور ان کی بیویوں کے لیے مام بن چکی تھیں۔ جبکہ وہ ابھی بھی ان کو امی ہی کہہ کر بلاتا تھا۔ کئی دن بعد اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”تمہیں پتا کرنا چاہے تھا اس کا انکار میں پتا سر دیکھ کر وہ پریشان ہوئیں۔“ کیا معلوم اس کو دانتی مدد کی ضرورت ہو۔“

”ہو سکتا ہے اسے جاب کی ضرورت ہو اور وہ تمہارے ابو کے بجائے تم سے یہ بات کرنا چاہتی ہو۔ تمہارے ابو کو تو تم جانتے ہو۔ اصل قصور تو مسعود اور فار یہ کو ان ہی پر ہوگا تم سے تمہارے بھائیوں اور مجھ سے ان کی کیا ناراضی ہو سکتی ہے۔ وہ دونوں جانتے ہیں کہ ہم بے بس تھے۔“

”اف امی اور ان کی خوش فہمیاں۔“ جبران نے دل میں سوچا اور پھر نری سے انہیں سمجھانے لگا۔ ”فار یہ کی ڈگری اتنی ہلکی نہیں کہ اسے کہیں جاب بذل سکے اور وہ اس کے پیچھے خوار ہوئی ہم ہی

تک آئی۔
”تو کہیں وہ کہیں جاہ کرتی تو نہیں ہے۔“
انہوں نے بے ساختہ کہا۔
”پھر یہ اس کی اپنی مرضی ہوگی کہ وہ کہیں جاہ نہ کرے۔“

”ان کے مالی حالات بہت اچھے تو نہیں ہیں مسعود کی پشٹن ہے۔ بس اور اپنے ایک دوست کے ساتھ اس نے جو کسی کام میں تھوڑا بہت پیسہ انویسٹ کر رکھا ہے اس کے معمولی سے منافع پر معاملات چلا رہے ہیں وہ دونوں ہی جبران نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”اور فار یہ وہ چلاتی ہے کیا اس کو کہتے ہیں چیل۔ وہ جو انٹرنیٹ پر چلتے ہیں نا چیل کھانا دانا بنانا سکھاتی ہے چیل پر۔“ وہ فار یہ کی آمد کا سر پریشان تھیں۔ اسی لیے اپنے روانی میں بولتی چلی جا رہی تھیں۔

”یہ سب آپ کو کس نے بتایا؟“ جبران کو ان کی معلومات پر حیرت ہو رہی تھی۔

”وہ۔“ ان کی روانی گڑ بڑا گئی۔ انہوں نے جبران سے نظریں چرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ شاید وہ کوئی مناسب جواب سوچ رہی تھیں۔

”ای اے آپ کو ان لوگوں کے بارے میں اتنی مکمل معلومات کون دے رہا ہے؟“ جبران نے ان سے اپنا سوال دہرایا۔

”مراد، مراد کبھی کبھار ملنے آجاتا ہے۔“ وہ جھوٹ گھڑنے کی عادی نہیں تھیں۔

”خود دہرت پڑنے پر گھڑی لیتیں لیکن اس کے لیے انہیں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔“

”اچھا، اور مراد ان کی طرف بھی جاتا رہتا ہوگا۔ ہے نا۔“

”ریٹیشن اور مراد، مسعود کے گھر کا کام دام کر دیتے ہیں۔ پرانی مروت والے لوگ ہیں۔ مراد بتا رہا تھا وہ دونوں مسعود سے بہت معمولی معاوضہ لیتے ہیں۔ اپنا خرچا دوسرے گھروں میں کام کرنے کے پورا

کر لیتے ہیں۔“ انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے جبران کی طرف دیکھا۔ جو سوچ میں گم تھا۔
”دیکھو اپنے ابو کو مت بتانا کہیں وہ مراد کا آہ جانا نہ بند کروں۔“ انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
”نہیں بتاؤں اگر ایک بات آپ مجھے سچ سچ بتائیں تو۔“

”ہاں پوچھو۔“
”آپ مراد کو کتنے پیسے دے کر اس معمولی معاوضے کے نقصان کی تلافی کرتی ہیں۔“

جبران ان کا بیٹا تھا اور ان کے دوسرے بیٹوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھا اسی لیے ان کے مزاج سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔

”میں اسے کچھ نہ دوں تب بھی وہ مسعود کے ہاں کام کرنا نہیں چھوڑے گا۔ اسے اس خاندان سے موروٹی اس ہے اور اس میں مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ تمہارے ابو کے ڈر سے ان کی موجودگی میں کبھی یہاں نہیں آیا۔ مجھ سے کبھی کبھار ملنے آجاتا ہے اسی موروٹی اس کو بچھانے کی خاطر۔“

”ہوں۔“ جبران نے سر ہلایا اور اپنے دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دئے۔ ”میں مراد کے بارے میں ابو کو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن اگلی بار جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ اسے مجھ سے ضرور ملوائیں گی۔“

”ارے وہ کسی ایسے وقت میں تو آتا ہی نہیں جب تم چاروں میں سے کوئی گھر پر ہو تو۔۔۔۔۔“ وہ بوکھلا گئیں۔

”اب وہ آئے تو آپ مجھے کال کر دیجیے گا۔ میں گھر آ جاؤں گا۔“

لیکن وہ انہیں خود پر غصہ آنے لگا وہ کیوں مراد کے آنے جانے کا قصہ کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔

”سوچ لیں ابو کو پتہ چل گیا تو مراد یہاں آسکندہ آئیں پائے گا۔“ اس نے شہیدہ چہرہ بنایا۔
”تم مجھے بلک بیل کر رہے ہو۔“ وہ ناراض ہو گئیں اور جبران کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”گلتا ہے آپ اپنی بہوؤں کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی ڈرامے زیادہ دیکھنے لگی ہیں۔“
”بلک میاگ کیا ہوئی ہے یہ بھی معلوم ہو گیا آپ کو۔“ وہ مسکرایا۔
”نہیں بھیا۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”کچھ نیا معلوم کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ جتنا اب تک دیکھ لیا۔ سن لیا۔ سمجھ لیا کافی ہے۔“

جبران نے اپنی سادہ اور معصوم ماں کی طرف بارے دیکھا۔ ان سب کی زندگیوں میں چند سال پہلے جو انقلاب آیا تھا اس نے ان سب کی شخصیتوں کو بدل کر رکھ دیا تھا سوائے اس کی ماں کے۔ وہ سدا سے مروت اور وضع داری نبانے کی ناکل تھیں۔ کبھی کبھی جبران کو ایسا لگتا جیسے اس نئی زندگی سے بھجوتا بھی انہوں نے وضع داری اور مروت نبانے کے چکر میں کر رکھا تھا۔ اسے شوہر اور بیٹوں کا دل رکھنے کی خاطر اس نے طرز زندگی کو بظاہر اپنا بھی چکی تھیں لیکن اندر سے وہ بھی وہی تھیں اور ان کا دل بھی وہی تھا۔ خود سے بڑے ہر رشتے پر تعلق کا بھرم رکھنے والی۔ ہر کسی کی مدد کے لیے بے چین، اپنے کام کو اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادی، سکھنے، سیکھنے، شعاع زرد آ یا۔

”دیکھو ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ اسے اچانک ایک خیال آیا۔
”وہ کیا؟“

”وہ سر پر کا ڈوبے ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔“
”فار یہ پروڈیوسل کیریئر بنانے کے بجائے کھانے پینے اور سکھانے پر کیوں لگ گئی۔ بہت عجیب سی بات ہے نا۔“

”لیکن ڈھنگ کی نوکری جو نہیں لی اسے مراد بتا رہا تھا۔“ جواب میں وہ کچھ۔ بتاتے ہوئے رک گئیں۔ ”میری عقل دیکھو۔ وہ باتیں جو مراد مجھے اس گھر کے راز کے طور پر سناتا ہے میں کیوں کسی دوسرے کان کو سنانے لگی ہوں۔“

”ہاں ہاں کیا بتا رہا تھا مراد، رک کیوں گئیں آپ؟“ جبران کے لہجے میں بے قراری تھی۔

”تمہیں کیا کہ وہ کیا بتا رہا تھا۔“ اب کے ان کا لہجہ سخت ہوا۔ ”اب ان دونوں باپ بیٹی پر جو بیٹے سو بیٹے تم سے مطلب۔“

”آپ بھول رہی ہیں۔ فار یہ مجھ سے ملنے آئی تھی آفس اور یہ بات آفس کے وزیٹرز ریکارڈ میں درج ہے۔ آپ چاہیں تو کنفرم کرالیں۔“
”چلو فرض کرو کہ فار یہ تم سے مدد مانگنے آئی تھی کسی سلسلے میں تو کیا تم اس کی مدد کرو گے؟“ انہوں نے اس سے سوال کیا۔

”یہ بات۔“ جبران نے چٹکی بجائی۔ ”مطلب اسے مدد چاہیے۔“
”مجھے کیا معلوم۔“ میں نے تو تم سے پوچھا ہے کہ اس کی مدد کرو گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے صاف جواب دیا ”یاد رہے آپ کو کیسے اس نے زبان چلائی تھی ابو کے سامنے بہت زعم تھا اسے ہم سے الگ ہو کر وہ لوگ مر نہیں جائیں گے۔ زندگی میں کسی اپنے کے بغیر کیسے سروسو کیا جاتا ہے وہ ہمیں کر کے دکھائے گی۔ یاد ہے یا بھول گئیں۔“

جواب میں انہوں نے منہ بنا کر یوں سر جھٹکا جیسے اس کی بات سے بالکل بھی متفق نہیں تھیں۔

”اور آپ کو پتا ہے یونیورسٹی کے پورے چار سال میں اگر میں نے اسے مخاطب نہیں کیا تو اس نے بھی مجھے بلایا تک نہیں۔“ داغ داری اور اکثر یہاں رکھی تھی اس کی یہاں اس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

”کون سی داغ داری اور کہاں کی اکثر۔“ وہ بے زاری سے بولیں۔ ”تم سب باپ بیٹوں نے جیسے ان دونوں کے قدموں کے نیچے سے زمین نکال لی تھی۔ اس کے بعد کون سی اکثر دکھانے کے قابل رہ گئے وہ دونوں۔“

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ ہماری ماں ہیں یا فار یہ کی۔ میں نے ہمیشہ اس جھگڑے میں آپ کو ان دونوں باپ بیٹی کی طرف داری ہی کرتے دیکھا

ہے۔“ وہ بگڑنے لگا۔

”کیوں نہ کروں ان کی طرف داری، مسعود اپنے موقف میں بالکل بھی غلط نہیں تھا۔ اسے ابامرحوم کا بنایا گھر عزیز تھا تو اسے وہاں سے بے دخل کرنے کا حق کسی کو نہیں تھا اور بے دخلی بھی ایسی۔“ تمہیں بھی یاد تو ہوگا کہ اس بے دخلی کی بنیاد میں کسی بدعتی اور دھوکا شامل تھا۔“

”عیش کر رہی ہیں آپ آج اور آپ کی پوری فیملی۔“ جبران چڑھائی کے موڈ میں آ گیا۔
”کہاں دس، دس لوگوں کے لیے پکائی، کھلائی تھیں اپنے ہاتھ سے۔ سب کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھنا پڑتا تھا آپ کو اور کہاں اب ایک ایک کام کے لیے دس، دس ملازم آپ کے سامنے موجود رہے ہیں۔“ شکرمت ادا کیجیے گا بھی۔“ وہ منہ ہٹا کر اٹھ گیا۔
”جب تمہیں جو چاہے ہو جائے اس کی مدد کرنی ہی نہیں تو پھر اتنا جس کیوں ہے کہ وہ کیوں آئی بھی؟“ وہ ناراض ہو گئیں۔

”تم لوگ بس اپنی اس دنیا میں جیتے رہو جو تم لوگوں نے نئی بسالی ہے۔ تمہاری بلا سے اس دنیا سے باہر کوئی جیسے یا مرے۔“
”مراد کا میں نے کہا ہے کہ آپ سے، ملوایے گا اس سے مجھے۔“ جبران نے ان کے پاس سے ہٹتے ہوئے کہا۔

”یہ تو تم بھول ہی جاؤ۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور دل میں کہا۔ جبران کے رویے پر ان کا ملول دل اور بھی دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ ”مراد سے پوچھتا ہے فاریہ تو کڑی کرنے کے بجائے کھانے بنانے اور سکھانے کیوں لگ گئی۔ ارے یہ ہی تو ایک کام ڈھنگ سے سکھاپائی میں اسے۔“

انہیں گزرے دن یاد آئے گی۔ فاریہ کو انہوں نے اپنی سگی اولاد کی طرح بالاتھا۔ ساڑھے تین سال کی عمر ہی فاریہ کی جب اس کی ماں یعنی ان کی دہوریانی فرحت کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی بے چاری مرحومہ کیسر کی تشخیص کے بعد دو سال اسپتال، علاج،

دوا، یہ ٹیسٹ وہ ٹیسٹ کے چکروں میں پھنسی رہی تھی۔ یوں فاریہ تو جیسے پیدا ہوتے ہی ان کی گود میں آ گئی تھی۔ خود ان کی اپنی کوئی بیٹی تھی نہیں سو فاریہ بڑا کوچھی مامتا سے محروم کا احساس نہیں ہوا۔

بٹیوں کے حوالے سے ان کے یعنی ”عذرا آپ“ کے روایتی سے خیالات تھے۔ کم گوہ، بولے تو آہستہ بولے۔ پر اعتماد ہو لیکن شرم حیا کے دامن سے ہی بندھی رہے۔ پہننے اوڑھنے چلنے، پھرنے، اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے ہر انداز میں نسوانیت چمکتی نظر آئے۔ سلیقہ شعار اور گھر گھر سستی سنبھالنے کے تمام گھڑور رکھے۔ سو انہوں نے فاریہ کی تربیت کی عبارت کو بھی ان ہی بنیاد پر اٹھانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتی تھی۔ فاریہ عمر ہی وہ چھوٹے دیور مسعود کی بیٹی جو عورت مرد کی برابری والی تحریک کے نمبر ایک مداح تھے اور پر سے گھر میں اکلوتی لڑکی ہونے کے سبب اسے ان کے اپنے چاروں بیٹوں ہی کی مصاحبت میسر تھی سو فاریہ بنیاد ان کی تربیت اور دستیاب عمومی حالات میں پل بڑھ کر جب بڑی ہوئی تو سلیقے، سچائی کے ساتھ ساتھ مددگار بننے کے گری بھی خوب جان چکی تھی۔

وہ پر اعتماد بھی، حاضر جواب اور ذہین بھی تھی اور یہ اس حاضر جوابی اور اعتماد ہی کا نتیجہ تھا کہ جب محمود اور مسعود صاحب کے درمیان مکان کی فروخت کا جھگڑا اٹھا تو فاریہ نہ صرف مسعود صاحب کے ساتھ ڈٹ کر کھڑی ہوئی بلکہ اس نے اپنے اس تاجاجن کے سامنے پہلے بھی اونچی آواز میں بولی نہیں تھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی بدعتی دھوکے اور زیادتی پر بھی تقریر بھی کر ڈالی تھی۔ اور اسی تقریر کی وجہ سے تو ان کے شوہر اور بیٹوں بیٹے فاریہ کے نام سے بھی شہر ہو چکے تھے۔

ورنہ نہ جبران دم دم کا ساتھ تھا اس کا فاریہ کے ساتھ، اسکول میں ایک ساتھ پڑھے تھے دونوں اور اکیڈمی بھی اکٹھے جاتے تھے۔ دونوں کی دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کی مثالیں دی جاتی تھیں اور کامران اور عثمان، وہ تو بھی فاریہ کو کندھوں پر اٹھائے پھرنے سے لے کر اسے کالج اور پھر ہسپتالوں کے گھر چھوڑنے

لانے کی ڈیوٹی کیسے شوق سے دیتے رہے تھے۔ کیسے سہری دن تھے۔ انہوں نے گھر اسانس لے کر ہوتے بھی آنکھیں دھوئے کے کونے سے صاف کیں۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ خلوص اور محبت کی ڈور میں بندھا دے گھر انہوں نے کونے کا کراس کے فرد قسم ہونے کے بعد ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھنے کی قسم کھانے پر اتر آئیں گے۔

جب سے پچھلے تھے دوبارہ کب کسی نے دوسرے کو دیکھا تھا سوائے جبران اور فاریہ کے جو اتفاق سے یونیورسٹی میں ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بھی کیا اکٹھا ہوتا تھا جو چار سالوں میں ایک مرتبہ بھی دعا سلام تک نہ ہوتی تھی۔ وہ اسے پرسوں میں یہ کہانی اسی طرح نبھانے لگی بار یاد کر چکی تھیں اور اس کے علاوہ وہ کبھی کیا سکتی تھیں۔ یادوں کی یہ وہ بٹاری تھی جو وہ اپنے ساتھ اس گھر میں لے کر آئی تھیں اور تنہائی میسر آنے پر اسے کھول کر پیٹھ جانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

”لیکن یہ فاریہ، آخر وہ جبران کے پاس کیوں آئی تھی؟“ اگلی نماز کے لیے اٹھنے سے پہلے اس سلسلے کا آخری خیال انہیں ایک بار پھر سوچ میں ڈال گیا تھا۔

☆☆☆

”یہ ہو نہیں سکتا۔“ حرم خرم خان، بہت دن بعد ایک بار پھر اس کے گھر میں موجود تھی۔ نہیں فاریہ ایہ نام لگنے سے کہ وہ نہیں نہ ملے۔“

”نہیں ملا۔ میں نے بتایا تا کہ وہ مجھے نہیں ملا۔“ فاریہ جو اس کی دوسری آمد پر پہلی آمد کی طرح تو مرعوب نہیں ہوئی تھی لیکن کچھ ایسا تھا جو حرم کے سامنے اسے بے آرام کر رہا تھا۔

”میں اس کے آفس صرف تم سے کیا وعدہ نبھانے لگی تھی اور وہ مجھے وہاں نہیں ملا میں معذرت خواہ ہوں اس سے زیادہ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔“

”کسے نہیں کر سکتیں۔“ حرم کی آنکھیں پل بھر میں بھیک لگیں جن میں اس روز اس نے ہلکے بھورے

دین



اپریل 2019ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

مذہب دار و پیچہ اور
ولچسپ مضامین
کے ساتھ

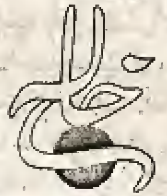
- مصنفہ ”نقیبہ سعید“ سے شاین رشید کی ملاقات،
- اداکار ”نقیب بٹ“ کہتے ہیں ”میری بھی سنیے“
- آواز کی دیوائے ”آرے عزیز احمد“ اس ماہ مہمان ہیں۔
- اس ماہ ”مار پیہنڈر“ کے ”مقابلہ ہے آئینہ“
- ”ہوا کیل رخ بدل گئیں“ نگہت عبداللہ
- کاسلے دار ناول،
- ”شب نم کی عمر“ رخ چوہدری کا سلسلہ دار ناول،
- ”چونچ مارے کوئے“ شاکر وحماد کا مکمل ناول،
- ”ساگر کنارے“ ام طیلور کا مکمل ناول،
- ”شام رنگ سیاہ“ انیل رضا کا ناول،
- ”ایک کہانی محبت کی“ نگہت سیما کا ناول،
- ”عزم وفا“ شبانہ شوکت کا ناول،
- امت العزیز شہزاد، بشری احمد اور
- نازیہ کنول نازی کے افسانے اور مستقل سلسلے،

رنگ کے لیزر لگا رکھے تھے۔ "ایسے تو نہ کھو فاریہ!"
 حرم کی ہنسی بھوری آنکھیں ایک بار پھر فاریہ کے
 دل پر اثر کرنے لگیں۔ لیکن اس روز وہ ہر چیز سے
 حرم کی آمد سے پہلے ہی بیزار تھی۔ اس کی تازہ ویڈیو کو
 دیکھنے پانچ دن میں لگتی کے ایک سو بیس ویڈیو اور دس
 لاکھس مل پائے تھے۔ اس ویڈیو کو کہیں بھی شیئر نہیں
 کیا گیا تھا اور اس کے سوسائٹیز میں بھی ہرگز رے
 دن کے ساتھ کی آتی جا رہی تھی۔ سو اس نے دل بھر
 کر کے حرم کی آنکھوں سے دھیان ہٹالیا۔
 "مجھے لگتا ہے تم شدید غلط فہمی کا شکار ہو حرم!
 جبران اور اس کی دیکھی کے ساتھ ہمارا تعلق بس نام ہی کا
 ہے۔ ایک دوسرے سے تو دور کنار سر راہ دیکھ کر ٹھہرتے
 نکل نہیں۔ تعلق تو کیا ہمارے درمیان حق قسم کے
 ایسے فاصلے موجود ہیں جو کسی کم یا ختم ہو نہیں سکتے۔"
 "غلط کہہ رہی ہو تم انترم نے ٹیوی پر کوہکے ہاتھ سے
 آنکھوں پر پھیرا۔ جبران نے خود مجھے تمہارے بارے
 میں بتایا تھا کہ تم اس کی کلوز کرن نہیں اور یہ کہ اس کی
 قریبی دوست بھی رہ چکی ہو۔ وہ تمہارے ساتھ ہر بات
 شیئر کرتا رہا ہے اور تم اس کے سب راز جانتی تھیں۔"
 "میں اس کی کلوز اور قریبی دوست رہ چکی ہوں۔
 وہ میرے ساتھ ہر بات شیئر کرتا رہا ہے اور میں اس
 کے سب راز جانتی تھی تمہارے ہر جملے کے ساتھ ماضی
 بعید کا مینڈ لگا ہوا ہے حرم! یہ سب باتیں بہت پرانے
 زمانے کی ہیں۔ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں ایک بار
 پھر معذرت خواہ ہوں۔" فاریہ نے حرم کی طرف
 دیکھے بغیر جواب دیا۔
 "مجھے بتا ہے۔" حرم گھوم کر اس کی نظروں کے
 عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "لیکن تم ابھی اس
 تک رسائی حاصل کر سکتی ہو۔ آفس میں، گھر میں، فون
 پر، اسپورٹس کلب میں، کہیں بھی، مجھے یقین ہے فاریہ
 تم اس تک پہنچو گی تو وہ بھی تم سے ملنے سے انکار نہیں
 کرے گا۔"
 "حرم پلیز!" فاریہ نے پوری کوشش کرتے ہوئے
 اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ "تمہارا یہ کام تم

دونوں کے مشترکہ دوست بہتر کر سکتے ہیں۔ تم کسی کو بھی
 اس معاملے میں ڈال کر دیکھو، تمہارا کام ہو جائے گا۔
 میرے سلسلے میں تمہیں واقعی غلط فہمی ہوئی ہے۔"
 "تمہارا کیا خیال ہے میں نے یہ سب کر کے
 نہیں دیکھا ہوگا۔" حرم نے کی خاموشی میں حرم کی سکسی
 ابھری۔ "سب میوچل فرینڈز اپنی سی کوشش کر چکے
 ہیں اور اس نے سب ہی کو یہ دیکھی دی ہے کہ اگر
 انہوں نے میرے اور اس کے سلسلے میں کوئی بات کی تو
 وہ ان سے دوستی ختم کر دے گا۔ ایسے میں تم بتاؤ میں کیا
 کروں۔" اب وہ بلند آواز میں رو رہی تھی۔
 "میرے خدا!" فاریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
 وہ اس لڑکی سے جان کیسے چھڑائے جو زبردستی اس
 کے سر پر آ بیٹھی تھی۔
 "میں نے سنا تھا تم بہت بڑے دلی کی مالک ہو،
 کسی کی بھی مدد کے لیے فوراً تیار ہو جاتی ہو۔ انسان
 دوست ہو، ہمدرد ہو، کسی کو روتا نہیں دیکھ سکتیں۔" وہ
 کہے چلی جا رہی تھی۔
 "تم نے میرے بارے میں یہ سنا، وہ سنا اور سن
 کر بھی اتنے فاصلے پر رہیں کہ میں تمہیں دور دور سے
 دیکھ کر ہی متاثر ہوتی رہی۔"
 فاریہ کا دل چاہا وہ حرم کو دل کھول کر سنا دے لیکن
 وہ بڑے دل والی تھی۔ انسان دوست اور ہمدرد تھی۔
 سامنے والے کو تکلیف میں دیکھ کر پرانے روزیوں کے
 طعنے چاہ کر بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اسی لیے۔ اب یہ ہر
 طرف سے مایوسی ہو کر تمہیں جو میرے گھر کا راستہ
 سوچا ہے تو سمجھو میرے گھر کی کال تیل کرنٹ دیتی
 ہے۔" اس جیسی کئی باتیں بھی اسے نہیں سنا سکی تھی۔
 "میری خاطر پلیز میری خاطر ایک بار جبران سے
 ملنے کی کوشش کرلو۔" اس نے اپنی نظروں کے سامنے حرم
 کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھے۔ "اسے بتاؤ کہ اس کے
 بغیر میں کس حال میں جی رہی ہوں، جی بھی کیا میں تو لمحہ
 لمحہ مر رہی ہوں۔" حرم کے جگر کا حال سننے ہوئے فاریہ
 کی آنکھوں کی پتلیاں لمحہ بھر کے لیے پھیلیں۔ حرم کا حلیہ
 اس کا لباس، اس کی ٹومیک اپ، لک نہیں سے بھی لمحہ

مرنے والی کیفیت کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔
 "دیکھو جبران اگر یونہی مجھ سے گریزوں رہا تو کیا
 پاس کے بغیر مر رہی جاؤں۔" وہ کہہ رہی تھی اور فاریہ
 نے اس کی طرف دیکھتے سوچا تھا۔
 "کیا مرنا اتنا آسان ہوتا ہے وہ بھی کسی کٹھور،
 پتھر دل انسان کے لیے۔" وہ سوچ رہی تھی۔ اسے
 زندگی کی اہمیت کا احساس نہیں یا پھر مر جانے کی
 کیفیت کا اور اس نہیں۔ "اتنی بڑی اور مشکل بات
 کیسے کر لیتے ہیں لوگ۔"
 "تمہیں ابھی تک کسی سے محبت نہیں ہوئی نا تم ابھی
 تک کسی کی محبت نہیں بنی ہو نا ہی تم نے کسی کو محبوب بنایا
 ہے۔ جب ہی تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا فاریہ،
 جب ہی تم اندازہ نہیں کر پا رہیں کہ بن چلی جو تڑپتی
 ہے اسل میں وہ کس اذیت سے زبردستی ہوئی ہے۔ عام
 انسان کی آنکھ صرف تڑپنا ہی دیکھ سکتی ہے نا اس کے
 اندر کی اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتی۔" حرم فاریہ کی سوچ
 اور فہم سے کہیں بڑی باتیں کر رہی تھی۔ عمومی گفتگو میں
 بھی کوئی جملہ اردو میں بولنے والی نے ایسے بھاری لفظ
 کب سمجھے تھے اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔
 "تم نے صرف محبوب بنایا تھا یا تم بھی محبوب
 تھیں؟" وہ اٹکتے ہوئے بولی۔
 "جانتیں۔" حرم نے اس کے سوال پر ایک سیکنڈ
 کے لیے ٹھکنے کے بعد جواب دیا تھا۔
 "جس چیز کا تمہیں یقین ہی نہیں، اس کی خاطر
 مر جانا چاہتی ہو۔" وہ بڑبڑاتی تھی حرم کو اس کے سوال
 پر الجھن ہوئی تھی جب ہی اس نے اپنی جیکٹ کی
 جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اپنا رخ دوسری طرف
 پھیر لیا تھا۔
 "پچھلی اور جل کا ازل کا ساتھ ہے۔ بن چلی
 پچھلی کی تڑپ تو سب ہی نے دیکھی ہو گی لیکن بن چلی
 جل پر کیا گزرتی ہے۔ بھی سنا نہ دیکھا۔"
 فاریہ کے ذہن میں شاید غیر ضروری سوال جنم
 لے رہے تھے۔
 "جل شاید پچھلیوں سے بھرا رہتا ہے اسی لیے

ایک پچھلی سے دوری سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ
 تڑپا ہے نہ ہی مرتا ہے۔ خود میں مکن سا مکن کھڑا
 رہتا ہے یا پھر اپنے بھاؤ پر بیٹے میں مکن رہتا ہے۔ ہے
 نا؟" اپنے سینے سے ایک پتے کی بات سوچتی تھی اس
 نے تانید کے لیے حرم کی طرف دیکھا تھا۔
 "اب تم بھانے گھر رہی ہو فاریہ! اقرار حاصل کرنا
 چاہتی ہو۔ یہ بھانے اور گریز ہم جیسوں پر چلتا ہے۔
 میرا مطلب ہے ہم جیسے مفرد، خود غرض اور روڈ لوگوں
 پر۔" اس نے جتانے والے انداز میں فاریہ کو دیکھا۔
 "تمہیں یہ سب سوٹ نہیں کرتا تم تو عا جز ہی پسند
 رحم دل اور بے غرض لڑکی ہو۔ تم برا ایسے رویے جتنے
 نہیں۔ طغر، طعنے اور غصہ یہ تمہاری گواہی نہیں ہیں تم
 کیوں خود پر یہ رویہ اوڑھنا چاہتی ہو۔"
 "یہ مجھے میری اوقات یاد دلانا چاہا۔ رہی ہے یا
 اپنی حیثیت؟" فاریہ نے چونک کر دیکھا۔
 "تم بلسڈ ہو فاریہ، چونکی شخص انسانیت پسند ہے
 وہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمتی کے اس ستارے کو سر پر
 سجاے تم میری خاطر جبران کے پاس دوبارہ ضرور جاؤ
 گی۔ مجھے یقین ہے۔"
 حرم نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ فاریہ نے
 حرم کے ہاتھ کی نرمی کو محسوس کیا اور اس کے چہرے پر
 ایک نظر ڈالی۔ حرم کے چہرے کا کرب اس کے دل کو
 چھو گیا۔
 ایک انسان سے دوری نے اسے کیا سے کیا
 بتا دیا۔ مجھ جیسی لڑکی کے در کی سائل بن کر رہ گئی ہے۔ کیا
 محبت واقعی ایسا آکٹوپس ہے جس کی گرفت سے جان
 چھڑائے نہیں چھوٹی۔ وہ حرم اور جبران کے فہرے پر
 لعنت بھیج کر اس پر مٹی ڈالنا بھول گئی۔
 "اس باری تو کچھ بھی ہوا اسی سے مل کر آؤں گی۔
 وہ اس کمپنی کا سی ای او ہے جس کے آفس میں اس روز
 گئی تھی اور چیئر مین کے آفس کے کمرے کی لوکیشن
 مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ اب کوئی مجھے دھوکے سے بھی
 اس کمرے کی طرف نہیں۔
 (دوسری ادا آخری قسط آئندہ ماہ)



”خالہ! آپ بھی عاقب کے دائیں طرف آجائیں۔ آپ کی بھی ویڈیو بنانی ہے۔ آخر آپ کے بیٹے کی پگنی ہے۔“ رابعہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے خالد کو بھی آگے بلا دیا۔

”ہاں! ہاں۔ میں بھی آتی ہوں۔ ذرا یہ مٹھائی رکھو ادوں۔“

”مٹھائی میں رکھو ادیتی ہوں، پھوپھو آپ یہاں آجائیں۔“ ثریا تیزی سے باورچی خانے کی طرف چلی۔

”ہاں یہ کھورامٹھائے۔ مٹھائی نکورے۔“

صحیح لفظ نہ دیکھنا تھا خالد کے منہ سے، نہ نکلا۔

”اچھا پھوپھو اچھا۔ میں مٹھائی کے ٹوکے سنہال کر رکھ دیتی ہوں۔“ ہنسی کی پھلجڑیوں میں ثریا سمجھ کر بولی۔

”لڈن کو بھی آگے بلاؤ۔“ خالد نے مڑ کر لڈن ماموں کو بلایا۔

”ارے آپا! آپ جاییے آگے۔ ہم یہیں ٹھیک ہیں۔“ لڈن ماموں نے انکساری دکھائی۔

”بھیلے چلے لڈن ماموں آگے آئیے۔“ نے اور نوی نے پکڑ کر ماموں کو عاقب کے دوسری طرف کھڑا کیا۔

”بھیلے بن مگی ویڈیو! اب دلہن اور عاقب کو تخت پر بٹھا دیں۔“ چھوٹی ممانی کی بہو بولی۔ ممانا اور نوی بھی کھٹاکٹ تصویریں بنا رہے تھے۔

”لڈن آؤ! پہلے تم دلہن کو پیار دو، عروسہ یہ تمہارے لڈن نانا ہیں۔ آج شام ہی کراچی سے پہنچے ہیں۔ سلام کرو ان کو۔“ خالد نے عروسہ کو بتایا۔ عروسہ نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ لڈن ماموں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”سدا خوش رہو بیٹیا! اور کھڑے ہو کر عاقب کو گلے لگا کر ملے۔“

”کیسے ہیں ماموں آپ؟“ عاقب نے پوچھا۔

”ارے ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ بالکل۔“ لڈن ماموں سے منہ ملتاتے بیٹے بھی غلطی ہو گئی۔ سب ہی بے اختیار ہنس پڑے۔

”حال پوچھا ہے ماموں! آپ کی تجوری کا پاس درخیز۔“ کوئی شرارتی بچہ بلند آواز سے بولا۔

”چپ کر جاؤ بد گیز۔ بڑوں کی غلطی نہیں نکالتے۔“ خالد خود بھی ہنس رہی تھیں۔

لڈن ماموں نے دہن کو منہ دکھائی دی۔ پھر سب ہی باری باری آکر منہ دکھائی دینے لگے۔ آپا نے سونے کی انگوٹھی پہنائی۔ چھوٹی ممانی نے چین پہنائی۔ بڑی ممانی نے گلن دیا۔ باقی سب نے لفافے دیے۔ خالد کی خوشی دیدنی تھی۔

”چلو پھوپھو! اب ڈھولا۔ ڈھولی۔“

ڈھولن۔ خالد نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈھولک رابعہ کے ہاتھ میں پکڑا دی، جو ہنس ہنس کر پگھلا رہی تھی۔

”آؤ اب سب ڈھولا۔ ڈھولی۔ ڈھولن بجاتے ہیں۔“ ممانی کہاں باز آنے والی تھیں۔

”دیکھو! دیکھو! لکھ دو ری! ہاتھوں سے مہندی۔“

ڈھولی۔ اودہ یعنی ڈھولکی ابھی رکھی ہی گئی تھی، رابعہ نے اس پر اپنا گھٹنہ ٹیک کر چچ کر گڑا ہی تھا کہ خالد نے گانا بتایا۔ ممانا تو ممانا عروسہ بھی کھٹاکر ہنس پڑی۔ بلکہ اسے تو کچھ ایسی ہنسی آئی کہ اسے اپنا گھٹنہ کھینچ کر۔ نیچے کرنا پڑا اور شرمائے کی اداکاری کرتے ہوئے سر کو جھکانا بڑا نئی ٹوٹی بہو، ساک پر ہنسنے کی تو پھر ساس اس کی اچھی خبر لے گی۔

خالد نے چونک کر تخت کی طرف دیکھا۔ وہ عروسہ کی ہنسی سن چکی تھیں۔ ان کی اپنی ہنسی ایک دم سے اڑن چھو ہو گئی۔ انہیں چپ سی لگ گئی۔ اسی دم ثریا نے ڈھولک پر تھاپ دی اور۔۔۔۔۔

”مہندی سے لکھ دو ری! ہاتھوں پہ سسکیوں میرے سنو ریا کا نام۔“

کی تان اٹھائی۔ لڑکیاں بالیاں سب ہی گیت میں شامل ہو گئیں۔ محفل کی روش دوبا لا ہو گئی۔ خالد بھی جھوم جھوم کر گانے لگیں۔

☆☆☆

صبح رابعہ اور ثریا سب کو چائے دے رہی تھیں کہ نفیسہ اپنی جیشانی کے ساتھ پُر تکلف ناشتہ لے کر پہنچ گئیں۔

”سلام خالد! نفیسہ نے خالد کو گلے لگا لیا۔“

”بھیلے۔۔۔۔۔ کم۔۔۔۔۔“ خالد کی زبان ولعلیم پر مل



کھا گئی تھی، انہوں نے سلام کو درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

کھا گئی تھی، انہوں نے سلام کو درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

ہوا نوٹ نکال کر وادراتو نو می چیجیڑا۔
 ”امی! خدا کے لیے اب یہ کسی کو دے دیں اور
 وارے تے کو دنیا نوٹ نکالیں۔“

بڑے کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔
☆☆☆

رخصے کدائیاں سننا تھا کہ ڈھیر سے بستر سر پر

”امی! میرے خیال میں چار منزلہ بالکل ٹھیک لاٹری وغیرہ کھلی ہے آپ لوگوں کی؟“
اسد الدین کی آواز مین گیٹ سے اندر آتے سچ کے کانوں میں پڑی تو اسے لگا کہ اس نے کچھ غلط سنا ہے۔
”نہیں خالہ امی! ہماری بات مان لیجیے۔ دو منزلہ ہی بہتر ہے۔ نیچے، اوپر دونوں جھے برابر ہو جائیں۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“
یہ مہ پارہ کی آواز تھی۔
اب تو مخالفت کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔
”پاؤں! یہ کہاں کسٹیشن شروع ہونے والی ہے؟“
سچ سوچتا ہو کر دھڑکتا، دو چار قدم مزید آگے بڑھا۔
کون سی والی لاٹری کھلی ہے؟“ مہ پارہ، اسد الدین

(فتین نسیم)

اکوٹیک کے عینے

”جب میں نے کہہ دیا، چھ منزل تو بس چھ منزل۔
ہاں..... اب اس بات پر کوئی بحث نہ کرے مجھ سے۔“
نمین تارا کی اس بات پر جہاں اس کے قدم زنجیر ہوئے، وہیں منہ بھی پورا کھل گیا۔
”چھ منزل.....“ زیر لب دہرایا۔ ”اللہ اللہ پلازہ بننے لگا ہے کیا.....؟“
نکل اس کے کردہ مزید کچھ دیو غور فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہتا۔ رضیہ سلطانہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔
”لو، میرا بچہ بھی آ گیا۔“
”آ جا سچا! میرے بیچے، ادھر آ۔ ان لوگوں نے تو مت ہی مار دی ہے میری۔ آ جا میرا بچہ۔ ذرا مشورہ تو دے مجھے۔“
”بڑی امی! کیا میرے گھر سے جاتے ہی کوئی



اسد الدین، مہ پارہ اور نمین تارا تینوں نے حیران ہو کر اس کی غیر متعلقہ سی بات سنی۔
”تجھ سے کس نے کہا؟“ رضیہ سلطانہ نے سوال کے جواب میں اننا اس سے سوال کر دیا۔
”میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔“
وہ ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا..... مگر حاضرین کے تاثر تو دھڑکوں نے اسے کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔
”اچھا، کس سے سنا.....؟ کتنا انعام نکلا.....؟“
کون سی والی لاٹری کھلی ہے؟“ مہ پارہ، اسد الدین

اور نمین تار نے ایک ساتھ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
بے جا رہ سچ تو ہو کھلا ہی گیا۔
”بھئی، مجھے کیا پتا؟ میں تو خود آپ لوگوں سے پوچھ رہا ہوں۔“
”لیکن، ابھی تو تم کہہ رہے تھے، میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔“ نمین تارا بولیں تو باقی سب نے تائید میں سر ہلایا۔
”بالکل۔ یہی تو کہا تھا اس نے۔“ مہ پارہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
”اوہ، بھئی..... آپ لوگ مجھے بھی تو بولنے کا موقع دیں نا۔“ سچ جھنجھایا۔
”ہاں، تو بول نا.....“ اب کے رضیہ سلطانہ بولیں۔
”بڑی امی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اندر

داخل ہوتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ آپ لوگ کوئی پلازہ وغیرہ بنوانے کی بات کر رہے تھے۔ تو پلازہ بغیر پیسوں کے تو بنتا نہیں ہے، تو مجھے یہی لگا کہ شاید آپ لوگوں کی کوئی لائری وغیرہ کھلی ہے۔ تب ہی تو آپ یہ کنسرکشن وغیرہ کی باتیں کر رہے ہیں۔

”سیاح نے اطمینان سے اپنی بات کی وضاحت کی مگر دوسری جانب سے انتہائی حیران کن رد عمل سامنے آیا۔ اسد الدین، مد پارہ، نین تارا اور رضیہ سلطانہ، اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”بھابھی!“ نین تارا نے مد پارہ کو مخاطب کیا۔ ”یہ..... سیاح کے کان خراب ہو گئے ہیں یا دماغ؟“

”میرا خیال ہے دونوں۔“ جواب اسد الدین کی طرف سے آیا۔

”پھوپھو.....“ وہ نین تارا کو دیکھ کر احتجاجا چلایا۔ ”کیوں کر رہی ہیں آپ ایسی باتیں؟“

”تو..... اور کیسی باتیں کریں؟ ہم نے تو کوئی پلازہ ولا زہ بنانے کی کوئی بات قطعاً نہیں کی۔ اب اگر تم نے ایسی کوئی بات اپنے کانوں سے سنی ہے تو شک تو جائے گا تاہم ہمارے کانوں پر یا پھر تمہارے دماغ پر۔“ نین تارا نے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”ایسا کرو بیٹا! ذرا اپنی یادداشت کو دوبارہ کھنگالو۔ شاید کوئی سرائل جائے۔“

اسد الدین نے مفت مشورے سے نوازا اور باپ کے مشورے کے عین مطابق، اس نے اپنی یادداشت کو کھنگالنا شروع کیا۔

”آں..... وہ.....“

اس نے سر جھکایا، پھر اٹھایا۔

حاضرین محفل کو منتظر نظروں سے اپنی جانب تکتا پا کر، اعتماد توڑا حشرزل ہوتا محسوس ہوا۔ دو انگلیوں سے سر جھکایا۔

”اچھا چلیں ٹھیک ہے۔“ بان لیا آپ لوگوں نے پلازہ وغیرہ بنوانے کی بات نہیں کی۔ مگر آپ لوگ دو چار اور چھ منزل کی بات تو کر رہے تھے نا۔ تو

جانتے تو میں نے سوچا، بچی کی سالگرہ منا لیتے ہیں۔“ رضیہ سلطانہ دھیمے دھیمے پوتے کو سمجھا رہی تھیں۔

”بڑی ائی! آپ کی یہ بچی سینتیس برس کی ہو چکی ہے۔ غالباً یہ بات آپ بھول رہی ہیں مگر خاندان والوں کو بہت اچھی طرح سے یاد ہوگی۔“

”اوپھوں، سینتیس نہیں، پچھتیس سال گیارہ ماہ تیس دن۔“ نین تارا نے صبح ضروری بھی۔

”ایک ہی بات ہے پھوپھو۔“ سیاح نے منہ بنایا۔ ”وہیے تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟“ مد پارہ کو بیٹے کا ناک بھول چڑھانا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”مطلب..... کہ..... آپ لوگوں کو اس سب میں اعتراض والی کوئی بات ہی نظر نہیں آ رہی۔“ سیاح پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

”اب تمہیں تو ہر بات پر ہی اعتراض ہوتا ہے۔ تمہارے اعتراضات کوئی کہاں تک دور کرے۔“

یہ اسد الدین تھے۔ اس کے اکلوتے والد جن کا وہ اکلوتا سپوت تھا۔

”آرام سے..... آرام سے..... مل بیٹھ کر بات کرتے ہیں نا۔ لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔“ رضیہ سلطانہ معاملے کو افہام و تفہیم سے حل کرنا چاہ رہی تھیں۔

”بات کیا کرتی ہے مل بیٹھ کر۔ سب کچھ تو آپ لوگ بالا ہی بالا طے کر لیتے ہیں۔ مجھے تو بس اطلاع فراہم کر دی جانی ہے، جیسے ابھی کی جارہی ہے۔“

”ہم نے کون سی اطلاع تمہیں فراہم کی ہے۔ وہ تو ہم دروازے کی ککڑی لگانا بھول گئے۔“ مد پارہ بولنے لگیں۔ ”اور تم نے اتفاقاً سب سن لیا ورنہ.....“

”جی ورنہ.....“ سیاح نے درمیان سے جملہ اچکا۔

”کسی دن میں اچانک شاپ سے واپس آتا تو کھر میں لوگوں کا جم خیمہ دیکھ کر خواں باشع ہونا شروع ہی کرتا کہ..... سامنے پھوپھو تالیاں بجا کر موسم ختم بھجائی، سوئی سے غمارے پھاڑتی نظر آئیں اور ابھی میں اس منظر میں ہی غم ہوتا کہ..... ایک سڑھی منگوائی

جاتی اور اس پر پھوپھو چڑھ کر اپنے چھ منزلہ کیک کی عمارت زمین بوس کرتیں۔“

سیاح نے تصویر کی آنکھ سے جو منظر کشی شروع کی تھی، وہ ابھی نہیں تک پہنچی تھی کہ نین تارا جوش سے کھڑی ہو گئیں۔

”ہاں، ہاں اور پھر لوگ تالیاں بجاتے۔ گفٹ میرے حوالے کرتے۔ کپڑے، میک اپ کا سامان.....“

وہ دل پر ہاتھ رکھے روشن دان کو نکلتے اس منظر میں کھوپچکی تھیں کہ رضیہ سلطانہ کی آواز انہیں واپس لے کر آئی۔

”بھئی، یہ جو سڑھی دلی بات ہے نا۔ یہ مجھے کچھ پسند نہیں آئی۔“

”ہاں تو اور کیا بھلا..... سڑھی کی کیا تک نفی ہے اس سب میں۔“

مد پارہ نے ساس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

(ایک تو یہ میری والدہ بھی نا اچھی بہو بننے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں) سیاح بے چارہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔

”سڑھی خیر کیسے کا نہیں گی چھ منزلہ کیک۔“ سیاح نے سر اٹھا کر پوچھا۔

”بھئی کوئی سڑھی دیر سڑھی دیکھ لیں گے۔“ نین تارا بولیں۔

”کری بھی ٹھیک رہے گی۔“ مد پارہ نے خیال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ



بسم اللہ

قیمت 400/- روپے

چش کیا۔

”اسی لیے تو میں کہہ رہا تھا، چار منزلہ بالکل ٹھیک رہے گا۔“ اسد الدین نے منظر میں انٹری ماری۔

”ہاں ہاں، مائی وجہ سے تو میں بھی کہہ رہی تھی دو منزلہ بالکل ٹھیک رہے گا۔“ مہ پارہ نے رائے فوراً سے پیشتر تبدیل کی۔

(اف! اچھی بیوی..... موقع مس نہ ہو جائے کوئی.....)

”ایک میرے علاوہ، اس گھر کا ہر بندہ بالکل ٹھیک بات کرتا ہے۔“

سمجھ کے انداز خطرناک ہوئے اور یہ انداز بگڑتے بگڑتے کیا بن جائیں گے، اس سے سب ہی خائف رہتے تھے دادی بھی، چچو بھی، ماں، باپ بھی۔

ایک تو اکلوتا، اوپر سے بیٹا، پھر حدود راجہ لاڈلا اور اس پر سب سے بڑی مصیبت..... بلا کا معاملہ فہم، ذہین اور سمجھدار۔ سو اس کے موڈ سے سب ڈرتے تھے مطلب منوڈ کے بگڑنے سے۔

اور سوڈو وہ تو اللہ اللہ..... بگڑا ہی رہتا تھا۔ چلیں، اس منظر کو کچھ دیر کے لیے یہیں چھوڑتے ہیں اور چلتے ہیں رضیہ سلطانہ کی دیورانی کی طرف.....

☆☆☆

کسی زمانے میں جب کہ انگریز نیا نیا برصغیر سے گیا تھا لیکن اپنا رعب داب یہیں پر چھوڑ گیا تھا۔ پرانے بازار کے نام سے مشہور ایک جگہ تھی، جہاں دبیر سنگھ کی پیشک لگا کرتی تھی۔

یہ اونچی سی حویلی، بڑے بڑے چوباروں والی۔ یہاں سے وہاں تک اور وہاں سے یہاں تک سارا شہر اس کو دبیر سنگھ کی حویلی کے نام سے جانتا تھا۔

لاری والے کو شہر کے پرلے کنارے سے بتادو، دبیر سنگھ کی حویلی جانا ہے۔ بغیر کسی اشارے یا مدد کے سیدھا حویلی کے سامنے لاری رکھی۔ جب بلوہ ہوا تو کچھ نہ کچھ آگ تو یہاں بھی بھڑکی۔ سو دبیر سنگھ تو اپنے بچے، خاندان، مال، اسباب سمیت کہ ہندوستان

عازم ہوا۔ اور خوش ہوتا رہا۔ اس کے الفاظ..... بڑی بڑی

سی پر شکوہ حویلی آئی نوراموچی کے نصیب میں۔ ہندوستان میں جو تیاں گانٹنے والے نوراموچی کو جب ایسی شان و شوکت والی حویلی نصیب ہوئی تو بس..... چند ماہ بعد ہی وہ بن گئے نور الدین سکندر۔

ہندوستان تاریک بھو کر ماں باپ اور چھوٹے بھائی کو بھی بلوایا۔ اب کیا تھا کہ جو تیاں گانٹھا تو یوں بھی کچھ معیوب سامعوس ہونے لگا کہ نور الدین سکندر اب جو تیاں سلائی کریں گے تو یہ تو یہ کسی اور کام کا مجر بہ تھا۔

سو بھاگ دوڑ کر کے حویلی کے کاغذ بٹالے۔ اس بھاگ دوڑ میں چھوٹے بھائی نے خوب جانتناشی سے حصہ لیا تو جب کاغذ بن کر آئے تو معلوم ہوا کہ یہ حویلی دونوں بھائیوں کے نام ہے۔ یعنی آدھا حصہ اتا فونی طور پر نور الدین سکندر کا تھا اور باقی کا آدھا حصہ معین الدین حیدر کا۔ نور الدین تملائے تو بہت پر کر کچھ نہ پائے۔

سو جب اور کچھ نہ کر پائے تو اپنے سے کسی برس چھوٹی رضیہ سلطانہ سے نکاح کر لیا۔ رضیہ سلطانہ اپنی ذات میں بے ضرر سی خاتون تھیں۔

دیور کے رشتے کی بات ہوئی تو اپنی خالہ زاد بہن کا رشتہ چش کر دیا۔ شادی ہو گئی۔ مصیبت..... معین الدین کی دلہن بن کر آئیں۔

یہاں سے ہوا ایک نئے دور کا آغاز۔ مصیبت ضرورت سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئیں۔ آتے ہی حویلی کے درمیان دیوار اٹھوادی۔ پچھلے حصے کو الگ کر کے کرائے پر لگا دیا۔ کوئی دس مرلہ رہنے کے لیے چھوڑ باقی دکانوں کی ضرورت کرائے پر چڑھا دیا۔ بن بر سے لگا معین الدین کے گھر پر۔

گور رضیہ، مصیبت کے چھپی سمجھ دار تو نہ تھیں پھر بھی دیکھا دیکھی ایک منزل انہوں نے بھی کرائے پر چڑھا دی۔ گھر کے پچھواڑے مارکیٹ بنا کر ایک دکان خود رکھی۔ کپڑے کا کام شروع کیا۔ باقی کرائے پر لگا دیں۔ مالی آسودگی نے بے فکری میں اضافہ کیا۔

رضیہ سلطانہ اور نور الدین کے دو بچے ہوئے۔ اسد الدین اور معین تارا۔

مصیبت اور معین، اللہ تعالیٰ اولاد کا نعمت سے محروم

رہے۔ ایک بچی گود لے کر پال لی۔ شاہدہ..... شاہدہ معین الدین۔ نور الدین نے دکان پر ایک قابل اعتبار ملازم رکھا امین بلال۔ اچھا، سلجھا ہوا انسان تھا۔ کئی برس ان کے ساتھ گزارے۔

نور الدین نے رضیہ سلطانہ کے کان میں بات ڈال دی کہ میں تارا کے لیے امین بلال مناسب رہے گا۔ پیغام کی ذریعے سے امین بلال کو بھی پتہ چلا دیا گیا۔ اس کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

یہاں پر کہانی نے اچانک ہی غنفل ٹرن لیا۔ نور الدین دکان پر بیٹھے بیٹھے گرے اور پھر بھی نہ اٹھ سکے۔ اچانک موت۔ رضیہ سلطانہ عم زدہ حیران پریشان۔ اسد الدین نے معاملات سنبھال لیے اور سنبھالے بھی خاصی سمجھ داری سے۔ گوجالاک اور تیز طراری اس کی فطرت نہ تھی۔ پھر بھی نظام بہتر سے بہتر بن کی طرف چلا۔ تب ہی ایک دن معین الدین اور مصیبت چلے آئے۔ اسد الدین کو اپنی فرزندگی میں لینے۔ رضیہ، سیدی سادی ضرور تھیں، بے وقوف نہیں تھیں۔ اعتراض تو ان کو دیور، دیورانی کی چالاک اور مکار فطرت پر تھا۔ پرانگاری کی وجہ انہوں نے شاہدہ کے لے پا لک ہوئے کو بتایا۔ اس کے بعد جو دار مصیبت نے کیا، اس پر رضیہ سادی زندگی بیلانی ہی رہیں۔

ہوا کچھ یوں کہ امین بلال اور معین تارا کے نکاح کے دن تاریخ طے ہونے جا رہے تھے۔ جس دن بات چیت طے ہونا تھی، بالکل اچانک ہی ایک بم سب کے حواسوں پر گر ا تھا۔

☆☆☆

”دیکھ ناقتب! امیں اس سے زیادہ تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بری سوری۔“ مدثر نے صاف صاف بات کی۔

”سنا تھا، مصیبت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ آج دیکھ بھی لیا۔“ ناقتب نے لہجہ کو آزرہ بنانے کی پوری پوری کوشش کی۔

”میں تیرا سایہ نہیں ہوں۔“ مدثر بالکل متاثر نہیں ہوا۔

”دیکھ چند دن اور..... اس کے بعد میں خود

دنیا بھر سے منتخب ستیری ادب

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

اپریل

2019

کے شمارے

ایک ٹھیک

سلطان محمد فاتح

ملت اسلام کے لازوال کردار ”سلطان محمد فاتح“ کے کارہائے نمایاں کی سچی آموز داستان

محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ کہانی کی ایک اور کڑی،

فسانۂ عجائب

ایک شقی اکتب شوہر کی کہانی جس نے اپنی ایلاج ہی پر رحم نہیں کیا،

اہم الیاس کی سچے پرچہ جو کر دیتے والی تحریر،

قاتل چھریے

مذاقت بھر کر کھڑا آجما کیو جوان کی حکایت جو کل کی

داروات کا بھی شاہکار،

صائمہ عروج کا منتر و اعجاز،

مراد عالی

انسان جو بڑا ہے اسے وہی فصل کاٹنی پڑتی ہے،

جاوید راہی کے قلم سے چھلنے پانے والی یادگار کہانی،

یقین کیوں نہ ہوتا

ایک پیچ پر بھٹک گئے کسی حسین انجمن کی پمٹی ہوئی

محبت کی شاعری سے محروم کر دیا تھا،

صدف ہنوت راحت کے قلم کی روانی،

کاش کہ

ڈالر کے دوران اپنے والدین سے مجھڑے ہوئے ایک بچے کا حساسات،

سلیمان حبیب کے قلم کا چادر،

اس کے علاوہ ادیب ندیس کی رومنس، سمینس اور ٹیونس سے

بھرپور 9 مشہور معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

اپریل 2019 کا شمارہ شاہدہ معین الدین

یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ ثاقب نے لہجے میں حد درجہ لیا جنت سمولی۔

”ایک دن بھی اور نہیں۔ کل امی، بابا واپس پہنچ رہے ہیں۔ تجھے آج ہی جانا ہوگا۔“

”مڈر! ایسا نہ کریا۔“

”دیکھ ثاقب! امی بابا کے علم میں بالکل بھی نہیں ہے کہ ان کے عمرے پر جاتے ہی میں نے تجھے یہاں رکھ لیا تھا۔ اب یہ نہ ہو کہ تجھے یہاں دیکھ کر وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں۔“

آپا پھر تو بڑا مزا آئے گا۔ دونوں دوست مل کر کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لیں گے۔“ ثاقب نے مزہ لیا۔

”تو خود جا رہا ہے یا میں سامان اٹھا کر باہر پھینکا شروع کروں۔“ مڈر آرام سے گویا ہوا۔

”میں کہاں جاؤں گا؟“ ثاقب نے بے بسی سے پوچھا۔

”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔“ مڈر نے کندھے اچکائے۔

”میرے پیرا تو ہے نا۔“ ثاقب کی پریشانی اس کے چہرے پر لکھی تھی۔

”تو نمٹ اپنے مسئلوں سے۔“

”کیسے نمٹوں؟“

”معافی مانگ لے، اپنے ماما، بابا سے۔“

”وہ تو میں مانگ ہی لوں جو وہ میرا فون اٹھالیں۔ کتنے دن سے، کتنے ہی نمبرز سے ٹرائی کر چکا ہوں۔ پر نہ ماما کال ریسیو کر رہی ہیں نہ بابا۔“ ثاقب نے پریشانی مسلتے ہوئے کہا۔

”ویسے تیرے جیسی نا فرمان اور نالائق اولاد کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے ماں باپ کو۔“

”نالائق..... کیوں؟ پورے کالج میں ٹاپ کیا ہے میں نے۔“ اس نے فخر سے گردن اگڑائی۔

”ماں باپ کو دھوکا دیا ہے تو نے۔ وہ بے چارے مقصد سے ہوسٹل کے بل، خرچہ، ہر طرح کی آسائشات تیرے لیے مہیا کرتے رہے کہ بیٹا انجینئر بن رہا ہے اور بیٹے صاحب آخر میں فیشن ڈیزائننگ ایئرلینڈ کی ڈگری اٹھائے، ہاتھ لہراتے آئیں گے۔ لو

اماں بابا، تمہارا میک اپ بہت اچھا کروں گا میں۔ میں ہوتا نا ان کی جگہ تو اسے جوتے لگاتا کہ تو ساری زندگی یاد رکھتا۔“

”ابھی بھی تو مجھے اسنے جوتے تو لگائے ہی چکا ہے کہ میں ساری زندگی یاد رکھوں گا۔“

”میں ان کی جگہ ہوتا تو کبھی تیری شکل نہ دیکھتا زندگی میں.....“

”وہ بھی یہی کہہ کر مجھے ہیں۔“

”تو یہ ایسی نا فرمان اور دھوکے باز اولاد والدین آئے کہ ساری زندگی کی کمائی ہمارا اکلوتا ڈلاسپوٹ انجینئر بن گیا ہے اور بیٹے صاحب..... تو تو یہ.....“

”تو انہوں نے بھی تو بدلے لے لیا ہے پورا پورا۔ خرچا پانی بند کر دیا ہے۔ تمام رشتے داروں کو رخ کر دیا ہے کہ کوئی اسے اپنے گھر کے اندر نہ گھسنے دے۔ میں نہیں پڑھنا چاہتا تھا انجینئرنگ۔ اپنی مرضی کے مضامین پڑھنا چاہتا تھا۔ یہ کیا اتنا ہی بڑا قصور تھا جس کی اتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔“

”بیٹا! یہ جذباتی تقاریر کرنا اپنے اماں، بابا کے سامنے۔ ان کا دل سوج ہوگا یہ باتیں سن کر۔ مجھ پر تیری ڈائلاگ بازی کوئی اثر نہیں کر رہی۔“

”وہ تو آئیں گے اب چھ ماہ بعد اور پتا نہیں آئیں گے بھی یا نہیں۔ ساری زندگی سے تو ہم باہر بیٹھ ہیں۔ پڑھائی کے لیے میں ادھر آ گیا، ہاسٹل سیٹ رہا۔ گھر بار ہے نہیں۔ ماں باپ ناراض۔ خرچے پانی کی کوئی سہیل نہیں ہے، اب بتا کروں تو کیا کروں۔“ بس رو نہیں پڑا بے چارہ۔

”ایسا کہ وہ جو ماں باپ کو دھوکا دے کر ڈگری لی ہے نا.....“

”آگ لگا دوں اس کو۔“ ثاقب نے بات مکمل نہیں کرنے دی اس کو۔

”نہیں، فریم کر داکر، سینے سے لگا کر صبح شام چوما کر۔“

”کوئی ایسا مشورہ دے جو قابل عمل بھی ہو اور فائدہ مند بھی۔“

”ہوں.....“ مڈر نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر ثاقب کی ٹھوڑی پر رکھا۔ ”ایسا کر، خود کشی کر لے۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ ثاقب نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

”اس سے تیری جان زندگی کے جھیلوں سے چھوٹ جائے گی۔“

”بارا میں سیر لیس ہوں۔“ ثاقب ہنسیا لیا۔

”لیکن میں بہت تانی (شریر) ہوں۔“ مڈر مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا کروں؟“ ثاقب مڈر کو دیکھا اور پھر بے چارہ سر کچڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

امین بلال اور شاہدہ معین الدین کا نکاح ہو گیا۔ یہ خبر سب سے پہلے اسد الدین نے سنی اور تصدیق سے پہلے پہلے ہی جھگ کی آگ کی طرح پھیل گئی پھر بعد میں تصدیق بھی ہو گئی۔

جو لوگ مسجد میں نکاح میں شریک ہوئے تھے وہ فردا فردا آ کر اسد الدین کو اطلاع دے کر اپنا اپنا فرض پورا کر رہے تھے۔

شام میں امین بلال بھی آ گیا۔

”مجھے معاف کر دیتا، میں مجبور ہو گیا تھا۔“ بس اتنا کہہ کر چل بیٹا۔

یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ بے چارہ لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔

میں تارا سے شادی میں بھی کشش یہی تھی کہ بنا بتایا گھر ہے۔ آرام سے گھر داماد بن کر رہوں گا۔ قصے اور معین الدین نے اس سے بھی زیادہ دل خراب پہنچ پیش کر دیا۔

شاہدہ سے نکاح کی صورت میں وہ گھر جو دیکھواڑے کو انہوں نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔ وہ امین بلال کے نام کرنے کی پیشکش کی۔ بدلے میں شاہدہ کے حق مہر کی رقم مکان کی مارکیٹ ویلیو کے حساب سے پچیس لاکھ ملے ہوئی۔

مطلب اگر کبھی امین بلال کی نیت میں فتور آئے اور وہ شاہدہ کو چھوڑنے کی کوشش کرے تو اسے پچیس لاکھ نقد ادا کرنے ہوں گے۔ یوں سودا ملے پانچیا۔ سودے بازی، رشتے داری میں بدل گئی۔

دونوں گھرانوں کے تعلقات پہلے بھی کچھ اچھے نہ تھے، اب مزید کشیدہ ہو گئے۔

رضیہ، اسد الدین کے لیے ماہ پارہ کو بیاباہ لائیں۔ اسد اور ماہ پارہ کو اللہ نے ایک ہی بیٹا دیا۔ سچ الدین۔ حسن اتفاق شاہدہ اور امین کو بھی اللہ نے ایک ہی بیٹی دی۔ مسفرہ..... مسفرہ امین۔ دونوں گھرانوں کے خیالات جدا، زندگی کا نظریہ جدا، گھر جدا جدا۔

پرایک چیز سماجی رہائی چھت..... اسی چھت پر، بھاگتے دوڑتے، کھیلنے کودتے۔ اپنے بڑوں کی لڑائیوں، رنجشوں سے بے نیاز، دونوں کا بچپن گزرا۔ گزر بھی گیا۔

پتا ہی نہیں چلا۔ چپ چاپ، جوانی آئی۔ وہ بے قدموں، بائبل خاموشی سے۔

اور پھر پتا دونوں کو ہی نہیں چلا کہ وہ کب ایک دوسرے کے اسیر ہوئے۔ کب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوئے۔ وہ مسفرہ امین کی اور اس کے بعد مسفرہ سہج ہو جانے کی۔

اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی پر وہ مسفرہ امین سے مسفرہ سہج کیسے ہو پائے گی۔ اس پریشانی نے آج کل سہج کی نیندیں اڑائی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”سہج! میرے بچے، مجھے بتا۔ ہم نے آج تک تجھے اعتماد میں لیے بغیر کوئی قدم اٹھایا ہے۔“

بڑی امی سہج کو پچکار رہی تھیں۔

”بڑی امی! آپ مجھے بتائیں۔ آپ لوگوں نے کبھی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے بتایا ہے۔“

سہج کے سوال پر سب بھٹکیں جھانکنے لگی۔

”ہمیشہ سب کچھ ملے کرنے کے بعد مجھے بتایا جاتا ہے۔ آج بھی جو اتفاقاً دروازہ کھلا نہ رہا جاتا.....“

”ہزار بار تمہیں کہا ہے، دروازے کی کنڈی

چیک کرتی رہا کرو۔" اسد الدین مد پارہ پر رہے۔
"بس غلطی ہوئی۔"

"ہاں جی۔ غلطی ہوئی، ورنہ ایک آجاتا۔ تب بھی مجھے نہ بتایا جاتا۔ وہ بھڑک اٹھا۔

"نہیں نہیں، تب تو بتائی دیتے۔" نین تارا بولیں۔
"ہاں تو اور کیا؟ تب کیسے چھپا سکتے تھے۔" مد پارہ بولیں۔

"آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ یہ سا لگرہ والا آئیڈیا یا تھا کس کا آخر؟"

"نین کا۔۔۔۔۔" اسد الدین نے اشارہ کیا۔
"اسی کا۔۔۔۔۔" نین کی انگلی رضیہ کی جانب اٹھی۔

"مد پارہ کا۔" رضیہ سلطانہ بہو کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

"ان کا۔۔۔۔۔" مد پارہ کی انگلی میاں کی جانب اٹھی۔
"سیج نے سر پکڑ کر ان چاروں کو دیکھا جن کی انگلیاں ایک دوسرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آخر ضرورت کیا پیش آئی تھی۔" اس کا دماغ ابھی تک اسی بات میں الجھا ہوا تھا۔
"بتایا تو ہے، لوگوں کو اکٹھا کرنے کا بہانا۔" مد پارہ بولیں۔

"اسی۔۔۔۔۔" مہر پر خاصا زور دے کر بولا۔ "میں پوچھ رہا ہوں، سا لگرہ ہی کیوں۔" میلا وہ قرآنی خوانی۔

"کچھ اور بھی تو کروایا جاسکتا تھا۔"

"ہاں، ہاں۔۔۔۔۔ پہلے میلا وہی کا سوچا تھا۔" مد پارہ جلدی سے بولیں۔

"پھر۔۔۔۔۔" وہ جواب کا منتظر تھا۔
"پھر۔۔۔۔۔" مد پارہ نے میاں کو دیکھا۔

"پھر۔۔۔۔۔" اسد الدین نے ناں کو دیکھا۔
رضیہ نے نین کو دیکھا اور نین بولیں۔

"پھر ہم نے اکڑ بکڑ کیا تھا۔"

"اوہ میرے خدا! آخر ہم کب اس اکڑ بکڑ کو چھپا چھوڑ دیں گے۔"

"بھئی نہیں۔" بیک وقت وہ چاروں بولے۔
☆☆☆☆

"نہ لے، سیج سے بات کر۔" مدثر نے کال ملا کر قاتب کو پکڑا ہوا بابل۔

"ہاں۔۔۔۔۔ سیج۔۔۔۔۔"

"کیسا ہے شہزادے؟"

"اچھا سن، بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں میں۔" قاتب نے مدعیانین کرنا شروع کیا۔

جب تک وہ بات کرتا رہا۔ مدثر اس کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر دس چندرہ منٹ بعد اس نے سیج سے دعا سلام کر کے موبائل مدثر کو دیا۔

"کیا بتاؤ؟"

مدثر سوالیہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"یار اوہ بڑا اور اچک کے پاس جو بچوں کا پارک ہے، وہاں بلا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے، سامان لے کر آ جا۔"

مدثر نے کچھ بندوبست۔
"دیئے بہت بہتر ہوگا اگر تو اپنے والدین کو منانے میں کامیاب ہو جائے۔"

"جی، مان بھی ضرور جائیں گے جو میرا فون اٹھالیں تو۔۔۔۔۔"

"چل، میں دعا کروں گا تیرے لیے۔"

مدثر نے غلوں دل و غلوں نیت سے کہا۔
☆☆☆☆

وہ دونوں ایک سنگی سیج پر بیٹھے پانی کے تالاب میں تیرتی تھیں دیکھ رہے تھے۔

"یارا بات یہ ہے کہ دو چار دن کی بات اور ہے، پر ایسے مستقل طور پر۔۔۔۔۔ شکل ہو جائے گا۔"

"یہ بات بتانے کے لیے تو نے مجھے مدثر کے گھر سے یہاں بلوایا ہے۔ تجھ سے تو وہ بہتر ہے۔ جس کے گھر میں جھگڑے میں دن سے رہ رہا تھا۔"

قاتب کو اس کی بات سن کر غصہ آ گیا۔
"بات تو پوری کر لے۔" سیج نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"سننا۔" اس نے سر اٹھایا۔
"میرے گھر والے بہت عجیب و غریب سے لوگ ہیں۔ بہت بچوں والی سی عادات ہیں ان کے۔"

"یعنی تیرے چھوٹے بہن بھائی وغیرہ۔ ان کی بات کر رہا ہے۔"

"نہیں۔ میری دادی، امی، ابو اور چھو پھو۔ بس یہی پانچ افراد ہیں ہم گھر میں۔ میرے گھر والوں کی زندگی کے آدھے معاملات اکڑ بکڑ پر طے پاتے ہیں۔"

"اکڑ بکڑ۔"

"کیا مطلب؟" قاتب حیران ہوا۔

"مطلب میں سمجھانا ہوں۔" سیج سیج کے ذرا کنارے کی طرف کھسکا۔ درمیان میں کچھ خالی جگہ بن گئی۔

"چل اب اپنا باباں ہاتھ پھیلا کر یہاں رکھ لے۔ ایسے۔۔۔۔۔"

اس نے اپنا ہاتھ سیج پر ایسے پھیلا کر رکھا کہ سیج والی طرف بھی اور ہاتھ کی پشت اوپر کی طرف۔

قاتب نے کچھ حیران ہو کر اس کی تقلید کی۔
"اچھا، تو ہمارا مسئلہ یہ ہے۔" سیج نے بولنا شروع کیا۔

"اوں۔ ہمارا نہیں میرا۔" قاتب نے ٹوکا۔
"ایک ہی بات ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میں اتنے دن تک تیری رہائش کا بندوبست کر دوں۔ جب تک تو کمانے کے لائق نہیں ہو جاتا۔"

"یارا کمانے کے لائق تو میں ابھی بھی ہوں۔ ایسے بول کہ جب تک مجھے نوکری نہیں مل جاتی۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ وہی اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ نین، چار دن مجھے مہمان ٹھہرا سکتا ہوں۔"

"ہوں۔۔۔۔۔" قاتب نے گردن ہلائی۔
"اب میں اکڑ بکڑ کروں گا۔ تو اگر تو آخری بول تیرے ہاتھ کی کسی انگلی پر ختم ہوئے تو ہم وہ کرنے کے پابند ہوں گے جو تو چاہتا ہے اور اگر بول میرے ہاتھ کی کسی انگلی پر ختم ہوئے تو ہم وہ کرنے کے پابند ہوں گے جو میں چاہتا ہوں۔"

"آگئی سمجھ میں بات۔"

"ہوں، آگئی۔" قاتب نے سر ہلایا۔

"شروع کریں پھر۔" سیج نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوں۔"

"شروع کریں پھر۔" سیج نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوں۔"

کالے اور سفید امتزاج کے سنگ مرمر کے سیج پر بیٹھے وہ دونوں جوان، اپنے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیلائے ہوئے تھے۔ سیج نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی، قاتب کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر رکھی اور بولنا شروع کیا۔

"اکڑ بکڑ مجھے ہوا، اتنی فوے، پورے سو۔ سو سے نکلا دھاگا، چورنگل کی بھاگا۔۔۔۔۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور ہر بول کے ساتھ اپنی انگلی اٹھا کر باری باری اپنی اور قاتب کی انگلیوں کو چمکاتا جا رہا تھا۔

"اچھا کھانا کھائیں گے۔۔۔۔۔ صاب بن کر آئیں گے۔۔۔۔۔ ذیل بولی چمکا چمک۔۔۔۔۔ صاب بولا ویری گڈ۔۔۔۔۔ ذیل روٹی بسکٹ۔۔۔۔۔"

اختتام سیج کے ہاتھ کی درمیانی والی انگلی پر ہوا۔ قاتب نے مایوس ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تو زیادہ سے زیادہ نین چار دن میری میزبانی کر سکتا ہے۔"

"نہیں، یہ تو ٹرائل تھا۔ ذیل ہونا تو ابھی باقی ہے۔"

"کیا مطلب؟" قاتب نے نا سمجھی سے اس کی شکل دیکھی۔

"دیکھو۔ میں تو بچپن سے اپنے گھر کے کم دیش تمام چھوٹے بڑے معاملات اسی اکڑ بکڑ پر ہوتے دیکھ رہا ہوں۔"

"مثلاً۔۔۔۔۔" قاتب کو خاصی دلچسپی محسوس ہوئی۔

"مثلاً یہ کہ کسی کام کے معاملے میں اگر فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ یہی کریں گی یا چھو پھو تو اس کام کا فیصلہ اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ کہیں جانے کے سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہو تو کس جگہ جانا چاہیے اس کا فیصلہ بھی اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ میری چھو پھو کے لیے آئے

کام کا فیصلہ اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ کہیں جانے کے سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہو تو کس جگہ جانا چاہیے اس کا فیصلہ بھی اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ میری چھو پھو کے لیے آئے

کام کا فیصلہ اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ کہیں جانے کے سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہو تو کس جگہ جانا چاہیے اس کا فیصلہ بھی اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ میری چھو پھو کے لیے آئے

کام کا فیصلہ اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ کہیں جانے کے سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہو تو کس جگہ جانا چاہیے اس کا فیصلہ بھی اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ میری چھو پھو کے لیے آئے

ہوئے اکثر رشتوں میں اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی کوئی بات کسی کو پسند نہیں آ رہی۔ کبھی کوئی..... تو ایسے میں.....

”تو ایسے میں بھی اکثر بکوں کے ذریعے ہی فیصلہ ہوتا تھا۔“ ثاقب نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔ ”بالکل.....“ سمجھنے لگا۔

”یہاں تک کہ میرے نوکری یا کاروبار کرنے کے معاملے پر بھی اختلاف رائے ہو گیا تھا۔“

”تو اس کا فیصلہ بھی اکثر بکوں کے ذریعے ہوا تھا۔“ ثاقب جس قدر اچھی آواز میں جیج سکتا تھا، جیج کر بولا۔

”سمجھنے لگا۔“ ثاقب نے اشارت میں سر ہلایا۔

”یار! کون لوگ ہوتے ہیں؟“ ثاقب اپنی زبان پر ہاتھ مار کر بولا۔

”بس کچھ ایسے ہی بچکانہ طریقے سے چلتے ہیں ہمارے معاملات۔“

”تو یہ جو تیری نوکری اور کاروباری والے معاملات میں اختلاف تھا، یہ کن کن کے درمیان تھا؟“

ثاقب اپنا مسئلہ بھول بھال، سمجھنے کے معاملات دلچسپی سے سن رہا تھا۔

”گپیں کر.....“ سمجھنے لگا۔

اب کے جواب اثبات میں ملنے کی توقع تھی۔

”سمجھنے لگا۔“ ثاقب نے پھر دائیں بائیں گردن ہلاتی۔

”تو پھر..... پھوپھو اور ابو؟ ٹھیک بتایا نا۔“ وہ خطر نظروں سے اسے دیکھتا بولا۔

”نہیں.....“ سمجھنے لگا۔

”یار! بس کراب یہ کوئی..... خود ہی بتا دے۔“

”میں.....“ اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ ”اور باقی کے تمام لوگ۔“

”ہاں.....“ ثاقب حیران ہوا۔

”ہاں۔ میں چاہتا تھا، کاروبار کروں۔ باقی سارے گھر والے چاہتے تھے میں نوکری کروں۔ ان کو لگتا تھا کہ اپنا کام کرنے سے میری ایم بی اے کی ڈگری ضائع ہو جائے گی۔“

”تو پھر یہ فیصلہ بھی اکثر بکوں نے کیا تھا کہ تجھے کیا کرنا ہے؟“

”ہاں.....“ سمجھنے لگا۔

”یار! یہ اکثر بکوں تو بڑا عظیم نسخہ ہے تیرے گھر کا۔“

”اور میں چاہتا ہوں تو یہ مسئلہ حل کروا دے۔“

”یہ ایک مسئلہ ہے؟“ ثاقب نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

”مسائل کا انبار ہے یہ..... جب تک تیری پھوپھو کنواری ہیں، تیری شادی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو ان کی عمر اس قدر زیادہ ہو چکی ہے، اس پر بھی کوئی رشتہ ان کو پسند نہیں آتا۔“

”اب تو رشتہ آتا ہی نہیں۔ پسندنا پسند کی بات تو دور کہیں رہ گئی۔“ سمجھنے لگا۔

”اور پرے تیری کزن، جہاں تو دل لگا بیٹھا ہے۔ اس کے نانا، نانی، تیرے دادا، دادی کے ساتھ اللہ جانے کیا کیا دھوکا بازیاں کر چکے ہیں۔ پھر وہ تیرے ہونے والے سر جو لالچ میں اندھے ہو کر تیرے پھوپھو بچنے بچنے رہ گئے۔ یار! یہ مسئلہ حل کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ تو اپنے اکثر بکوں سے حل کر دیا۔ اپنی شادی والا مسئلہ۔“

”اب اکثر بکوں ایسا بھی کوئی بزرگ نہیں ہے، جو اس طرح کے مسئلے حل کروا دے۔“

”تو میں کیا شکل سے بہت بڑا بزرگ لگ رہا ہوں۔“

”دیکھ ثاقب! مسئلہ تیرا بھی کوئی ایسا آسان نہیں ہے۔ ڈیل کر لے میرے ساتھ۔ تو میرا مسئلہ حل کروا، میں تیرے مسئلے کے بارے میں غور و فکر کرتا ہوں۔“

”یہ لے.....“ ثاقب نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”مجھے معاف کر دے۔“

”یار! تو خواہ تو خواہ گھبرا رہا ہے۔ تجھے صرف ایک ٹھٹھک کرنی ہوگی میرے گھر والوں کے سامنے۔ ڈائریکشن، پروڈکشن میری اپنی ہوگی۔“

ثاقب چند لمحے غور کرتا رہا۔

اسی نوے پورے سو

سو سے نکلا دھاگا

چورنگل کے بھاگا

اچھا کھانا کھا گیس کے

سایہ بن کے آئیں گے

رنگ بولی چکا چھک

صاحب بولا دیری گڈ

ڈبل روٹی بکٹ

اختیار اب کی بار بھی سمجھ پر ہی ہوا تھا۔

اور یہ ٹرائل ٹیس تھا۔

☆☆☆

سرخ بڑے بڑے گلابوں والی کالی قمیص پہنے وہ

لڑکی اور براؤن پیٹ پر سرسری شرٹ پہنے۔ پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا وہ لڑکا۔ سر اٹھا کر ایسے

گھروں کو لوٹے پرندوں کو تنک رہے تھے گویا اسی مقصد کے لیے کھڑے تھے۔

ہوا سے اڑتے دوپٹے کو ہاتھوں سے پکڑتے،

کلائی میں بڑی کالج کی چوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر خاموش ہو گئیں۔

سمجھنے لگا۔

پھر دوبارہ سے پرندوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”سمجھ! پگیز کچھ کر دنا..... کل پھر سے بوا کوئی لڑکے والے لار ہی ہیں۔ اگر وہ مجھے پسند کر کے تو کیا ہوگا۔“

مسفرہ اوپر تلے آنے والے ان رشتوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی بے چین ہو گئی تھی۔

”بے فکر ہو تم..... اب تک کوئی پسند کر کے گیا ہے تمہیں، جو یہ لوگ کر جا سکیں گے۔“

بظاہر سمجھنے لگا۔

پریشان تھا، یہ وہ کم سے کم مسفرہ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”سمجھ! ای نے وہی حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو نانا، نانی (مرحوم) نے ابو کو پھنسانے کے لیے کیا تھا۔“

کوش گزار کر دی۔

اس نے الف سے

تک اپنی ساری کہانی، چار پانچ منٹ میں ثاقب کے

کوش گزار کر دی۔

”کیا.....؟“ حنیٰ حنیٰ نکل گئی بے چارے کی۔
 ”ہاں..... وہ ابو سے کہہ رہی تھیں کہ رشتے والی
 بوائے کہہ دیتے ہیں کہ لڑکی کے نام گھر کریں گے۔
 پھر دیکھنا کیسے ہوتا ہے رشتہ اور کیسے ہوتی ہے شادی۔“
 ”یار! یہ تو واقعی پریشانی والی بات ہے۔“ سمیع
 بے چارہ بوکھلائی گیا۔
 ”تو اور کیا بتا رہی ہوں میں، تمہیں اتنی دیر
 سے۔ میں کیا کر رہا ہوں سمیع؟“
 ”ایسا کرو، خود کٹی کرلو۔“ سمیع نے فوراً مشورہ
 پیش کیا۔

”تو تم رہو لو گے میرے بغیر؟“
 ”نہیں، مجھے تمہارے بغیر نہیں جینا۔“ اس نے
 گردن ہلائی۔

”تو تم بھی خودکشی کر دے؟“
 ”نہیں، اب مجھے تمہارے ساتھ مرنے کا بھی
 کوئی ارمان نہیں ہے ایسا۔“

”سمجھ لیجئے کہ رہا ہے میرے مرنے کے بعد بھی ناتمام ایسے عیاں ہو گئے۔“

بن جانا چاہیے؟ یا مجنوں ہو کر، کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں بھاگ جانا چاہیے۔“

”کرتا ہوں۔۔۔۔۔ روزِ صبح سے شام تک شاپ پر سکسٹر کو ڈیل۔“

”ہمارے رشتے کے سلسلے میں۔۔۔۔۔“

وہ زوج ہو رہی گی بری طرح۔ سب کے غیر شیعہ
روپ پر۔

بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ تمہارے امی، ابو اور چھوڑے ہوئے
رشتے والی۔ مسئلہ تو میرا ہے، جب تک عین پھوپھو کی
شادی نہیں ہو جاتی، میری شادی کا تو ذکر بھی کیسے ہو سکتا ہے۔

نصرت ہوگا اور میں چھو پھولی شادی..... حق ہے۔۔۔ سمیرا کا مسئلہ حل ہو جائے گا، ہندوستان پاکستان کے قبضے میں آجائے گا..... سعودی عرب، ایران بھائی بھائی بن

”تو پھر اگر بکواسے کس چیز کا فیصلہ کرنا تھا آپ
 فرما“ ”سچ ایک ایک کا فیصلہ دیکھنا تھا۔“

”وہ.....“ اسد الدین نے رضیہ سلطانہ کو دیکھا۔

”ارے یہ... مہ پارہ بتائے گی۔“
رضیہ سلطانہ نے بھوکے کورٹ میں گیند اچھالی۔

”ابن ہاشم بن عبد مناف“

”وہ ہم نے فیصلہ کرنا تھا کہ ساگرہ تپ کی منائی جائے تو اس کے لیے اکر کو کیا تھا۔“

”اووف..... وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔“ ساگرہ بھی

”کیوں؟“ اس کو اپنے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔
 سب خاموش ہو گئے۔
 ”خاندان والے کتنی ہی اڑاؤں مے، کچھ

اسلام آباد ہے آپ لوگوں کو۔ آج تک اس گھر میں مٹاکی لگئی ہے کسی کی سالگرہ۔“

”ہاں تب ہی تو.....“ مہ پارہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔
”کبھی منائی جو نہیں گئی۔ اسی لیے تو منار ہے۔“

”اور بڑی امی! آپ..... آپ کچھ تو سمجھایا کریں ان لوگوں کو۔“

میری۔ ”رضیہ سلطانہ نے صفائی پیش کی۔
 ”کیا سمجھایا تھا؟“ سمجھ کے کان کھڑے

”کہا تھا قرآن خوانی کروالو۔“

اب نرمان جوانی پر یس پادر سے تیار ہوں

”شکر ہے.....“ اس نے سکون کی سانس لی۔
 ”شکر ہے، مطلب تم خوش ہو۔“ نین بولیں۔
 ”جی..... بہت خوش ہوں اور شکر کر رہا ہوں کہ
 اس گھر کو جینز میں لے جانے کا فیصلہ نہیں کر لیا آپ
 نے۔“ اس نے گھر کی طرف اشارہ کیا۔
 ”جینز میں کیوں لے جائے گی، گھر داماد کھیں
 گے امین بلال کی طرح۔“ رضی بولیں۔
 ”اے یہ امین بلال حواسوں پر آج بھی سوار
 ہے۔“ وہ بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

☆☆☆

بھڑکتا، سرخ کام والا سوٹ۔ میک اپ ہے
 تھڑا ہوا چہرہ۔ لمبی، گھٹی، کالی سیاہ زلفوں کی ٹھنی
 چوٹی..... لمبی لمبی، اوپر کو مڑی ہوئی آرمیٹھل
 پٹلیں..... سرخ انگارہ لپ اسٹک..... تیار پوری
 طرح مکمل تھی۔

”یار انا تو میں تجھے اپنی بڑی بہن رہا تھا، پر ذرا
 زیادہ ہی بڑی لگ ہوئی ہے۔ اب تو میری آنٹی لگ
 رہا ہے۔“ ثاقب نے میک اپ مکمل کر کے تبصرہ کیا۔
 ”یہ جو تو نے کھسروں والا میک اپ کر دیا ہے
 میرے منہ پر۔ یہ تیرا ٹیلنٹ ہے۔ اس کے پیچھے ماں
 باپ کو ناراض کیا۔“
 سچی کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز برآمد
 ہوئی۔

”ہااا.....“ ثاقب نے زوردار قہقہہ لگایا۔
 ”ایمان سے تیری آواز سن کر ایسا لگ رہا ہے،
 ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ چس گئی ہے۔“
 ”بندر کیواس..... اور اندر کردانت۔ اتنی محنت
 سے گلا اور آواز خراب کی ہے، کوئی آدھ کلو امی اور
 ایک پاؤ لیٹوں پانی میں کھول کر پیے ہیں جب جا کر
 انکی سر پلی آواز بنائی ہے۔“
 ”اور وہ اس رشتے والی بوا کو کتنے پیے دیے
 ہیں؟“
 ”میں ہزار.....“ پھنسی پھنسی آواز دوبارہ
 نکلی۔

”یاروں ہزار تو میرے بھی بنتے ہیں، ایسا فرق
 میک اپ کیا ہے۔“
 ”دس ہزار نہیں..... مجھے تو لگتا ہے، مکان
 حیرے نام کرنا بنتا ہے۔“
 ”تو کرو۔“ ثاقب نے ہنسی میں اڑائی اس
 کی بات۔

”اس کے لیے تجھے میرا پھوپھا بننا پڑے گا۔
 کیونکہ میری پھوپھو سے شادی کرنے والے خوش
 نصیب کو مکان جینز میں ملے گا۔“
 ”وہ تو ادھر بھی مل رہا ہے، جہاں تو میرا رشتہ
 لے کر جا رہا ہے۔ کیا خیال ہے، ادھر ہی تاسیٹ کر لوں
 اپنا معاملہ۔“

”خبردار..... جو ایسا کچھ سوچا بھی..... تیری
 آنکھیں نکال کر نانی میں بہادوں گا۔“
 ”ہائے۔“ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر
 ہاتھ رکھے۔

”یہاں پر تیرا کام صرف رشتہ بچا ہونے تک
 ہے۔ عین شادی والے دن تجھے روپوش ہونا ہے۔“
 ”ہوں.....“ اس نے سر ہلایا۔
 ”پھر میرا صاحب کی انٹری ہوگی اور اس
 خاندان کو ذلت سے بچانے کے لیے، آپ جناب
 پیش کر دیں گے۔“
 ”ہوں.....“
 ”بے نافل پروف پلان۔“ سچی نے دلا
 طلب نظروں سے ثاقب کو دیکھا۔
 ”ایک دم بوس..... جھول بلکہ جھولوں سے میرا
 منصوبہ۔ ایسے کون دیتا ہے بیٹی۔ عین وقت پر لڑکے
 نے غائب ہونا ہے نا۔ باقی کا خاندان.....
 بارانی۔ ان کا کیا کرے گا؟“
 ”دو ہزار بیس کس کے حساب سے بارانی بھی
 نے اونچ کر دیے ہیں۔ ملا جلا کرو لاکھ کا پروجیکٹ بنانا
 رہا ہے۔“
 سچی نے آہستہ میں ابھی طرح اپنا جائزہ لے
 ہوئے کہا۔ میک اپ واقعی کمال کا تھا۔ وہ خود بھی خود

بہن نہیں بار بار تھا۔
 ”تو نے دو لاکھ ایک ایسے منصوبے پر لگا دیے
 جس کی کامیابی کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے۔“
 ”ابھی تو صرف بیس ہزار لگائے ہیں۔ باقی کا
 پیرا بوا کام کے بعد ملے گا اور دیسے بھی یہ سارا توری
 لڑے ہو جائے گا بمعہ سود۔ آخر کو گھر لے گا جینز میں۔“
 اس نے آنکھ کا کونا دباتے ہوئے کہا۔
 ”دیسے تو بھی اپنے ہونے والے سر سے کم
 لاہی تو نہیں ہے۔“ ثاقب نے تبصرہ کیا۔
 ”یہ تو ہے۔“ وہ ہرمانے بغیر بولا۔
 ”کتنے چکر لگانے پڑیں گے تیری سسرال
 سے۔“

”کہہ تو رہی ہے بوا، تین چار چکر میں فائل
 کر دے گی سارا کچھ۔“
 ”اور تیرے گھر والے، ان کو کیسے منائے گا؟“
 ایک پراسرار مسکراہٹ اس کے چہرے پر
 ابھری۔
 ”اکڑ بکڑ ہے نا۔“

☆☆☆

”دیکھ لیجیے ای! میری خوشیوں کے راستے میں
 مانپ سے پیٹھے رتے ہیں ہمیشہ۔“ عین تارازارو
 ظار رو رہی تھیں۔
 ”ہیں ہی سانپ.....“ مہ پارہ فوراً بولیں۔
 ”پہلے میرے دلدہا پر ماں نے قبضہ کیا اور
 اب..... روتے روتے بھی بندھ گئی۔ بات مکمل نہ
 ہوئی۔ سچی خاموشی سے یہ سارا منظر ملاحظہ کر رہا
 تھا۔

آخر رہانہ گیا تو بول اٹھا۔
 ”اب ایسا بھی کیا ہو گیا پھوپھو؟“
 ”جس نہیں پتا کیا ہوا؟“ عین روتا بھول کر
 کھینچنے لگی تھیں۔
 ”نہیں.....“ اس نے گردن ہلاتی۔
 ”میری شادی ملے گی.....“ عین نے بولنا
 شروع کیا ہی تھا کہ سچی نے ٹوک دیا۔

”میرا نے قصے چھوڑ دیں پھوپھو۔ اب کی باتیں
 کریں۔“
 ”ہم نے پورے خاندان میں ساگرہ کے
 دعوت نامے تقسیم کر دیے عین اس دن انہوں نے
 مسفرہ کی شادی رکھ دی۔ اب خاندان والے ساگرہ
 میں بھوڑا ہی آئیں گے، اس کی بارات میں آئیں
 گے۔“

(آپ بھی شامل ہوں گی ان برائیوں میں ان
 شاء اللہ۔ دل میں پھوپھو کو خطا طلب کر کے بولا۔)
 ”پھوپھو! کیا پتا، اللہ تعالیٰ آپ سے کی گئی
 زیادتیوں کا بدلہ ان سے لیتا چاہ رہا ہو اور عین وقت پر
 دلدہا شادی سے انکاری ہو کر بھاگ جائے، شادی ہی
 مکمل ہو جائے۔“
 ”اللہ نہ کرے۔“ رضیہ سلطانہ دہل ہی تو
 گئیں۔

(اوہو اللہ کو تو درمیان میں نہ لائیں، بڑی
 اہی۔)

”اللہ نہ کرے۔“ مہ پارہ بھی فوراً بولیں۔
 ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“
 وہ کہتا ہوا ہارنگل رہا تھا جب اپنے پیچھے پھوپھو
 کی آواز سنی۔ ”آمین، آمین۔“
 ”پھوپھو! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“
 ☆☆☆

”یہ لے بیٹا..... پچاس ہزار اور روپوش
 ہو جا۔“ سچی نے پیسے اس کے ہاتھ میں تھمائے۔
 ”دیسے تو پیرا دل کر رہا ہے، نکاح پڑھواؤں،
 بجائے روپوش ہونے کے۔“ ثاقب نے دانت
 نکالے۔
 ”تیری بیٹی توڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔“
 ”اچھا سن۔ یہاں سے سیدھا ایر پورٹ
 جانا۔“ سچی نے کہا تو وہ حیران ہو کر اس کی شکل دیکھنے
 لگا۔
 ”کیا روپوش ہونے کے لیے ملک تک چھوڑنا
 ضروری ہے۔“

”نہیں، حیرے ای ابو آ رہے ہیں۔ ایک گھنٹے میں فلائٹ چھج جائے گی۔“

”کیا.....“ وہ خوشی سے چور لہجے میں بولا۔

”ہاں..... میں نے ان سے رابطہ کر کے اطلاع بھجوا دی تھی کہ قاتب نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ وارڈ نمبر اور کمرہ نمبر تک بتا دیا تھا۔ میرے خیال سے اب تک تو تیرا آدھا خاندان بھی ہسپتال پہنچ چکا ہوگا۔“

”تو پھر مجھے زندہ دیکھ کر وہ لوگ خود نہ جان سے مار دیں۔“

”اب آگے تو جان تیرا کام جانے۔ میں تو جو کر سکتا تھا میں نے کر دیا۔“

قاتب مارے خوشی کے اس کے گلے لگ گیا۔

☆☆☆

صبح بڑے پن کا مظاہرہ کروا کر اور اکڑ بکوسے مدد لے کر اپنی گھروالوں کو شادی میں شرکت کے لیے راضی کر چکا تھا۔

نہیں تارا..... امین بلال کو ادھر سے ادھر بھاگتا دوڑتا دیکھ کر غصہ ہی آہیں بھر رہی تھیں۔

تب ہی کچھ عجیب و غریب سی چیز گویاں ان کے کان میں پڑیں جو رفتہ رفتہ واضح ہوتی گئیں۔

لڑکا شادی سے انکاری ہو کر بھاگ گیا۔ ساتھ میں وہ آنٹی بھی غائب تھیں جو اس کا رشتے لے کر آئی تھیں۔ شاہدہ کو خوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ امین

بلال کے چہرے پر ہوا بیاں اڑ رہی تھیں۔ ہیرو کی انٹری کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

وہ، اسد الدین کو لے کر ایک کونے میں کھڑا کچھ بات کر رہا تھا۔ اسد الدین سن کر سر ہلا رہے تھے۔ پھر دونوں باپ بیٹا چلتے ہوئے رضیہ سلطانہ تک آئے۔

”ای! اس گھر پر ہمارا حق ہے۔“ اسد الدین بولے۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔“ مہ پارہ

”کون سے گھر پر؟“ رضیہ اور امین دونوں حیران سی ان کی فعل دیکھنے لگیں۔

”ہاں..... کون سے گھر پر؟“ مہ پارہ بھی بولیں۔

”وہی جو یہ لوگ مسفرہ کو چیز میں دینے جا رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ سب خواتین نے سر ہلا کر تائید کی۔

”تو پھر کس بات امین بلال سے؟“ اسد الدین نے ماں کو دیکھا۔

”ارے پہلے اپنے چھوکرے سے تو پوچھو۔“ رضیہ نے مسیح کو دیکھا۔

”جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ انتہائی سعادت مندی سے سر جھکا دیا، بڑوں کے فیصلے پر۔

”تو چلو پھر۔“ رضیہ اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔

”ایک منٹ..... ایک منٹ.....“ نین تارا کی آواز بڑھ لوگ رکے۔

”مسح کا دل پھیل کر سڑا پھر سڑ کر پھیلا۔ (خدا یا! کوئی نیا پگانہ نکال لیں پھوپھو)“

”وہ..... اکڑ بکوسے کر لیں۔“

”اب کس لیے؟“ سوال مسیح نے کیا مگر نظریں سب کی بجلی پوچھ رہی تھیں۔

”وہ..... یہ طے کرنے کے لیے کہ شادی کے بعد مسفرہ بیاہ کر آئے گی یا سبھا بیاہ کر جائے گا۔“

”اف۔“

”سبح کی رکی ہوئی سانس خارج ہوئی۔ تو آخر چلان کا ماب ہو ہی گیا۔ اس نے دل میں شکر ادا کر کے آنکھیں موند لیں۔

”بس ایک سیکنڈ بعد جب آنکھیں کھولیں تو سب گھروالوں کا ہاتھ پھیلا کر میز پر رکھے پایا۔ نین بول رہی تھیں۔“

”اکڑ بکوسے ہو۔۔۔۔۔ اسی نوے پورے سو۔۔۔۔۔“

”مریم! مریم! میرا رومال کہاں ہے؟“ علی نے رومال ڈھونڈنے کی کوشش کیے بغیر مریم کو آواز دی۔

”یہاں سامنے تو رکھا ہے۔“ مریم نے کرسی سے رومال، گھڑی اور ٹاکی اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دی۔

”اجھا! میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“

ای جیسے بولیں ویسے ہی دعوت کی تیار کرنا۔ اب گھر کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ ان کی شادی کو چھ

مہینے گزر چکے تھے اور آج کی نصیحت بھی کل علی اور خدیجہ بیگم کے بیچ میں ہونے والی بیٹھک کا نتیجہ تھی۔

علم نامہ کل رات میں ہی جاری ہو گیا تھا اور پھر سے وہ وہ سارہ اور مندر بھائی کی دعوت کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

”جی!“ مریم نے حکم پورا ہونے کا وعدہ کیا۔ علی کرے سے باہر نکل کر سیدھا خدیجہ بیگم کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”ای! میں نکل رہا ہوں۔“ علی موبائل چیک کرتے ہوئے بولا۔

”اللہ کی امان میں دیا۔ رات جلدی آ جانا۔“

مندرجہ سے کون بات کرے گا اور اپنی بیوی سے کہہ دینا کہ اب دلہنا پانچھوڑ کر چکن کا رخ کر لے۔ مجال ہے کہ بھی خود ہی سب کر لے۔ کہہ کہہ کر کروانا پڑتا ہے۔“

مریم کا ذکر آتے ہی خدیجہ بیگم ہمیشہ کی طرح شروع ہو چکی تھیں اور چکن میں کھڑی مریم با آسانی ان کے نادر خیالات سے فیض اٹھا رہی تھی۔

ابھی پرسوں ہی کی تو بات تھی جب مریم نے رات کے کھانے کے لیے خدیجہ بیگم سے بغیر پوچھے انکو گوشت پکا لیا تھا۔ پھر اس کا کھانا کھانا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے گوشت کے بھاؤ سے لے کر

لڑکیوں کی خود مختاری تک اس کو سنایا تھا۔ اس دن کے بعد سے مریم نے توبہ کر لی تھی کہ کبھی خود کچھ نہیں کرے گی۔

مطاف شیخ



ابھی آٹھ مہینے پہلے ہی تو اس نے اپنا پچھلہ مکمل کیا تھا اور وہ پہلی لڑکی تھی اپنی کلاس کی جس کو فوراً جاب بھی مل گئی۔ اگلی ہی ہونے کی وجہ سے ہر چیز اس



کی مرضی کے مطابق ہی ہوئی مگر یہ والدین بھی ناں، جہاں سب سے زیادہ بچوں کی مرضی پوچھنی چاہیے وہاں وہ خود فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مریم کی شادی بھی ایسے ہی فیصلے کا نتیجہ ہے۔ علی کا رشتہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ خدیجہ بیگم، علی اور سارہ۔ مریم کی سوچ علی کے جواب سے ٹوٹی تھی۔

”ای! یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ میں گھر کے معاملات میں نہیں بڑھتا۔“

علی یہ کہہ کر فوراً آغوش کے لیے نکل گیا اور مریم یہ سوچتی رہ گئی کہ مرد کے پاس کتنا آسان راستہ ہے ہر چیز سے بچنے کا، جہاں کوئی مسئلہ ہوا، چاہی اٹھائی اور یہ جاوہ جا۔

”مریم! مریم!“ اس کی سوچ پھر اپنے نام کی بکار سے ٹوٹی، وہ جلدی سے چوہا بھاگ کر کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”جی ای!“ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

”کھانے کی تیاری کہاں تک پہنچی؟“ انہوں نے چادر کی نادریدہ شکنیں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

”برائی کا مسالا تیار ہے۔ تو دسے کے لیے گوشت دھو کے رکھ دیا ہے۔ کبابوں کا قیہ، چولہے پر چڑھا دیا ہے۔ وہ پک جانے کا ظہر کے بعد کباب بناؤں گی۔“ مریم نے رٹے رٹائے انداز میں رات کا بتایا ہوا منیو بتایا۔

”اور بیٹھا؟“ خدیجہ بیگم نے ایسے پوچھا جیسے مریم کی پچھلی بات ہی سنی نہ ہو۔

”ظہر کے بعد گلاب چائیں کی تیاری کروں گی؟“

”ایک بات تو بتاؤ یہ سارے کام اگر تم ظہر کے بعد شروع کرو گی تو دو گھنٹے سے پہلے میں کر لیتا ہوں۔ علی کو دکھانے کے لیے پکن میں مٹی۔ دہنی

میں پیچ ہمارے تھیں۔“ خدیجہ بیگم کا شکایت نامہ پھر شروع ہو چکا تھا۔ ان

کی آواز کو بند موزن کی آواز نے کیا تھا۔ مریم نے تھکے ہارے انداز میں گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہا تھا۔ ایک اور ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ خدیجہ بیگم نے ہمیشگی طرح بیچ اٹھا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔ یہ ان کا معمول تھا کہ جب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی تو وہ سامنے والے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیتی تھیں۔

مریم اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ گھر کے بعد اس نے سووے کی لسٹ بنائی تھی تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ کرسی سے اٹھی تھی۔ پھر علی کے کپڑے پریش کیے۔ ساری چیزیں نکال کر رکھیں۔ پھر جا کر علی کو اٹھایا (مریم کو دنیا کا سب سے مشکل کام لگتا تھا۔ پچاس آوازیں دینے کے بعد علی صرف ہلکی سی کڑوت بدلتا تھا اور پھر سو جاتا تھا) پھر ان کا ناشتا بنایا۔ پرائے اور آلیٹ سے کم پردہ دونوں مانتے ہی نہیں تھے۔ پھر پورا گھر سینٹا، تاکہ زائدہ کے آنے پر چھاؤ دی جاسکے۔ پھر زائدہ سے پورے گھر کی تفصیلی صفائی کروائی، کپڑے دھلوائے۔ جب تک علی سارا سودا لا چکا تھا ان سب کاموں میں بارہ بج گئے تھے۔ جب جا کر اس نے پکن کا رخ کیا تھا تا کہ رات کی دعوت کی تیاری شروع کرے۔ لیکن یہ سب علی کو دکھانے کے لیے دہنی میں بیچ ملانے کے برابر تھا وہ علی جس کو پچائی نہ تھا کہ گھر میں کام کون کون سے ہوتے ہیں۔ مریم سر جھٹک کر نماز پڑھنے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

”مریم ایار گرین کی تو بتاؤ۔“ علی نے پکن میں کھڑی مریم کو آواز لگائی۔

”جی لائی ہوں؟“ مریم نے برتن ایک طرف رکھ کر چولہے پر پانی چڑھایا پھر کچھ یاد آتے پر چیزیاں سے خدیجہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا۔

”ای! آپ تو وہ نہیں گی؟“ مریم نے کمرے میں جھانک پوچھا۔

”آدھے گھنٹے بعد لے آنا۔“ سلام پھیر کر

انہوں نے جواب دیا تھا۔

واپس آ کر مریم نے ایک اور کپ کا اضافہ کیا اور برتن دھونے شروع کر دیے۔

”یاد رکھنا! مانتا مگر برائی میں چاول تھوڑے کچرہ گھسنے تھے نہ لکھنا آیا بالکل تھی۔“

خدیجہ بیگم کے تاد خیالات تھے۔

”ہاں وہ مریم کو ابھی اتنا اچھا کھانا بتانا نہیں آتا تاہم اسی لیے مگر وہ سمجھ رہی ہے۔“ علی نے بہت کمزور انداز میں مریم کا دفاع کیا تھا۔

”ہاں بھائی!۔“ خدیجہ بیگم کہہ رہے ہیں تو تین سالہ کچھ زیادہ ہی جیز ہو گیا۔ ”اس بار علی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔“

پکن میں کھڑی مریم با آسانی سب سن رہی تھی۔ اسے لگا جیسے دن بھر کی ساری تھکن واپس کھحوں پر آگئی ہو۔ اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا کہ بے بابا اور ای اس کے کھانوں کی تعریف کرتے تھے۔ بابا تو ہر لمحے میں واہ واہ کرتے اور کھانے کے بعد ہمیشہ اس کو پیسے دیتے اور کہتے یہ تو میرے گھر کی برکت اور رونق ہے۔“ اور یہاں اس کے بنائے کھانے کو کچا، اور مسالا تیز کہہ دیا گیا وہ ان کھانوں کو جس کے کمزور اور پھوپھو پر فائز کر کے بنواتے تھے۔ ”مریم کے ہاتھ کی برائی کا تو کوئی ثانی نہیں، لا جواب۔“ یہ سب سے چھوٹا ملہ لکھتا تھا۔ ایک لمبی سانس لے کر اس نے گرین کی کپ میں ڈالی اور آخری کپ پانی میں خدیجہ بیگم کے قبوے کا مسالا ڈال کر آج بلی کر دی۔ پھر برصغری مسکراہٹ بچا کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”آئیے بھابی! آپ کا کبوتر ہو رہا تھا۔“

خدیجہ بیگم کے یہ کہنے کی دیر تھی۔ سارہ کا فک کہف تھپتھپ کو بجا تھا۔ جس پر علی پہلو بدل کر رہ گیا تھا اور مریم کے چہرے کی مسکراہٹ اسی طرح برقرار تھی۔

”بھائی! آپ یہ سب چھوڑیں اور یہ گرین لی ٹیں۔ ان شاء اللہ اگلی بار آپ کو کوئی شکایت نہیں

ہوگی۔“ مریم نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر کچھ لوگوں کو عادت ہوئی ہے بال کی کھال نکالنے کی جب تک سامنے والا ہاتھ جوڑ کر معافی نہ مانگ لے، یہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔

”بھابی! ہم آپ کی برائی تھوڑی کر رہے ہیں مگر مجھے یقین کہ آپ نے برائی کی تہہ ٹھیک نہیں لگائی ہوگی۔ ورنہ چاول کچے نہ رہ جاتے۔“ علی کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہی مریم کی ایک ٹانگ۔

”مریم! ادھر آ کر بیٹھو ریا۔“ خدیجہ بیگم کی بات دار آواز پورے کمرے میں گونجی تھی۔ علی نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا کہ اسی بہانے خدیجہ بیگم چپ تو ہوں گے۔

”جی ای؟“ مریم ان کے ساتھ والے صوفے پر کنگ تھی۔

”ہاتھ آگے بڑھاؤ۔“

خدیجہ بیگم نے دو عدد بڑا ڈسوتے کے ٹنگن مریم کے ہاتھ میں سجا دیے۔

”آج تم نے پہلی بار اتنی بڑی دعوت کا کھانا بنایا ہے نا، پہلے اس لیے نہیں پہناتے تھے کیونکہ ہمارا خاندان اتنا بڑا نہیں ہے کہ کوئی بڑی دعوت کرتے اور مجھے لگا بھی صحیح موقع ہے ان ٹنگن کو صحیح حق دار تک پہنچانے کا، ویسے بھی آج کھانا اتنا لذیذ بنایا تھا کہ میں پرہیز کے باوجود بھی انگلیاں چاٹتی رہ گئی۔ صحیح میں بہت ذائقہ اور برکت ہے میری بہو کے ہاتھوں میں کیوں علی؟“

اس وقت عجیب صورت حال تھی اس کمرے میں علی کے دانت ہی بند نہیں ہو رہے تھے۔ مریم کی اتنی تعریف پردہ جتنا بھی لار دیا سہی، مریم کا احساس اسے بھی تھا۔ سارہ کا ٹنگن دیکھتے ہی بس رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ ان پر اس کی کپ سے نظر تھی۔ خدیجہ بیگم صاحب اپنی اتنی عزت افزائی پر سر جھکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی کتہ چینی کی عادت کے ہاتھوں ان کے ساتھ ایسا بہت ہار ہو چکا تھا اور ایک بھی مریم جو

English

Beautify
your skin,
naturally



facebook.com/snscares

بس ہونقوں کی طرح بھی نکلن کو، اور بھی خدیجہ بیگم کو
دیکھ رہی تھی۔
”بالکل صحیح کہا ای آپ نے اور گلاب جاسن تو
اسنے نرم اور مزے دار تھے کہ کیا بتاؤں۔“ علی نے
موج سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔
”چلو تم نیچے بات کرو، میں سونے جارہی ہوں،
مریم میرا قبوہ لاؤ دوسرے میں۔“ خدیجہ بیگم رخصت
ہوتے ہوئے گفتگو کا موضوع بھی اپنے ساتھ لے گئی
تھیں مریم اٹھ کر پکیں میں چل دی۔
صفر کچھ دیر اپنا دامان دوڑاتا رہا کہ کس کا مذاق
اڑایا جائے مگر کچھ ہاتھ نہ آنے پر سارہ کو چلنے کا اشارہ
کر دیا۔
☆☆☆
”ای! قبوہ“ مریم کمرے میں جھانکتے ہوئے
بولی۔

”ہاں لے آؤ۔“ خدیجہ بیگم نیچے سے فیک لگا کر
پینٹ گئیں۔ کچھ لمبے دونوں بات شروع کرنے کا سرا
ڈھونڈتی رہیں۔ آخر میں مریم بول ہی پڑی۔
”شکریہ ای!“ خدیجہ بیگم نے جیسے سنا ہی نہیں،
کچھ لمبے مریم انتظار کرتی رہی کہ وہ بولیں۔ وہ اٹھ کر
جانے لگی تو ان کی آواز آئی۔
”اوھر آؤ مریم۔“

وہ چپ چاپ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔
”جب پہلی بار میں نے سسرال میں کھانا بنایا تھا
تو میرے جینٹھ نے کہا تھا کہ بھابھی کیا آئے میں پتھر
ملائے ہیں۔ یہ روٹی تو اینٹوں کا کام کر سکتی ہے۔“
یہ بات سن کر میں بالکل سن ہوئی۔ تمہارے
سر چپ رہے تھے اور میری ساس نے جینٹھ کی اس
بات کی تائید کی تھی۔ جب علی نے تمہارا دفاع کیا،
چاہے وہ تمہارے لیے معمولی کیوں نہ ہو، میرے اندر
ایک حسرت بھر گئی کہ کاش، اس دن کسی نے میرے
کھانے کو بھی سراہا ہوتا۔ میری ساس نے تو یہاں تک
کہہ دیا تھا کہ اس میں اور بچوں کے کھانے میں کوئی



فرق نہیں۔ دونوں ہی بد مزہ۔
مجھے اس وقت پتا چلا کہ تمہارے سر کا چپ
رہنا اتنا اہم نہیں تھا جتنا میری ساس کے یہ الفاظ جو
مجھے آج بھی یاد ہیں۔
یہ کہہ کر خدیجہ بیگم ہنس دیں اور مریم ان کو دیکھتی
رہ گئی۔
”یہ روئے ہوا کی طرح ہوتے ہیں ہمیں
احساس بھی نہیں ہوتا کہ کب یہ ہمارے اندر اثر کرے
اور ہم جس چیز کو ناپسند کرتے ہیں۔ آخر میں وہی بن
جاتے ہیں۔“ انہوں نے قبوہ کا ایک گھونٹ پیرا۔
”ای! مجھے کوئی شکایت نہیں، سچ میں۔“ مریم
کے آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔
”چلو، آج سے ہم کوشش کریں گے ساس بہو
بہن کی، ویسے ایک بات بولوں؟“
”جی ای!“

”احساس کرنا اپنی جگہ مگر کبھی ایک حقیقت
ہے۔ وہ گلاب جاسن انتہائی بد مزہ تھے۔ سچ سے اسنے
تخت، تو علی کچھ زیادہ ہی جھوٹ بولنے لگا ہے۔“
خدیجہ بیگم کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی مریم زور
زور سے ہنسنے لگی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔ صبح سب سے پہلے اس کی
ترکیب لکھ کر دوں گی۔“ انہوں نے کہا۔ مریم
مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔
”جی ٹھیک ہے ای!“

”چلو اب جاؤ یہاں سے مجھے سونا ہے۔ کتنی
باتیں کرتی ہو تم۔“
مریم مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل آئی اور
اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اور یہ سوچتی رہ گئی کہ
پتا نہیں کیوں عورت مرد کے الفاظ کی خواہش مند ہوتی
ہے۔ جب کہ ایک عورت کا ایک دوسری عورت کے لیے
احساس زندہ کیاں سنوار دیتا ہے۔

حکیم

”دیکھ تو میں رہی ہوں۔“ اس نے ناخوشی سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ”بہت سے لوگوں نے مجھے دوسرا بنا لیے ہیں۔“

”لگتا ہے کوئی بدل رہا ہے، ایلیم۔“ داتن نے مسکراہٹ دبا کے کہا تو شہزادی نے کندھے اچکائے۔

”ابھی اتنا برا وقت مجھ پہ نہیں آیا جو تم دونوں سے چلوں گی۔ پلیز اپنی شیر لاک ہو مڑ والی سرگرمیاں جاری رکھو۔“ وہ سر جھٹکتی بہن کی طرف بڑھی تو ایلیم نے برامانے بغیر ہکا راکا۔

”اتنی اچھی پھیلی دکھانے والا تھا آپ کو۔“

”میرے پاس میری اپنی پھیلیاں ہیں سلجھانے کو۔ تم اپنا کام کرو۔“

وہ چپ چاپ بہن کی میز پہ بیٹھ گئی اور اسی پرچی کو کھول کے کھورنے لگی (جیکر ذہن اشعر سوپ پارلر اور ان تمام وارداتوں میں الجھا تھا جو اس نے بھی کی تھیں)۔

داتن چپ چاپ ابھی اور چہ لبے پہ اس کی پسند کا کچھ فرانی کرنے کا اہتمام کرنے لگی اور ایلیم بہن کی گول میز پہ اس کے مقابل آ بیٹھا اور تری سے پوچھا۔

چو بیسویں قسط



”گلتا ہے پھر باس سے بے عزتی ہوتی ہے۔
خیر ہے، تالیہ۔ ایسا ہوتا ہے۔ آپ کہتا ہیں۔“
ابھی یہ دو لفظ بولے ہی تھے کہ تالیہ نے جھپٹ کے
اسٹینڈ سے چھری اٹھائی اور اس کی طرف بلبلی۔
”یہ فقرہ بول کے تو دکھاؤ تم آج۔“ چیر دینے
والی نظروں سے گھورا تو ایڈم نے فوراً سے دایاں ہاتھ
پچھے کر لیا۔

”داؤ۔ بڑے دن بعد شہزادی تاشہ نظر
آئیں۔“

تالیہ نے ایک دم چھری گرا دی اور بے یقینی
سے اپنے ہاتھ کو دیکھا جس میں اس نے چھری چڑی
تھی۔ پھر بھر چھری لے کر سر جھٹکا۔
”یہ میں نہیں ہوں۔“

”جے تالیہ۔۔۔۔۔ آپ کیوں خود سے جنگ کر
رہی ہیں؟“ اب کے وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ
نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں نے ملا کہ میں چند ماہ کے لیے شہزادی کا
صرف کردار ادا کیا تھا۔ میں وہ شہزادی نہیں ہوں جو
حکومت کرتی تھی۔ میں ایک فین گرل ہوں جو دی
وان فارغ کی رفتار سے ملتے ملتے ہانپنے لگ جاتی
ہے۔“

”آپ واقعی ایک ہنس کھ اور زندہ دل فین
گرل ہی ہیں اور ایک سابقہ اسکاڑے تالیہ مگر آپ
وہ مغرور شہزادی بھی ہیں جو اپنے آگے کسی کو کچھ نہ
سمجھتی تھی۔ آپ یہ ”دونوں“ ہیں۔ ہم سب کے اندر
ایک ”غلام ملکہ“ بننے کا خواہش مند وجود ہوتا ہے اور
میں نے آپ کو اسی طرح تسلیم کر لیا ہے۔ یہ مجھے
دائن نے سمجھایا ہے کہ انسان جو ہوتا ہے اسے اپنے
آپ کو دیا ہی قبول کر کے اپنی کمزوریوں کو اپنی
طاقت بنانا ہوتا ہے۔ آپ اپنے آپ سے کیوں
بھاگ رہی ہیں؟“

چوبے پہ کام کرتی دائن نے محض مسکرا کے
اسے دیکھا اور کام جاری رکھا۔ وہ ان دونوں کو آپس

میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔
”اف ایڈم۔۔۔۔۔ تم نہیں سمجھو گے۔“ اس نے مز
دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ ”ہر چیز غلط ہو رہی ہے۔
ادھر سے فارغ نے اس رات ذوالکفل کو میرے لیے
یہ جٹ تھادی اور میں اس پکی کو مل نہیں کر پار رہی۔“
پھر مجھے کے گلاس تلے رکھی جٹ نکال کے اسے
دکھائی۔ ”کیا تم اس کو مل کر سکتے ہو؟“

ایڈم نے ایک نظر ان ہندسوں کو دیکھا اور
دوسری سادہ نظر تالیہ پہ ڈالی۔

”بالکل نہیں۔ اسے اسی کو مل کرنا چاہیے جس کو
وان فارغ نے یادی ہے۔“

وہ جو برامید ہوئی تھی منہ بنا کے اسے دیکھنے لگی۔
”میں ”حالم“ ہوں اور اس کو مختلف فارمولوں
algorithms اور ciphers کے ذریعے حل
کرنے کی کوشش کر چکی ہوں مگر یہ کوئی ایسا کوڈ ہے جو
نوٹ ہی نہیں رہا۔ نہ یہ نمبر کسی کارڈ نمبر ہے نہ بینک
اکاؤنٹ نہ شاخشی کارڈ نمبر۔ آف۔“ وہ زنج ہو چکی
تھی۔

”بہی تو آپ کی غلطی ہے۔ آپ اسے عالم
یعنی تالیہ بن کے حل کر رہی ہیں۔ عالم تو ماہر ہے بے
پناہ ذہانت کا مالک۔ بڑے بڑے کوڈز بریک کرنے
والا۔ یہ جٹ وان فارغ نے عالم کو نہیں دی تھی۔“

تالیہ نے اچنبھے سے ابرو اکٹھے کیے۔ ”تم اتنی
لمبی تقریر کے بجائے صاف بات کیوں نہیں کرتے“
ایڈم۔

ایڈم کی آنکھیں شرارت سے چمکیں۔
”وان فارغ آپ کی زبانی جنگل میں آپ کی
کہانی ضرور سن چکے تھے مگر وہ بھی کے ایل والی تالیہ
مراد کو جو کوڈز توڑنے میں ماہر تھی جانتے ہی نہیں
تھے۔ وہ عالم سے بھی کے ایل میں نہیں ملے تھے۔“
”اس؟“

”فارغ صاحب صرف شہزادی تاشہ سے
واقف تھے۔ وہ شہزادی تاشہ جس نے جنگل میں ان

کے ساتھ سفر کیا تھا۔ وہ کوئی ”عالم ملکہ“ بننے کی
خواہش مند لڑکی نہیں تھی۔ وہ پراعتاد تھی۔ اپنے آگے
کسی کی ذہانت کو کچھ نہ سمجھتی تھی۔ وہ کوڈز ڈرہین کی
آگہ میں بے رحمی سے حیر چلا سکتی تھی۔ اندھیرے
پانیوں میں سفر کرتی خزانے کے جزیرے تک جا سکتی
تھی۔ جس نے قید خانے میں جا کے سپاہیوں سے کہا
تھا کہ وہ ان کی ہونے والی ملکہ ہے۔ وہ فین گرل نہیں
تھی۔ وہ ”ملکہ“ تھی اور یہ جٹ انہوں نے اس تاشہ
کے لیے دی تھی۔ اگر آپ یہ چیف آف اسٹاف والی
عالم اور سادہ سی تالیہ بن کے اس پکی کو مل کرنا
چاہیں گی تو آئی ایم سوری مگر آپ بھی اسے حل نہیں
کر سکیں گی۔ نہ آپ عالم جیسی اتھوڑی کھیر بن کے
اس کوڈ کو توڑ پائیں گی۔ آپ کو پہلے یہ فین گرل کرنا پڑے
گا کہ آپ کون ہیں۔“

وہ اسے سنے لگی۔ چپ چاپ سنے لگی۔ پھر اس
نے آنکھیں بند کر لیں۔

تاج ”انگوٹھیاں“ کا مدار لیے لباس۔۔۔۔۔ تیروں
سے بھرا کرش، نگوار۔۔۔۔۔ کچھ بھی اس کے پاس نہ تھا،
مگر۔۔۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ
مراد راجہ کی بیٹی ہے۔ ایک شکار باز۔ ایک شہزادی۔

جو ملا کہ سلطنت کے سلطان کی ملکہ بننے جا رہی
تھی۔

جس نے راجہ مراد کو چکھا دیا تھا اور غلاموں کو محل
کے باہر لا کھڑا کیا تھا۔۔۔۔۔

جو غار کے محافظ شکار باز کے خون میں لت پت
وجود کی پروا کیے بغیر اس کو گردن سے دیوچ کے
خزانے کا پوچھ رہی تھی۔۔۔۔۔

جو قید خانے میں فارغ پہ تشدد کرتے سپاہیوں پہ
غزرائی تھی۔۔۔۔۔

جو شاہی مورخ سے اپنی تعریفیں لکھوایا کرتی
تھی۔۔۔۔۔

اور اس لمحے میں تالیہ کو احساس ہوا کہ وہ کون تھی۔
وہ خود ”اتنی“ فین تھی۔۔۔۔۔

وہ اپنی تعریفیں اسی لیے لکھوایا کرتی تھی کیونکہ
وہ اپنی ذہانت کے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھتی تھی۔

وہ شہزادی تھی اور ایڈم مورخ جبکہ فارغ غلام تھا۔
”غلام!“ وہ چونکی۔ ”وان فارغ صرف ایک
غلام تھا ایڈم۔“ وہ بولی تو چونکا ہوا لہجہ مختلف تھا۔
(ایڈم نے زرب لب مسکرایا۔)

”وان فارغ میری طرح (گردن اکڑائی) کوڈز
بنانے اور توڑنے میں ماہر نہیں تھا۔ وہ تو ایک
سیاستدان تھا۔ اسے یہ کام نہیں آتے۔ میں اس کو غلط
طریقے سے حل کر رہی تھی۔“

اس نے جٹ اوپر اٹھا کے اسے غور سے دیکھا۔
”میں اس پہ دنیا کا مشکل سے مشکل ترین فارمولا اپلائی
کر رہی تھی جبکہ۔۔۔۔۔ اگر اسے وان فارغ نے لکھا ہے
تو۔۔۔۔۔ اسے تو کوئی بہت آسان چیز ہونا چاہیے۔“

”بہی تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ یہ کوئی
بہت سادہ چیز ہوگی۔ آپ فین گرل بن کے نہ
سوچیں۔ وہ ذہین شہزادی بن کے سوچیں جس کے
سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔“ ایڈم نے پٹن اس
کی طرف بڑھایا۔

”پتہ ہے کیا۔۔۔۔۔ وہ اسے سنے بغیر پٹن لے
کر جلدی سے کانڈ پہ حروف لکھنے لگی۔“ یہ سادہ سا

Shift cipher شفٹ سائفر ہے۔ ہر ہندسہ
حروف تکی کو غائب کرتا ہے۔ جیسے 1 کا مطلب ہے
پہلا حرف۔ A۔“

وہ تیز تیز ہر ہندسے کے ساتھ اس کے نمبر والا
حروف تکی لکھ رہی تھی۔ جو فقرہ بنا وہ حروف کا صرف
ملغوبہ لگ رہا تھا۔

”چونکہ یہ شفٹ سائفر ہے تو ہر حرف سے اگلا
صرف لکھنا ہوگا۔ 1 کے لیے A کی جگہ بی لکھوں گی
اور۔۔۔۔۔ تالیہ مسکرائی۔

(یہ تو بچوں والا سائفر تھا۔ ہونہ۔ میرے
باس کو تو مشکل کوڈز ہی نہیں لکھنے آتے۔) شہزادی
نے غر سے سوچا تھا۔

دائن فرائی چھلی لیے ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ جٹ اب درمیان میں رہی تھی اور اس پہ کھٹا نظر آ رہا تھا۔
 "اس کا قاتل اس کی پسندیدہ فیری ٹیل میں ہے۔"

وہ الفاظ خون کو سرد کر دینے والے تھے۔ وہ تینوں لیے بھر کے لیے دنگ رہ گئے تھے۔
 "اس کا کس کا؟"

"ظاہر ہے آریانہ کا۔ انہوں نے جنگل میں مجھے آریانہ کا قصہ سنایا تھا وہ چاہتے تھے کہ مگر چونکہ وہ مجھے چھوڑ رہے تھے اسی لیے انہوں نے مجھے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" ساری بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ "مگر جب ان کو تین سوالوں کا علم ہوا تو انہیں لگا کہ "میں" اور "وہ" الگ نہیں ہو سکتے۔ تب انہوں نے ذوالکفلگی کے پاس میرے لیے یہ ہنٹ چھوڑا کیونکہ وہ چاہتے تھے میں آریانہ کو انصاف دلاؤں۔ یہ انکشاف ان کو ملا کہ میں کسی وجہ سے ہوا ہو گا اور وہ یادداشت کھونے پہ اسے بھولنا نہیں چاہتے ہوں گے۔"

"مگر آریانہ کو تو صوفیہ رٹمن نے مارا تھا۔" ایڈم جبران ہوا۔

"ہاں" اس نے ہی کیا تھا وہ سب۔ سارے ملک کو معلوم ہے۔" داتن کو بھی اچنبھا ہوا۔

مگر تاشہ بیٹ مراد آنکھوں کی چٹلیاں سکھڑے اس جٹ کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔ صوفیہ رٹمن نے آریانہ کو نہیں مارا تھا۔" اس کی نظریں ان الفاظ پہ جمی تھیں۔ "میں جانتی ہوں اس کا کیا مطلب ہے۔ آریانہ فیری ٹیلو میں رہنے والی بچی تھی اور اس کی پسندیدہ فیری ٹیل سنووائٹ تھی۔"

"ہاں... تو؟" داتن خفا ہوئی۔ "سنووائٹ میں بھی ظالم ملکہ نے شہزادی کے لیے جنگل میں شکاری بھیجا تھا اور ہمارے ملک کی ظالم ملکہ صوفیہ

رٹمن ہی ہے۔"

"اوپنہوں۔" اس نے دھیرے سے گردن ہلائی۔ وہ ابھی تک بنا پلک جھپکے کاغذ کو دیکھ رہی تھی۔ "تم بھول رہی ہو کہ اسنووائٹ میں ظالم ملکہ کون تھی۔"

"کون تھی؟"

"سوتیلی ماں" ایڈم نے شہد آواز میں کہا تو داتن کا منہ کھل گیا۔

"کیا؟"

اور سارا پرل لمحوں میں مل ہو گیا تھا۔ شہزادی تاشہ کے لیوں پہ بالآخر ایک تلخ اور بے رحم مسکراہٹ بکھری۔
 "آریانہ کو عصرہ نے مروایا تھا۔" وہ ایک ایک لفظ یہ زور دے کر بولی۔ "آریانہ کی مجرم اس کی اپنی سوتیلی ماں ہے۔ ان دونوں کے درمیان قاتل کا 'جھوٹ' نہیں، عصرہ کا 'گناہ' آگیا تھا۔ عصرہ آریانہ کی قاتل ہے اور داتن قاتل یہ بات بھول چکے ہیں۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں باری باری دونوں کے سفید پڑتے چہرے دیکھ کے کہہ رہی تھی۔

ظالم کے بنگلے میں اس وقت شہزادہ سانشاٹا چھایا تھا۔

☆☆☆

عصرہ بیٹ محمود کے بیڈ روم کی دیوار پہ سلور بیضوی فریم کا قد آور آئینہ آویزاں تھا اور وہ خالی کمرے کا عکس دکھا رہا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور عصرہ اندر داخل ہوئی دکھائی دی۔ بیک کبھی پہ ڈالے وہ سیمینار کے بعد سیدھا گھر آئی تھی اور ایک ہاتھ سے اسٹول اتار رہی تھی۔ پھر بیک کرسی پہ بیٹھا اور سیدھی چلتی آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اونچا جوڑا باندھے، کانوں میں موتی اور گردن میں ہیروں کا ٹیکسیس پہنے اس نے مسکرا کے اپنے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔
 "آج کی تقریر نے سوشل میڈیا یہ میری

تقریروں کے بل باندھ دیے ہیں۔ اچھی تقریر لکھ کے دی تھی تاہم نے۔" وہ مسکرا کے اپنے ٹیکسیس پہ انگلی پھیرتی اپنے کمرے سے کہہ رہی تھی۔

"مگر تالیہ جیتی ہے کہ مجھے ان تقریروں کی ضرورت ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ عصرہ محمود حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اور اب وہ حکومت کرے گی کیونکہ اب سب ٹھیک ہو چکا ہے۔"

"واقعی می" اب سب ٹھیک ہو چکا ہے۔" کمرے کے کونے سے آواز آئی تو عصرہ نے اطمینان سے چہرہ موڑا۔ وہاں بیڈ کے کنارے پہ آریانہ بھی تھی۔ سفید فراک پہنے، سفید ہینر بیڈ لگائے اس کی نظریں عجیب تھیں اور فراک کے سینے پہ خون لگا تھا۔

"مجھے معلوم ہے تم یہاں نہیں ہو آریانہ۔ اب مجھے تمہارے ڈرائے خوابوں سے ڈر نہیں لگتا کیونکہ تم مر چکی ہو۔ بے جاری آریانہ۔" بے زاری سے سر جھٹک کے دوبارہ آئینے میں دیکھا۔ عکس میں پیچھے بیڈ پہ بیٹھی آریانہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"میں آریانہ نہیں ہوں می۔ میں تو آپ کا اپنا آپ ہوں جس سے آپ ڈرتی ہیں۔" چھوٹی بچی مسکرائی۔ "مگر آپ کو اب کسی کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اتنے برس آپ اس بات کے ڈر سے ملک سے بھاگنا چاہتی تھیں کہ کہیں وہ تیلی اور اس کا ساتھی آپ کے سامنے نہ آجائیں یا میں دوبارہ سے ڈیڈ کونڈ مل جاؤں مگر چھ سال بعد ڈیڈ نے یہ لٹیفوٹن ہی دور کر دی۔ میں تو اسی دن مر گئی تھی اور وہ دونوں گواہ بھی جن کو آپ نے بھیجا تھا۔"

"ہاں اور بالآخر میں اپنے خوف سے آزاد ہو گئی۔" وہ عکس میں خود کو مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔ "اب مجھے اس ملک کی حکومت کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"مگر آپ کو ابھی بھی ایک چیمپن ہے۔ کچھ ہے جو آپ کو بے آرام کر رہا ہے۔" عصرہ کی مسکراہٹ نکلی۔ اس نے گہری سانس لی۔
 "ہاں۔ اور اس کا نام تالیہ مراد ہے۔ قاتل اور

وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ ان کے درمیان "کیا" چل رہا ہے، لیکن خیر... اس کی کہانی بھی جلد ختم ہو جائے گی۔ میں نے اشعر سے عثمان کے ذریعے صوفیہ رٹمن کو تالیہ کے بارے میں مشکوک کر ہی دیا ہے۔ کچھ تو اس کے خلاف مل ہی جائے گا حکومت کو۔ وہ ہماری زندگیوں سے دور چلی جائے گی اور یہ راز راز ہی رہے گا کیونکہ سوائے اس کے کوئی خطرناک حد تک ذہانت کا مالک نہیں ہے یہاں۔" وہ اب چہرے پہ آئی لٹ لپٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

آریانہ کا عکس بدقسمت ہوئے لگا اور بالآخر وہ غائب ہو گئی۔ جب سے اس کے مرنے کا علم ہوا تھا اس کا عکس عصرہ کو کم کم ستانے لگا تھا۔

وہ بالآخر بسکون ہو چکی تھی۔ شانت اور بے خوف۔
 "کیا اشعر" کیا بچے اور کیا قاتل... ان میں سے کوئی بھی اب میرا راز نہیں پاسکے گا۔"

پھر تنہا کمرے میں کھڑے اس نے بیضوی آئینے سے مسکرا کے پوچھا۔

"Mirror, Mirror on the wall,
 Who is cleverest of them all."

اور آئینہ جواب کے طور پہ ملکہ بد کا خوب صورت چہرہ دکھا رہا تھا۔

بہنوں کے لیے خوش خبری

آج ہی تشریف لائیں اور

30% فیصد ڈسکاؤنٹ

حاصل کریں ہماری شاپ پر موجود

تمام کتب کی سیل جاری ہے

یہ رعایت صرف کراچی کی بہنوں کے لیے ہے

شاپ کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32218361

”جناؤ“

اس نے خواب میں دیکھا.....
وہ لکڑیوں کا گھڑ چمک کے اس کچھڑ میں لت
پت لڑکی کے سامنے جھکا۔
جو گھنٹوں کے بل زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی۔
آس پاس گھنے اور اونچے درخت تھے۔
وہ گھنٹوں پہ ہاتھ جمائے جھک کے اس سے
بولی۔

”میک بڑوش“

وہ جیگا چہرہ اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔
”آج تمہاری سالگرہ ہے۔ کوئی خواہش
کرو۔“
پھر اس نے سناہ رو تے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔
ٹوٹے ٹوٹے سے الفاظ ساعتوں سے ٹکرائے۔
”چاکلیٹ... بہت ساری چاکلیٹ...“
وہ مڑا اور ایک درخت تک گیا۔
ایک سخت خول کا پھل توڑا اور اسے چاقو سے
کاٹا۔

اندر سے نکلتے گودے کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ
اسے لگانا کہ میں مسموم ہو رہی ہوں۔
ایک دم سے فارح کی آنکھ کھلی۔

☆☆☆

کچھ دیر کے لیے 557 برس قبل کے زمانے
میں واپس چلتے ہیں۔
شہر تھا ملا کہ کا... وقت تھا شام کا... اور مقام تھا
سن باد کے گھر کا۔

سورج ڈوب رہا تھا اور وان فارح صحن میں پانی
کا چھڑکا کر نظر آ رہا تھا۔ سفید پاجامے پہ پہنے
کرتے کی آستینیں چڑھائے ہاتھ میں ڈول چلے گئے
وہ ایک مکمل غلام بن چکا تھا۔ چلو بھر بھر کے پانی صحن
کی اینٹوں پہ چھڑکتا اور درمیان میں خود بھی گھونٹ
بھر لیتا کہ گرمی شدید تھی اور کنوئیں کا پانی ٹھنڈا ٹھنڈا سا
تھا۔

دفعتاً دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ تیزی سے
برآمدے میں آیا مگر وسط میں ٹھہر گیا۔

سامنے ملکہ یان سوٹ اپنے چند مصاحبوں کے
ہمراہ آ رہی تھی۔ بھورے چنے میں لمبوس سرکواس کی
ٹوپی سے ڈھکے قریب آئی ملکہ نے ہاتھ کے
اشارے سے مصاحبوں کو دور رہنے کا اشارہ کیا اور
خود اس کے سامنے آرکی۔ چنے کی ٹوپی کے بالے
میں اس کا خوب صورت چینی چہرہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا
تھا۔

فارح نے ڈول زمین پہ رکھا اور گردن جھکا کے
تعطیل سلام کیا۔

”ملکہ... خوش آمدید۔“ ساتھ ہی نظریں اٹھا
کے دیکھا۔

شاہ چین کی بیٹی نے چنے کی ٹوپی پیچھے گرائی
اور شاہانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”سب کیسا جا رہا ہے غلام فارح؟“

اس نے پہلے ملکہ کو کرسی پیش کی پھر درمیان
میں میز رکھی اور جب وہ کرسی پہ بیٹھ گئی تو وہ مقابل
کرسی پہ بیٹھ گیا۔ غلام ہونے کے باوجود وہ ملکہ کے
سامنے بیٹھنے سے قطعاً نہیں ہچکچایا۔ بلکہ کی مسکراہٹ
گہری ہوئی تھی۔

”کل شہزادی تالیہ اور مورخ تین چاند والے
جزیرے کے لیے روانہ ہوں گے جہاں سے وہ خزانہ
ڈھونڈ کے لائیں گے۔ آپ کا بھیجا گیا چینی جہاز اگر
وقت پہنچ گیا تو...“

”وہ وقت پہ ہی پہنچے گا۔“

”بالکل! اگر ایسا ہوا تو شہزادی تالیہ خزانے
سمیت واپس آئیں گی۔ امید ہے تب تک مراد راجہ
مجھے قید کر چکا ہوگا لیکن میں اس سے اپنے اور تالیہ
کے لیے محفوظ راستہ حاصل کر لوں گا۔ پھر ہم ملا کہ
سے چلے جائیں گے اور آپ کے تخت کو کسی لڑکی سے
خطرہ نہیں ہوگا۔“

”مراد راجہ اور تالیہ... مجھے اپنے ان دونوں
دشمنوں سے نجات مل جائے گی نا؟“ اس نے

سنجیدگی سے پوچھا۔ فارح نے سر کو خم دیا۔
”میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے ملکہ عالیہ
کہ شہزادی تالیہ آپ کے سلطان کی ملکہ نہیں بنے
گی۔ آپ بے فکر رہیے۔“

”تمہارے وعدوں پہ اعتبار کرنا چاہتی ہوں
مگر...“ ملکہ نے رخس کو دیکھ رہی تھی جہاں پانی کا
ڈول رکھا تھا۔ ”مگر تمہارا چہرہ کہتا ہے کہ تم وعدے
نبھانے میں اچھے نہیں ہو۔“

”آپ کی قیافہ شناسی غلط ہے ملکہ۔ میں نے
کبھی وعدے نہیں توڑے۔ چاہے وعدہ قوم سے کیا
ہو یا بیوی سے یا اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے۔“

ملکہ نے چونک کر آنکھیں اٹھائیں۔
”پیشیاں؟ تمہاری تو صرف ایک بیٹی ہے۔“

”اب ایک ہے۔ بڑی دلی مرچکی ہے۔“

سن باد کے برآمدے میں سناٹا چھا گیا۔ ملکہ
نے چند لمبے نظریں جھکائیں پھر اٹھا کے اسے
دیکھا۔

”نہیں۔ جو مری تھی وہ تمہاری بیٹی نہیں تھی۔ وہ
تمہاری بہن تھی۔“ پھر شانے اچکائے۔ ”لیکن ہوسکتا
ہے میری قیافہ شناسی (چہرے پڑھنے کا علم) غلط ہو۔
خیر! کل جب شہزادی تالیہ اور مورخ جزیرے کی
طرف چلے جائیں گے تو...“

وہ بات بدل کے دوبارہ منصوبے کی طرف آئی
مگر وان فارح کی تمام حیات جاگ بچی تھیں۔ ملکہ
کے مقابل بیٹھے غلام نے پانی کے ڈول کو دیکھا اور
پھر ملکہ کو۔

”نہیں... یہ قیافہ شناسی نہیں ہے۔“ اس کی
چھٹی نظریں یان سوٹ پہ جمی تھیں جس کی رنگت ایک دم
سبکی پڑی تھی۔

”اس روز جب آپ نے تالیہ کے سامنے اسی
جگہ بیٹھ کے مجھے خود غرض کہا تھا تو مجھے یاد ہے آپ
کی آمد سے چند ساعتیں قبل میں کنوئیں سے پانی بھر
کے لایا تھا اور وہ ڈول بھی میں نے اسی طرح یہاں
رکھا تھا۔ اس روز بھی میں نے ڈول سے پانی پیا تھا۔“

آج بھی بیا ہے۔ آپ میرا چہرہ نہیں پڑھ رہی تھیں
ملکہ۔ آپ پانی کو پڑھ رہی تھیں۔“

فارح کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے اور اس نے
آگے جھک کر ملکہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

”یہ قیافہ شناسی نہیں ہے۔ یہ جادو ہے اور
آپ... آپ جادو گر کی ہیں۔“

نیلگون اندھیرے میں ڈوبی ہوئی پہ پل بھر
کے لیے موت کا سناٹا چھا گیا۔ یان سوٹ کے کان غصے
سے سرخ پڑے اور اس نے زور سے میز پہ ہاتھ
مارا۔

”تم اس گستاخی کی سزا جانتے ہو غلام؟“

”میں اتنا جانتا ہوں کہ ملا کہ میں جادو گروں
کے متعلق قوانین بہت سخت ہیں۔ اگر سلطان کو علم ہوا
کہ آپ کے والد نے آپ کو جادو سے لیس کر کے
بھیجا تھا تا کہ... (اس نے اندازہ لگایا) تا کہ آپ
ملا کہ پہ قبضہ کر سکیں تو آپ کو سزائے موت دے دی
جائے گی۔“

”تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔“ وہ خرائی مگر لہجہ
انتہائی مضبوط نہ تھا مگر وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

”آپ نے پمپور کے پورے گاؤں کو تباہ کر دیا
کیونکہ وہ جادو میں ملوث تھے۔ مراد راجہ نے اپنے
جادو گرو دستوں سے خداری کی اور آپ سے آن ملا۔
کیا وہ آپ کا راز جان گیا تھا؟ ابھی آپ نے اسے
محفوظ راستہ دے دیا۔ آپ دونوں جادو گر ہیں اور
دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں لیکن سلطان کو
علم نہیں ہے۔“

”آپ فکر مت کریں۔ میں یہ بات کسی کو نہیں
بتاؤں گا کیونکہ اگر آپ کو سزا ہوگی تو مجھے اور تالیہ کو
واپسی کا راستہ نہیں ملے گا۔“

یان سوٹ لب بھیجے چند لمبے اس کو دیکھتی رہی
پھر ایک دم وہ ہنس پڑی۔ ”ایک سارا عصر غائب ہو
گیا۔“
”تمہیں لگتا ہے میں تم سے ڈرتی ہوں؟“

دیکھی نہ تھی کیونکہ اس کے خیال میں وہ اپنے ماضی سے واقف تھا۔

پھر وہ شام بھی آگئی جب وہ مراد راجہ کو میز پر لے آیا اور کچھ اپنی منوا کے کچھ اس کی مان لی۔ مراد نے رخصت کے وقت اسے صاف لباس اور کھوڑے سمیت سفر کے لیے زوارہ بھی دیا۔ وہ دونوں گل کے دروازے پہ کھڑے تھے اور مراد اسے بتا رہا تھا کہ اسے کس طرح چابی کی مدد سے جنگل میں اس مقام تک پہنچنا ہے جہاں وہ دروازہ موجود ہے۔

دفعتاً ایک سپاہی مراد راجہ کا کھوڑا لیے قریب آیا تو فارغ چونکا۔

”آپ میرے ساتھ آ رہے ہیں راجہ؟“
جواب مراد کی تپوری چڑھی۔
”کس تمہیں اس بات پہ اعتراض ہے کہ میں سن باؤ کے گھر سے اپنے صندوق اپنی نگرانی میں وصول کروں یا اپنی بیٹی کو اودار کہہ سکوں؟“

”ہرگز نہیں راجہ۔ میں سوچ ڈوبنے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد آپ کو سن باؤ کی گلی کے پاس درختوں کے جھنڈ میں ملوں گا۔“

”کیوں؟ تمہیں کچھ خاص کرنا ہے کیا؟ یا کسی سے ملنا ہے؟“ راجہ نے مسکرا کر بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

”یقیناً میرے سپاہیوں میں سے کوئی ایک ملے گا وادار ہوگا اور اس نے تمہیں آنے کا اشارہ کیا ہوگا۔“

”راجہ کو اپنا سونا واپس مل رہا ہے۔ اب راجہ کو شکایت کا حق نہیں ہے۔“
مراد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”جاؤ، غلام فارغ۔ خدا کرے ملکہ مایوسی میں تمہاری گردن تیار تو دے۔“

اور ملکہ یان سو مایوسی سے زیادہ غصے کی حالت میں تھی۔ اگر اس وقت وہ گل میں ہوتی تو شاید اپنے سپاہیوں کو اس کی گردن مارنے کا حکم دے ڈالتی لیکن چونکہ اس غلام کو گل میں بلانا پُر خطر تھا اس لیے وہ

”آپ کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے“
ملکہ میں آپ سے کیا وعدہ نبھاؤں گا۔ آپ کو آپ کا علم مستقبل دکھانے کو دیکھ لیجیے گا۔“

یان سو نے اب کی بار پوری گردن جھکا کے ڈول میں موجود بانی کو غور سے دیکھا۔
”میں مستقبل نہیں بتا سکتی۔ چادو صرف ماضی بتا سکتا ہے۔“ اعتراف کیا۔

”اور مستقبل دیکھ لینا کیا ہوتا ہے؟“ اسے کوئی یاد آیا تھا۔

”الوہی تھ۔“ وہ اب بھی پانی کو دیکھ رہی تھی۔
”شہزادی تاشہ نے بھی آپ کے سامنے بہت دفعہ پانی پیا ہوگا۔ ان کا ماضی نہیں پڑھا آپ نے؟“

”وہ چادو گر کی بیٹی ہے۔ میرا علم اس پہ اور اس کے باپ پہ نہیں چلتا۔ تم البتہ۔“ اس نے نظریں اٹھا کر مسکرا کر فارغ کو دیکھا۔ ”ایک خود غرض مرد رہے ہو۔“

”اور وہ کیوں؟“

”تم نے ایک عورت سے صرف اس لیے شادی کی تاکہ وہ تمہاری بہن کا خیال رکھ سکے۔ تم اپنے باپ پہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم اس سے بہتر ہو۔ تمہیں اپنے باپ سے نفرت تھی۔“

”اور کیا دیکھا آپ نے میرے بارے میں؟“ وہ دیکھی سے ملکہ کو دیکھ رہا تھا۔

”غلام فارغ۔“ وہ اب کے نری سے بولی۔

”کچھ باتوں کو نہ جانتا ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ تم منصوبے پہ دھیان دو۔ باقی سب بھول جاؤ۔ تم کسی دوسرے علاقے سے آئے لگتے ہو جس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی مگر تمہیں اور نفرتیں ہر علاقے میں ایک ہی ہوتی ہیں اس لیے میں تمہارے دل میں کسی کے لیے نفرت نہیں بھرتا چاہتی۔“

یہ وہ آخری بات تھی جو یان سو نے اچھے وقت کہی تھی۔ وان فارغ نے پھر کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اسے ایک چادو گر کی سے اپنے ماضی کی خبر لینے میں

بند ہار کے گل سے چند کوس دور بنے بازار میں مل رہے تھے۔ سپاہی قاصطے پہ عام چلیے میں اوپر اوپر بکھرے ہوئے تھے اور وہ دونوں ہندوستانی مسالوں کی ایک دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ ملکہ نے بھورے چنے کی ٹوپی سے سر ڈھانپ رکھا تھا اور اس کا چہرہ غصے و غضب سے سرخ دیکر رہا تھا۔

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مراد راجہ کو تلاش کر دو گے۔“ وہ تمہیں کچھ مضبوط سے بولی۔

شام ڈھل رہی تھی اور ارد گرد بہت سے تازہ تازہ آزاد ہوئے غلام خوش خوشی آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ رش بہت تھا اور کان بڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ فارغ کو جولیا بلند آواز میں کہنا پڑا۔

”میں نے آپ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔“

”تم خزانہ مراد کو واپس کیسے کر سکتے ہو؟ وہ تمہیں غریبوں کو دیتا تھا۔“

”آپ چاہتی ہیں کہ میں وہ خزانہ سن باؤ کو دے دوں تاکہ وہ غریبوں میں بانٹ دے؟ کیا میں اتنا بے وقوف ہوں؟ ہم دونوں کو معلوم ہے کہ سن باؤ وہ خزانہ جین بچھ دے گا۔ اور آپ یہی چاہتی ہیں۔“
”جین بچھنا مراد راجہ کو لوٹا دینے سے بہتر تھا۔ تم۔۔۔ تم وہ اسے کیسے واپس کر سکتے ہو؟“

”کیونکہ وہ مجھے واپسی کا راستہ دے رہا تھا اور صرف وہی دے سکتا تھا۔ میں نے آپ سے تاشکو آپ کے راستے سے ہٹانے کا وعدہ کیا تھا۔ مراد راجہ کو تاشہ کرنے کا نہیں۔ آپ کی اور مراد کی جنگ آپ دونوں کا مسئلہ ہے۔ تاشہ اور میں اس کھیل کے لائق ہی نہ تھے۔ ہمیں اپنے ملک واپس جانا ہے۔“

بازار پہ اندھیرا چھا رہا تھا اور دکانوں کے قہقہے روشن ہو رہے تھے۔ آج لوگوں نے مغرب کے ساتھ ہی اپنے خیمے نہیں سیٹے تھے بلکہ وہ غلاموں کے آزاد ہونے کی خوشی میں خوش ہو رہے تھے۔
”اور تم اپنے ملک کے بند ہار باہن جاؤ گے یہ

لگتا ہے تمہیں؟“ ملکہ کچھ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مستقبل نہ میں دیکھ سکتا ہوں نہ آپ۔ اس لیے کوشش ہی کر سکتا ہوں۔“

رش بڑھتا جا رہا تھا اور لوگوں کا شور بھی۔

”میں ابھی بھی تمہارا سر قلم کروا سکتی ہوں۔“ وہ برہمی سے اس کو دیکھ کے بولی تو غلام مسکرا کر قریب آیا اور ملکہ کے کان میں سرگوشی کی۔

”یعنی آپ شہزادی تاشہ کو پھر سے غیر شادی شدہ بنا دیں گی؟ اور آپ کو کیا لگتا ہے۔۔۔ فارغ بن راجہ ملنے سے پہلے اعلانِ انداز میں لوگوں کو نہیں بتائے گا کہ جتنی شہزادی ایک چادو گر کی ہے؟ میں نے ان لوگوں کو آزاد کرایا ہے۔ ملکہ۔ یہ میرے احسان تلے دے ہیں۔ یہ میرا یقین فوراً کر لیں گے۔“ پھر سیدھا ہوا تو دیکھا ملکہ کا چہرہ غصے اور بے بسی سے تنمنا رہا تھا۔

”تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تم جانتے تھے میں مراد راجہ کی تباہی کے لیے وہ جہاز دے رہی ہوں تمہیں اور تم نے مجھے غلط تار دیا۔ خیر۔ خوش تو تم بھی نہیں رہو گے اپنے ملک میں۔“ فارغ نے کندھے اچکائے۔

”آپ اپنی فکر کریں۔ ملکہ۔ آگے آپ کو مراد راجہ سے ایک طویل جنگ لڑنی ہے۔“

سر جھکا کر تعظیم پیش کی اور اگلے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔

”تم میرے دوست نہیں تھے اس لیے اب تمہیں تکلیف پہنچانے کے مجھے افسوس نہیں ہوگا۔“
”آپ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔“

”نقصان نہیں۔ تکلیف کی بات کر رہی ہوں۔ سوچو۔۔۔ اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت ہوگی جب تمہیں معلوم ہوگا کہ۔۔۔۔۔ وہ بالآخر مسکرائی۔ چنے کے ہالے میں دیکھا اس کا چہرہ ذرا شانت ہوا۔

”کہ؟“ فارغ نے ابرو اٹھائی۔
”کہ تمہاری بہن کا خون تمہارے پیچوں کی

ماں کے ہاتھ پہ ہے؟“
چند لمحوں کے لیے وقت بالکل ختم گیا۔ بازار میں بچتے شادیانے... بھانٹ بھانٹ کی بولیاں... سب ایسے خاموش ہوا جیسے لوگوں کی زبانیں چھن گئی ہوں۔

”بھورے بالوں والی عورت ہے نا تمہاری بیوی؟ آخری دفعہ پہاڑوں پہ تمہاری بہن کے ساتھ گئی تھی تو کانوں میں بڑے بڑے موتی پہن رکھے تھے؟ اور تمہاری بہن سفید گھیر دار لباس پہنے ہوئے تھی؟ اور اس کے اوپر پٹلا لبادہ۔ اس بیٹی کے لیے جو جلا دیجیے گئے تھے وہ تمہاری بیوی نے بھیجے تھے دان فارغ۔ ماضی جان لینا مستقبل جان لینے سے زیادہ بڑا عذاب ہے۔ ہے نا؟“
ملکہ نے چنے کی ٹوپی آگے سر کاٹی اور مسکرا کر سر کو خم دیا۔

دان فارغ وہیں ساکت کھڑا رہ گیا۔
وہ جا چکی تھی اور وہ اس سے مڑ کے سوال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ملکہ جھوٹ بول رہی تھی تو اس کو ان کے لباس کا رنگ کیسے معلوم ہوا؟

اگلے تین دن جب وہ ایڈم اور تالیہ کے ساتھ جنگل میں سفر کر رہا تھا وہ بہت چپ چاپ سا تھا۔ ایڈم اور تالیہ کیا کہہ رہے تھے وہ نہیں سن رہا تھا۔ دماغ میں صرف ایک فقرہ گردش کر رہا تھا۔

”تمہاری بہن کا خون تمہارے بچوں کی ماں کے ہاتھ پہ ہے۔“ وہ بار بار سر جھٹکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ عصرہ ایسے نہیں کر سکتی۔ عصرہ کو تو آریانہ سے محبت تھی۔ مگر کیا واقعی؟

بہت سے واقعات آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ہر بات میں وہ آریانہ کو ذوقیت دیتا تھا اور عصرہ پسپائی اختیار کر لیتی تھی۔ وہ جس پسپائی کو اس کا بڑا پین سمجھتا تھا وہ اس کے اندر پینناز ہر پلا پودا بن چکی تھی۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ میں آئے لگتا تھا۔ وہ جنگل میں تھے اور ایڈم اور تالیہ سو چکے تھے۔ وہ اپنے انہی خیالات کی رو میں جھٹکتا آگے نکل آیا۔

جنگل اندھیرا تھا اور گھنے درختوں کے باعث چاند دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ہاتھ میں مشعل لیے آگے چلا گیا۔ دفعتاً ایک درخت کے پاس رکا۔

وہ کوکو کا درخت تھا۔ اس کے چوں کی خوشبو نے ایک دم چار ماہ قبل والا وہ دن یاد کروا دیا جب اس نے تالیہ کی سالگرہ پہ اس کو یہ پھل توڑ کے دیا تھا۔ ایک مغموم مسکراہٹ فارغ کے لبوں پہ پھر گئی۔ اس نے ایک پھل توڑا اور تالیہ کے پاس لے آیا۔ وہ اپنے بچپنوں سے بنے جھوٹے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ کافی دیر اس کے پاس بیٹھا سوچتا رہا کہ اسے کیا کہے۔

وہ اس کو چھوڑنے جا رہا تھا اس لیے وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کی بیوی نے ہی اس کی بیٹی کو مارا ہے۔ اور ابھی تک وہ خود بھی پر یقین نہ تھا۔ لیکن اب دل کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اسے کسی کو تو بتانا تھا۔ کچھ تو بتانا تھا۔ ذرا ذرا پار کرتے ہی وہ سب بھلا دے گا۔ کوئی تو اسے یاد کروائے والا ہونا چاہیے۔ یا اللہ... اس نے کیا قربان کر دیا؟ یادداشت کا سودا اس وقت اتنا مہنگا نہیں لگا تھا لیکن اب.....؟

کوشش کے باوجود فارغ بن راجزل اس رات تالیہ کو وہ سب نہیں بتا سکا۔ یہ بہت خطرناک راہ تھا۔ مگر... اپنے زمانے میں واپس آنے کے بعد..... ذوالکفلی سے وقت کے تین سوالات سننے ہوئے اس کو احساس ہوا کہ اگر اسے اپنی یادداشت واپس چاہیے تھی تو اسے ”اپنے ساتھ“ موجود شخص سے بھلائی کرنی تھی۔ عصرہ اس کے لیے سب سے اہم شخص نہیں تھی۔ اس کی بیٹی کی قاتل کو اس کے لیے سب سے اہم شخص ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اگر اسے کسی کے ساتھ بھلائی کرنی تھی تو وہ تالیہ ہونی چاہیے۔

اگر وہ چلی گئی تو وہ کبھی نہیں جان سکے گا کہ اس کی بیٹی کو عصرہ نے کیوں مارا تھا۔ کوئی تو ہونا چاہیے جو اس کے ساتھ ٹھہرے ہو اور اسے یاد کروائے۔ خود غرضی ہے تو خود غرضی کسی مراب وہ نہیں چاہتا تھا کہ تالیہ اسے بھول جائے۔

اس نے ایک سطر لکھ کے ذوالکفلی کے حوالے کی۔ وہ اسے ایڈم کو ای میل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ملک کا اگلا وزیر اعظم بنے جا رہا تھا اور یہ راز بہت خطرناک تھا۔

واپسی پہ اس نے ایڈم کو ای میل لکھی اور اسے ہر پھلے تالیہ کے لیے کوکو پھل بھیجنے کی ہدایت کی۔ جب وہ ہر شے بھول چکا ہوگا تو وہ پھل تالیہ کو ان کی جنگل کی آخری گھنگو یاد دلائیں گے۔ اور وہ دوبارہ کبھی برائی کے راستے پہ نہیں جائے گی۔ صرف وہی اس کی مدد کر سکتی تھی۔

اسے تالیہ مراد سے محبت نہیں تھی۔ یہ بات وہ جانتا تھا۔ تالیہ کو اس سے محبت تھی۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اور ایڈم کو کس سے محبت تھی وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھا۔ پہلے وہ چاہتا تھا کہ تالیہ اور ایڈم اس سے الگ ہو کر اپنی اپنی زندگی شروع کریں لیکن آریانہ نے جیسے پہلے ہی اس کی زندگی میں ہر ایک کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اب بھی وہی بازی لے لے گی تھی۔

تالیہ کو اس کے ساتھ رہنا تھا اور اسے تالیہ کے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ چاہے وقت بیت جائے... چاہے یادیں کھو جائیں... چاہے چروں کے نقاب بدل جائیں... انہیں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑنا تھا۔

☆☆☆

حالم کے جنگل کے اوپن کچن میں خاموشی چھائی تھی۔ داتن منہ کھولے باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ ایڈم جہاں رنگ رہ گیا تھا وہیں شہزادی ناشہ کے اندر جاری ناشہ اور تالیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور وہ اپنے دونوں چہروں کو تسلیم کر کے ایک دم شانت نظر آتی تھی۔

”عصرہ محمود نے آریانہ کو قتل کروایا تھا۔“ اس نے دہرایا تو سنا ٹوٹا۔ داتن نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔

”مگر عصرہ تو آریانہ سے سب سے زیادہ محبت کی دعوے دار تھی۔“

”اور کسی نے مجھے کہا تھا کہ مجھے بہت سے لوگ ملیں گے جن کی زبانیں دل خریب باتیں کہیں گی لیکن مجھے ان کو ان کے اعمال کی بنیاد پہ پرکھنا ہو گا۔“ تالیہ ایک لگائے اس کاغذ کو تہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”عصرہ کی زبان جو بھی کہے اس کا مکمل ہمیشہ مختلف رہا ہے۔“

”مختلف کیسے؟“ داتن کو اچنبھا ہوا۔ تبھی ایڈم کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

”میں عصرہ بظاہر آریانہ سے محبت کی دعوے دار تھیں لیکن آریانہ جس شخص کی بہن تھی انہوں نے اس شخص کو چھ سال تکلیف دیے رکھی۔ اگر انہیں واقعی آریانہ سے لگاؤ ہوتا تو فارغ میں آریانہ کو ڈھونڈتیں اور ان کی تکلیف کا احساس کرتیں۔“

”اسی لیے عصرہ جیکم اس ملک سے بھاگنا چاہتی تھیں۔“ وہ انگلیوں کی پوروں سے کاغذ کو تہ لگا رہی تھی اور گول میز پہ بیٹھے دونوں افراد اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ ”تاکہ ماضی کا گناہ کبھی سامنے نہ آجائے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ آریانہ تو اس دن مر گئی تھی وہ ایک دم مطمئن ہو گئیں اور فرسٹ لیڈی بننے کے خواب دیکھنے لگیں۔“

”مگر... فارغ صاحب کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ داتن نے اسے ٹوکا۔ اب وہ غور سے تالیہ کی آنکھوں میں بھرتے غور کو دیکھ رہی تھی۔ فارغ کے نام پہ غور میں اضافہ ہوا۔

”وہ ہمیشہ سے خود غرض تھے۔“ تالیہ ایک دم صبح کے بولی۔ ”ان کو یقیناً قدیم ملاکہ میں معلوم ہوا ہوگا یہ سب۔ نہ جانے کیسے۔ اور انہوں نے اس بات کو ہم سے چھپایا مگر جب وہ واپس آنے کے بعد ذوالکفلی سے ملے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے اور تالیہ تو پٹھری کے ایل کی بہترین انویسٹی گیٹر (لچھ طرہ یہ ہوا تو ایڈم نے بھی چوبک کے اسے دیکھا۔) سو مجھے اپنی زندگی سے باخبر ہونا پڑا کہ میں آریانہ کی موت کا راز کھوج کے انہیں یاد کرواؤں گا۔“

وہ۔“ اس نے کاغذ کو مڑ کے زور سے زمین پر مارا۔
 ”یہ خود غرضی نہیں ہے۔“ وہ نرمی سے
 بولا۔ ”یہ محبت ہے۔ آریا نہ ان کی بیٹی تھی۔ انہوں
 نے ہم دونوں کو واپسی کا راستہ دینے کے لیے وہ سب
 بھول جانے کا انتخاب کیا تھا۔ تو کیا ہمارا فرض نہیں
 بننا کہ ہم ان کی بیٹی کا قاتل ان کو یاد کروائیں؟“
 داتن نے ٹھور کے ایڈم کو دیکھا مگر وہ تالیہ کی
 طرف متوجہ تھا۔ تالیہ کا تو جیسے دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔
 ”اب تک مجھے لگا تھا ان کو شاید مجھ سے کوئی
 لگاؤ ہو۔۔۔ میری کوئی اہمیت ہو۔ مگر نہیں۔ انہوں نے
 مجھے اپنے ساتھ صرف ضرورت کے لیے باندھا اور
 میں نے۔۔۔ میں نے ان کے لیے ہر شے داؤ پر لگا
 دی۔ میں نے اپنا چہرہ بھی میڈیا کے سامنے عیاں کر
 دیا جو کہ ایک اسکا کر کا چہرہ ہے۔ کسی نے مجھے پہچان
 لیا کسی نے تفتیش کی تو میرا کیا ہوگا؟“
 ”بالکل۔ وہ ایک خود غرض انسان ہے اور۔۔۔“
 داتن نے زور و شور سے تاکید کرنی چاہی تو ایڈم نے
 تیزی سے بات کاٹی۔
 ”انہوں نے نہیں کہا تھا کہ آپ ان کی باڈی
 دوہن بنیں۔ ساتھ رہنے کے بہت طریقے ہوتے
 ہیں۔ یہ آپ کی اپنی مرضی تھی۔ اور اب ان کو خود غرض
 کہنا چھوڑ دیں۔“ تالیہ نے ہمارے
 لیے کچھ نہیں کیا؟ ہم اس دروازے کے بار آپ کے
 خزانے کے لیے گئے تھے ان کی وجہ سے نہیں مگر یہ
 ان کا پلانا تھا جو ہمیں وہاں سے نکال کے لایا ہے۔
 جنگل میں ہمیں ہمت دلانے والا اور ملاکہ میں ہمیں
 سکھانے والا وان فارغ تھا۔ انہوں نے ہمیں اپنا
 بہترین ورژن بننا سکھایا ہے۔“
 تالیہ نے ٹھوکہ کناس نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”تم خود ہی تو کہتے تھے کہ جب وہ میرا ساتھ
 چھوڑ دیں گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“
 ”تب کہتا تھا جب وہ ساتھ چھوڑنے والے
 تھے۔ جب نہیں چھوڑا تو کہنے کی وجہ نہیں رہی۔“
 داتن نے میز کے نیچے سے ایڈم کے جوتے کو

بیر مارا مگر وہ متوجہ نہیں ہوا۔
 ”وہ یہ سب مجھے براہ راست بھی بتا سکتے تھے۔
 ایک ای میل کر دیتے۔ ایک خط لکھ دیتے۔ اتنی
 پتیلیاں کیوں رکھیں؟“
 ایڈم بن محمد سوگوار بیت سے مسکرایا۔
 ”وان فارغ کب کوئی بات براہ راست کہتے
 ہیں؟ وہ تو ہمیشہ کوئی کہانی سناتے ہیں۔ اپنا جواب
 سننے والے کو خود تلاش ہوتا ہے۔ اب بھی انہوں نے
 ایک پتیلی چھوڑی تھی۔“ (دور بڑے ہوئے کاغذ کی
 طرف اشارہ کیا۔) ”آپ چاہیں تو اس کو نہ مل
 کر تیں۔ یہ آپ کی اپنی جاس تھی۔“
 ”تو اب میں کیا کروں؟ ان کی انویسٹی گٹر
 بن جاؤں؟“ وہ غرپ کے بولی۔ اسے بہت غصہ اور
 بہت دکھ تھا۔ ”مجھے کیا ان کی بیٹی کو جس نے بھی مارا
 وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔“
 ”مگر مسز عصرہ تو ہیں نا آپ کا مسئلہ۔ آپ کو وہ
 بری لگتی ہیں اور آپ سے ان کا یہ نیا اچھا روپ بھی
 ہضم نہیں ہوا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ ان
 سے چلیں ہیں۔“
 ”ایڈم۔۔۔“ اس نے چھری اٹھائی تو وہ جلدی
 سے بولا۔
 ”آپ اس مجلس کو اپنی طاقت کیوں نہیں بنا
 لیتیں؟“ (تالیہ نے دیر سے چھری واپس
 رکھی۔)
 ”تم چاہتے ہو میں عصرہ کو ایک پوز کروں؟“
 خفگی سے اسے دیکھا۔
 ”میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ موجود
 شخص کو بھلائی پہنچائیں۔ وہ شخص سب سے اہم ہے
 اس کو بھلائی پہنچانا سب سے اہم ہے اور یہ کام
 کرنے کا سب سے اہم وقت ابھی ہے۔ آپ یہ
 کریں گی تو آپ کی یادداشت واپس آ جائے گی۔“
 وہ رساں سے سمجھا رہا تھا اور داتن دانت پیستے
 ہوئے اسے گھور رہی تھی۔
 ”میری یادداشت آدھی تو آتی چکی ہے اور باقی

معلوم کرنے میں مجھے دیکھنی نہیں ہے۔“
 ”جو ہمیں معلوم ہوتا ہے۔“ تالیہ وہ ہمیشہ
 ہماری جان بچاتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی کہانی میں
 ابھی بھی کچھ ایسا ہو جسے معلوم کرنا آپ کے لیے
 ضروری ہو۔“
 ”ہونہہ۔ مجھے نہیں یاد کرنا قدیم ملاکہ کو۔“
 شہزادی نے غوت سے سر جھٹکنا۔
 ”ابھی تک آپ وان فارغ کی مدد اس لیے کر
 رہی تھیں کیونکہ آپ کو لگتا تھا وہ آپ کو ”اسنے“ لیے
 اسے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہوا
 ہے کہ وہ آپ کو اپنی مدد کے لیے ساتھ رکھنا چاہتے
 ہیں تو آپ خود غرضی دکھا کے ان کو چھوڑ دیں گی؟
 جس شہزادی تاشہ کو میں جانتا ہوں جس کے قصے میں
 نے بگارا ملاہو میں لکھے تھے وہ خود غرض نہیں تھی۔“
 ”ظاہر ہے۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھی اور
 کندھے اچکائے۔ ”تم یہ نہیں کہو گے تو اور کون کہے
 گا۔“ وہ کرسی دھکیل کے اٹھی اور میز جیوں کی طرف
 بڑھ گئی۔ وہ سارے یوں کی تھی ہاری آئی تھی بھینا اب
 قریش ہونے جا رہی تھی۔
 اوپر اس کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی
 آواز آئی تو داتن غصے سے ایڈم کی طرف گھومی جواب
 گرون بھٹکا ہوئے تھا۔
 ”تم وان فارغ کی اتنی حمایت کیوں کر رہے
 تھے؟“ اداس نوجوان نے چلیں اٹھائیں اور
 سوگوار بیت سے اسے دیکھا۔
 ”میں سچ بول رہا تھا۔ ایک باب کا اپنی بیٹی
 کے قاتل کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ کرنا خود غرضی نہیں
 ہوتی۔“
 ”وہ بالآخر وان فارغ سے متفر ہوئی تھی اور تم
 اس موقع کو استعمال کر سکتے تھے۔ اف ایڈم اف۔“
 داتن نے ہتھیاں پھینچیں۔ ”فارغ سب بھلا چکا ہے وہ
 اب بھی یقین نہیں کرے گا کہ عصرہ اس کی بیٹی کی
 قاتل ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی اب صلح کر چکے
 ہیں۔ تالیہ اپنی زندگی میں واپس آ سکتی ہے۔ تم اس کو

اس زندگی میں زندہ رکھلو جس میں تکلیف ہی تکلیف
 ہے۔“
 ”ان کو وان فارغ سے محبت ہے۔ کسی کو
 unlove کرنا آسان نہیں ہوتا داتن۔ آسان کیا؟
 یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔“
 ”مگر چھوڑا تو جا سکتا ہے نا۔ تم اسے فارغ کو
 چھوڑنے دیجئے۔ یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”کیونکہ میں سچا انسان رہنا چاہتا ہوں
 داتن۔“ وہ غمی مسکراہٹ سے بولا۔ ”اور سچا انسان
 خوشی اور غمی دونوں حالتوں میں سچ بولتا ہے۔ میں
 نے فارغ صاحب کی حمایت نہیں کی۔ میں نے صرف
 سچ بولا ہے۔“
 وہ اٹھ کھڑا ہوا تو داتن نے دیکھا کہ اس کے
 کندھے ڈھلکے ہوئے تھے اور چہرے پہ بے پناہ
 تکلیف تھی۔
 ”تم جانتے ہو تمہارا یہ سچ اسے عصرہ کو فارغ کی
 زندگی سے نکالے اور اپنی جگہ حاصل کرنے کی
 امید تھا وہ گا اور تمہاری تکلیف بڑھ جائے گی۔“
 ”اللہ نے سچائی کے ساتھ فوری راحت کا وعدہ
 کیا بھی نہیں ہے۔ سچائی میں بقاء کا میاں ہے دل
 کا سکون ہے مگر ضروری نہیں ہے کہ اس میں خوشی بھی
 ہو۔ سچائی جتنی چیز ہے اور جتنی چیزوں کے لیے
 تکلیفیں بھینی پڑتی ہیں۔“
 ”وہ یہ کہہ کے آگے بڑھا اور زمین پر گرا کاغذ
 اٹھایا۔ کھول کے اسے سیدھا کیا اور جیب میں ڈال
 دیا۔“
 ”جو میں نے ملاکہ میں سیکھا ہے، میں اسے
 بھلا نا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے یاد کروانے والا کوئی نہیں
 آئے گا۔“
 ”اور کیا وان فارغ نے خود بھی ملاکہ میں کچھ
 سیکھا تھا؟“ وہ تندی سے بولی۔
 ”بالکل۔ مگر انہیں تب بھی یہ معلوم نہیں تھا
 جب ان کی یادیں ان کے پاس تھیں اور تباہ معلوم
 ہے۔“ وہ داتن کو دیکھے بغیر باہر کی طرف بڑھ گیا۔

حالم کا بھگد اب خاموش تھا اور ایلم سامنے سرک رہا تھا۔ اس کے کندھے ڈھلکے تھے اور چہرہ غموم تھا۔

داتن نے اسے دن سے اس کے اندر رہا ممکن کی امید چکا دی تھی۔ مورخ کو شہزادی مل سکتی تھی۔ اگر مورخ شادی قبا ممکن لے اور دبار میں اعلا عہدہ حاصل کر لے تو وہ شہزادی کے قابل ہو جائے گا۔ لیکن جانے کیوں شہزادیوں کو صرف غلام ہی پسند آتے تھے۔

اس کا بہت مشکل سے تندرست ہونا دل ایک دفعہ پھر سے بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔

وہ ساری دنیا بھی پھر لے لیا سارے زمانے کی کتابیں پڑھ لے اسے تالیہ مراد بھی لڑکی سمجھی نہیں ملے گی۔

تالیہ مراد سے زندگی میں آپ ایک دفعہ ہی ملتے ہیں اور پھر اس جیسی محبت دوبارہ کسی سے نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

تالیہ اور اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ سنہری بال اب کھول کے شانوں پہ پھیلا رکھے تھے اور چستی نظریں اپنے عکس پہ بھی نہیں۔ مدھم لپ کے باعث کمرہ نیم اندھیر سا تھا۔ وہ عکس کو دیکھنے کے باوجود نہیں دیکھ رہی تھی۔ ذہن کے پردے پہ وہ سارے لمحے چل رہے تھے جب وہ عصرہ سے پہلی دفعہ ملی۔ وہ فارح کو لے کر اس ملک سے جانے کے لیے کئی بے چین تھی۔ اس نے تالیہ کو فائل والے قفسے میں پھنسانے کی بھی کوشش کی اور اب جب وہ ایک دم اچھی ہوئی تو کیا تھا جو تالیہ مراد کو اس سے بے زار کر رہا تھا؟ شاید وہ اب خود بخوبی بولنے لگی تھی اور بچے کو کون کو قدرت کی طرف سے یہ رعایت مل جاتی ہے کہ انہیں جھوٹوں کے جھوٹ ہضم نہیں ہوتے۔

”عصرہ محمود... تم نے ایک بیماری کی بچی کو کیوں مارا؟ تم اصل میں کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ کیا

مجھے تمہارے پیچھے آنا چاہیے یا وہاں فارح کو اس کے حال پہ چھوڑ دینا چاہیے؟“

اس نے سنگھار میز پہ رکھا فون اٹھایا اور اسکرین روشن کی تو ذوالفقاری کا پیغام بگبگا رہا تھا۔

”وہاں فارح کی بظرافت سے چند قطرے کم ہوئے ہیں۔ اسے ابھی کچھ یاد نہیں آئے گا سوائے ٹوٹے خیالوں اور بکھرے خوابوں کی صورت کے۔ چناؤ کا اختیار اب بھی تمہارے پاس ہے پتہ کی تالیہ۔ تم اس بوتل کو تلف کر کے اس کے ذہن کی تضحی کو صاف کر سکتی ہو۔ کیونکہ جیسے جیسے اسے اگلے سوالوں کے جواب ملیں گے اس کی تکلیف بڑھتی جائے گی۔ تمہاری تکلیف اور تمہارے خوابوں نے تمہیں دیوانہ کر کے قدیم ملاکہ میں پہنچا دیا تھا۔ سوچو اس کے خواب اس کے ساتھ کیا کریں گے؟“

اس نے دھیرے سے فون رکھ دیا۔ پھر بلیکس اٹھا کے اپنے عکس کو اجنبیت سے دیکھا۔

اسے اپنی خواب دیکھنے کی صلاحیت واپس کب ملی تھی؟ جب اس نے سات برس پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے ماضی کو بھلا کر اس شخص کو اہم جانے کی جواب اس کے ساتھ ہے۔ اس کا شوہر۔

سات برس اس کے خواب اسے جانی کا راستہ دکھاتے رہے تھے اور ماضی کے وہ چند کڑے جو اس کو آج تک دکھائی دیتے تھے وہ ابیر پوٹ پہ کیے اس ایک فیصلے کا نتیجہ تھے۔

اس کا کیا مطلب تھا؟

مبکی کہ تالیہ مراد نے آج ایک مکمل طور پہ ان تین سوالوں کے جواب نہیں پائے تھے۔ اور آج اسے ان کا کیا جواب تھا۔

لیپ کی مدھم زرد روشنی کمرے میں بکھری تھی اور شہزادی اسٹول پہ بیٹھی اپنے عکس کو تنگ جا رہی تھی۔

(انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہونا چاہیے؟)

انسان کی زندگی میں سب سے اہم کام کون سا

ہونا چاہیے؟ کسی کام کو کرنے کا سب سے اہم وقت کون سا ہونا چاہیے؟)

”تم خوب سب سے اہم ہوتا ہے۔“ اندر سے کسی نے جھجھوڑا۔ ”تمہیں وہاں فارح کو چھوڑ کے کچھ عرصہ انڈر گراؤڈ چلے جانا چاہیے یا کسی دوسرے ملک۔ تمہارے خلاف فیشل شروع ہو چکی ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے تالیہ۔“

(انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہونا چاہیے؟)

اس نے فون اٹھا اور کال ملا کے اسٹیکر آن کیا۔ پھر آئینے میں خود کو دیکھتی، موبائل ہتھیلی پہ اٹھائے ہوئی۔

”میں ان یادداشتوں کو تلف کر کے یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ مجھے ان سے ہزار گنے ہیں ذوالفقاری، مگر جس شخص سے وفاداری کا عہد کیا تھا جس کی سمجھ میں تھی کہ یہ اٹھنا کر رہی ہے میں انکسشن سے پہلے ان کو چھوڑ جاؤں؟ ہرگز نہیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑوں گی۔ وہ میرے لیے اس وقت سب سے اہم ہیں۔ خود سے بھی زیادہ۔“

(انسان کی زندگی میں سب سے اہم کام کون سا ہوتا ہے؟)

”پتہ کی تالیہ... اس کے ساتھ رہنا تمہارے اوپر مسیتیں لاسکتا ہے۔“ وہ فکر مند تھا یا شاید بن رہا تھا۔

”تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ اور اس وقت اپنے ساتھ موجود شخص کو بھلائی پہنچانا میرے لیے سب سے اہم ہے۔“ وہ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے تکلیف سے بولی۔ ”تاکہ ہوں کے سامنے اپنی تمام شناختیں تمام چہرے، حیلے اور چوریوں کو ہم کرکیں۔ اگر فیشل کرنے والوں نے پیچھا نہ چھوڑا تو...؟“

مگر اس نے سر جھٹک دیا۔

”میں تمہارے لیے فکر مند ہوں تالیہ۔ تم اس

کی یادداشتیں تلف نہ کرو مگر ابھی انڈر گراؤڈ ہو جاؤ۔ وہ وزیراعظم بن جائے دس ماہ یا سال کے اندر اندر تم واپس آ جانا اور اس کی مدد کرنا۔“

(انسان کی زندگی میں کسی بھی کام کا سب سے اہم وقت کون سا ہوتا ہے؟)

”نہیں ذوالفقاری۔“ شہزادی نے خود کو دیکھتے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ ”جو کرنا ہے ابھی“ کرنا ہے۔

”تالیہ...“ وہ جیسے غمگین ہوا۔ ”کاش تم نے اپنے تینوں سوالوں کے جواب نہ حاصل کیے ہوتے۔ تم نے اپنی زندگی مزید مشکل بنا دی ہے۔“

”میرے ماضی میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کو یاد کرنے سے مجھے فرق پڑے یا وہ مجھے پہلے سے معلوم نہ ہو۔ میری فکر مت کریں۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کے فون رکھ دیا۔ پھر برش اٹھا کے آہستہ آہستہ بالوں میں پھیرنے لگی۔

ویسے بھی ایک بچی کے بچپن کے چند فراموش کردہ سالوں میں ایسا کیا ہو سکتا تھا جواب اس کی زندگی پر اثر انداز ہو؟ وہ اتنی دور نکل آئی تھی کہ اب اسے فرقی نہیں پڑتا تھا۔

یہ تالیہ محبت مراد کی خوش فہمی کی آخری رات تھی۔

☆☆☆

فارح کی آنکھ فجر کے قریب ایک جھٹکے سے کھلی۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو

ماؤف ہوئے ذہن سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کہاں تھا؟ اپنے گھر کے ماسٹر بیڈ روم میں۔ اسے ی کی ٹخنہ میں... بے خبر سوئی عصرہ کے قریب... اس نے گہری سانس لی۔

تو وہ سب خواب تھا مگر عجیب سا خواب تھا۔ اس نے خود کو جنگل میں دیکھا تھا۔ جس اور گرمی میں پیسے سے شرابور... درختوں کے درمیان ایک گھنٹوں کے بل زمین پہ بیٹھی روٹی ہوئی لڑکی... سنہرے بال... کچڑا لود پڑے... وہ اسے

کہتا ہے کوئی خواہش کرو اور وہ کہتی ہے کہ اسے چاکلیٹ کھانی ہے تب وہ اسے وہ پھل دیتا ہے۔ اس پھل کی خوشبو اسے اب تک محسوس ہو رہی تھی۔ اور جنگل کی گری بھی۔

وہ باتھ روم میں آیا اور آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے چہرے پر بانی ڈالا۔ خواب ابھی تک ذہن میں تازہ تھا۔ وہ کوئی تالیہ تھی اور وہ پھل... پھل نہ جانے کون سا تھا۔ مگر وہ اپنی چیف آف اسٹاف کو خواب میں کسی فینٹسی ورلڈ میں کیوں دیکھ رہا تھا؟ یا اللہ! کیا یہ بڑھتی عمر کا اثر تھا یا ایک خوبصورت عورت کے ساتھ کام کرنے کا نقصان؟

اس نے سر جھکا اور زور سے تولیے سے چہرہ رگڑا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ اس خواب کا نشان کوئی اس کے چہرے پر نہ دیکھ لے۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس پلیٹ کی طرف متوجہ تھا اور عصرہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جوزا باندھے کانوں میں موتی پہنے نیلے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس تھی۔ خود بھی کہیں جانے کے لیے تیار لگی تھی۔ آج کل اس کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔

”تم نیند میں ڈسٹرب لگ رہے تھے۔“ دفعتاً اس نے تریوڑ کا شربت گلاس میں اٹھ بیٹے ہوئے غور سے والن فارغ کو دیکھا۔

اس نے پلیٹ پر جھکے چھری کاٹنے سے انڈا توڑتے ہوئے شانے اچکائے۔

”اچھا... مجھے پتا نہیں چلا۔“ (اس شخصیں پتا نہیں چلا کہ تم نیند میں ”میک یوروش تالیہ“ بڑبڑا رہے تھے؟) اس نے اندر ہی اندر مل کھاتے سوچا مگر بظاہر مسکراتی رہی۔

”مجھے لگا کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے۔“

”مجھے کھلی آنکھوں والے خوابوں کی عادت ہے۔“ مسکرا کے شانے اچکائے تو عصرہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

بچے اسکول جا چکے تھے اس لیے وہ دونوں ناشتے کی طویل میز پر تنہا بیٹھے تھے۔ ملازم ناشتہ لگا کے ہٹ چکے تھے۔ کھڑکی سے باہر اس کی کار کے ساتھ ڈرائیور قمر (جو ادھا باڈی مین بھی تھا) اور گارڈز کھڑے نظر آتے تھے۔

”تالیہ آج نہیں آئی۔ وہ اب اکثر نہیں آتی۔“ عصرہ نے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے کان کے موتی پر انگلی پھیرتے پوچھا۔

”اشعر ناشتہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ میں نے کل اسے کہا کہ وہ اس سے بات کر لے۔“ اس نے صرف تالیہ کا نام سنا تو جیسے بتانا یاد آیا۔

”اس کا نام تالیہ ہے“ فارغ... اور وہ تو شادی شدہ ہے۔ نہیں؟“ قمر سے یاد دلایا۔

”اس نے ایک روز مجھے بتایا تھا کہ اس کی شادی ختم ہونے والی ہے۔“

”چلو اچھا ہے کہ وہ اپنے مسئلے بتاتی رہتی ہے۔ اچھے لوگوں کو ایک دوسرے کا پونجی خیال رکھنا چاہیے۔“

مسکرا کے سادگی سے کہہ رہی تھی۔ فارغ اب ٹیکسین سے ہاتھ پونچھ رہا تھا۔ اس کی نظریں پلیٹ پر تھیں اور عصرہ کی چبھتی نظریں اس کی آنکھوں پر تھیں۔

”میرا فون چارج ہو گیا ہو تو لے آؤ۔“ وہ کرسی دھکیل کے اٹھا اور کوٹ پہنتے ہوئے یاد دلایا۔ عصرہ کی بات کو نظر انداز کیا۔ مگر وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کی گردن میں کئی سی ابھر کے معدوم ہوئی تھی۔ کوئی تو چور تھا وہاں فارغ کے دل میں۔

وہ اندر آئی اور اس کا فون بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اٹھا لیا۔ چارج پرین نکالی تو اسکرین روشن ہوئی۔ عصرہ نے لمحے بھر کو سوچا، پھر گول بن دیا۔ برانا پاسورڈ درج کیا۔ 2580۔ اوپر سے نیچے قطار کی صورت۔ مگر فون نے کھٹنے سے انکار کر دیا۔

”تم نے پاسورڈ بدل دیا ہے فون کا؟ مجھے کال کرنے کے لیے ٹھون پڑا تو کھلا نہیں۔“

”پتا نہیں۔ ناشتہ پاسورڈ بدلتی رہتی ہے اور اپنی وائرس ڈالتی رہتی ہے تاکہ فون ہیک نہ ہو۔ میں تو فکٹر پرنٹ سے کھلتا ہوں۔“ اس نے سرسری سا کہتے ہوئے فون لیا اور لا پرواہی سے جیب میں ڈالتا۔ کوٹ کی نادیدہ سلوٹ میں درست کرتا آگے بڑھ گیا۔ عصرہ طنز پر مسکرا دی۔

اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آئی۔ دروازہ بند کیا اور غصے سے کلب کوچ کے دیوار پر مارا۔ سارے بال آبشار کی طرح کمر پر گرتے چلے گئے۔

”ناشتہ... ناشتہ... ناشتہ...“ اس نے دونوں مٹنیاں کپٹیوں پر رکھ لیں اور دبی آواز میں چلائی۔

”میری آدمی عمر آریانہ آریانہ سنتے ہیٹ گئی اور اب یہ ناشتہ...“

دیوار پر لگے بیضی آئینے میں وہ غصیل و غضب کی تصویر بنی نظر آ رہی تھی۔

”وہ سمجھتا ہے کہ تالیہ اور اس کے درمیان جو بھی چل رہا ہے وہ میرے سامنے اپنا ”ایماندار اور سچا“ ایج قائم رکھے گا؟ وہ سمجھتا ہے کہ میں بے وقوف ہوں؟“

وہ قدم قدم چلتی قریب آئی اور اپنے عکس کو دیکھا۔ ٹیکس آنکھوں نے کاجل کو پھیل دیا تھا اور بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اس نے کلینر کی بوتل پوروں پر پاش پاش کی اور پھر اسے آنکھوں تلے لگایا۔

”فارغ راحل... میں تمہارا پردہ چاک کر کے دکھاؤں گی۔ بس اس الیکشن کو گزر جانے دو۔“ وہ نشو سے اب آنکھ کے کنارے صاف کر رہی تھی۔

”میں بے وقوف عورتوں کی طرح روز روز تم پر شک نہیں کروں گی۔ میں ثبوت کے ساتھ ایک ہی دفعہ تمہیں شرمندہ کروں گی۔ تب تک جتنے تعلقات نبھانے ہیں تالیہ مراد سے بچا لو۔“ رگڑ کے کاجل صاف کیا تو آنکھیں سرخ پڑنے لگیں۔

”اور تالیہ مراد... میں نے تمہیں سمجھنے میں دیر

کر دی۔“ وہ اب سنبھلے ہوئے انداز میں بالوں کو واپس لپیٹ رہی تھی۔

”میں نے تمہیں اپنی دوست بنایا تاکہ تم اشعر کی زندگی کی ساسھی بن سکو لیکن تم تو میرے ہی ساسھی کے پیچھے پڑ گئیں۔ میری نظروں سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ یاد رکھنا فارغ صرف عصرہ کا رہے گا۔ اگر نہیں تو پھر سکی کا نہیں ہو گا۔“

اس نے کس کے جوزا باندھا، پھر چہرے پر میک اپ فکس کر کے کیا اور مسکراتی۔ خوبصورت سیاسی بیوی کی رنگی مسکراہٹ۔ اور پریشاں اٹھالیا۔

وہ آج پھر ایک جگہ مدعو تھی اور اسے اپنے اس کردار کو بخوبی سمجھنا تھا۔

والن فارغ کے لیے نہیں۔ خود اپنے لیے۔

☆☆☆

لفٹ اوپر کی طرف گاڑن تھی۔ بار سین میٹل کا آفس چند منزلیں دور رہ گیا تھا۔ اندر تنہا کھڑی تالیہ منزلوں کے بدلتے نمبرز دیکھ رہی تھی۔ اسے لائن قیص کے اوپر اس نے سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا اور بالوں کی مانگ نکال کے پونی بنا رکھی تھی۔ چہرہ مطمئن اور پرسکون تھا۔ وہ اچھی نیند لے کر اٹھی تھی اور کسی خواب کسی یادداشت نے اسے نہیں ستایا تھا۔

لفٹ کے دروازے کھلے تو اس نے آفس کی لابی میں قدم رکھا۔ سامنے ریسپشن ڈیسک پر اس کی جانب پشت کیے کھڑا اشعر ریسپشنسٹ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ کسی خیال کے تحت مزاح تو تالیہ نے نظر پڑی۔

وہ جہی اس کے عین سامنے آ کے رک گئی۔ نظریں اس کی گردن پر لگے کٹ پہ ٹھہر گئیں۔ پھر اس کے چہرے کو دیکھا۔

اشعر محمود کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے راستہ دینے کے لیے ہٹ گیا تو وہ آگے بڑھ گئی۔ اشعر بھی پیچھے آیا۔ وہ یقیناً اپنے آفس جا رہا تھا۔

تالیہ آگے چلتی اس کے ہی آفس کے دروازے پہ چارکی اور پھر اس کی طرف گھومی۔ وہ

چونکا۔

”کل رات کے لیے سو رہی تھی۔“ وہ مصباحی مگر سنجیدہ انداز میں بولی۔ ”مجھے اتنی جارحیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

وہ دونوں اس کے آفس کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے اور انی وقت راہداری میں کوئی نہ تھا۔

”بالکل۔ آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا مگر۔۔۔“ وہ اس کی معذرت پر متحجب ہوا تھا۔ ”آپ کا غصہ فطری تھا۔“

”خیر۔ اب وہ معاملہ سٹل ہو چکا ہے۔ میں نے عصر سے بات کر لی تھی۔ وہ بھی اپنے عمل پر شرمندہ تھیں۔ ان کو افسوس ہے کہ انہوں نے آپ سے ایسا کام کیوں کر دیا۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

اشعر نے گہری سانس بھری۔

”ان کا قصور نہیں ہے وہ صرف۔۔۔“

”قصور آپ دونوں کا ہے، امیش۔ مجھے لگے صرف یہ ہے کہ آپ لوگ ڈائریکٹ صوفیہ رحمن کے پاس چلے گئے۔ اگر آپ کو مجھ سے مسئلہ تھا تو آپ میرے پاس آئے، ایک دفعہ تو مجھ سے کہتے کہ تالیف یہ جاب چھوڑ دو ہم نہیں اسے ارد گرد برداشت نہیں کر سکتے۔ کہہ کے تو دیکھتے۔“ وہ دکھ سے بولی تو اشعر نے مزید تعجب سے اسے دیکھا۔

”میں آپ سے یہ کہتا تو آپ کیا کرتیں؟“

”میں کیا کرتی؟“ وہ دو قدم آگے آئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”میں آپ کی شررگ پہ پھر رکھ کے کہتی کہ تالیف مراد اس آفس سے کہیں نہیں جاری اور اگر کسی نے اسے نکالنے کی کوشش کی تو وہ جان سے جائے گا۔“ پھر اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا۔ ”مگر اس کے لیے سو رہی۔“

اشعر کا تعجب حقا ہوا۔ لیوں پر ڈنکی مسکراہٹ در آئی۔ لمبے بھر کو اس کا معذرت خواہانہ انداز دیکھ کے

اسے عجیب سا لگتا مگر تالیف ویسی ہی تھی جیسی ہمیشہ ہوتی تھی۔ دیکھ کے اچھا لگتا تھا۔

وہ آگے بڑھ گئی تو اس نے بیاضیت سے پکارا۔ ”کانفرنس روم میں آ جائیے بے تالیف۔ پاس پہنچنے والے ہیں۔ ایک ضروری امر زیر غور ہے۔“

وہ مڑی نہیں، بس سر ہلا کے آگے نکلتی گئی۔

☆☆☆

سو پ پارر اس صبح قدرے دیران پڑا تھا کیونکہ ”لئے“ دیر سے بیدار ہونے والی نوم تھی اور ایسی جگہوں پر رش وہ دیر کے بعد ہی بڑھتا تھا۔ فی الوقت میز خالی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں رپیشٹ ہو یا موپ لگا تا لگا، سب کن انکھوں سے درمیانی میز پر بیٹھے بوڑھے شیف کو نو وارد آدمیوں سے بات کرتے دیکھ رہے تھے۔

پراسیکیوٹر احمد نظام آگے کو جھکے شیف کی آنکھوں کو پڑھ رہے تھے اور ساتھ بیٹھا الویسٹی کپٹر باری باری دونوں کو دیکھتا تھا۔

بوڑھا شیف ہاتھ میں پکڑی اخبار تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ لڑکی۔۔۔ آپ پوچھ رہے ہیں کہ یہ ہمارے پاس کام کرنی چاہتی ہیں؟“

”میں کورٹ سے ایک آرڈر لا کے آپ کے ریسٹوران کے ارد گرد تمام دکانوں کے سی سی ٹی وی فوٹیج نکلا سکتا ہوں“ شیف صاحب۔ لیکن میں نے سوچا کہ پہلے آپ سے پوچھ لوں تاکہ۔۔۔“

”تو پوچھیے نا۔“ شیف نے مسکرا کے تصویر واپس رکھی اور پیچھے کو ہونے بیٹھا۔

”یہ لڑکی تالیف مراد اس ریسٹوران میں جاب کرتی تھی کیا؟“ پراسیکیوٹر نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے پوچھا۔

”جی۔ بالکل۔ اس نے چند ماہ یہاں جاب کی تھی۔ کیا آپ کو کاغذی ثبوت بھی فراہم کر دوں؟“

شیف کا جواب پراسیکیوٹر کے لیے غیر متوقع تھا۔ انہوں نے چونک کے الویسٹی کپٹر کو دیکھا۔ وہ

بھی سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

”بالکل۔ مجھے تمام ڈینا چاہیے۔ ایک ایک چیز۔“

”میں ہر چیز نکال لاتا ہوں۔ اور ہاں۔۔۔ وہ اس ریسٹوران کے علاوہ تنگو کال کے گھر بھی کام کرتی تھی۔ ان سے واقف ہیں آپ؟ وہ ان کی ملازمہ تھی۔“

”نہیں۔ ان کا کوئی ایڈریس وغیرہ ہے آپ کے پاس؟“ پراسیکیوٹر احمد نظام بالکل سیدھے ہو چکے تھے۔ ان کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔

”بالکل ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔“ شیف سادگی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

رپیشٹ سونچر ڈیوٹر سب کن انکھوں سے ان افراد کو دیکھ رہے تھے جو اب دبی دبی پر جوش سرگوشیوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ بالآخر ان کے ہاتھ ایک محسوس ثبوت لگا تھا۔

☆☆☆

کانفرنس روم میں اس وقت محض وہ تینوں موجود تھے۔ فارغ کھڑا دیوار پر نصب اسکرین کو دیکھ رہا تھا جبکہ تالیف اور اشعر اس کے دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ آفس کی ایک مصروف فوج کا آغاز ہو چکا تھا اور اسکرین پر حاکی کو دکھایا جا رہا تھا۔ حاکی درمیانے قدر والا سیاستدان تھا جو پارٹی انتخابات میں وہاں فارغ کا مخالف امیدوار تھا۔

پارٹینیشنل کے صدر کے لیے ہر پانچ سال بعد الیکشن (چناؤ) منعقد کیا جاتا تھا۔ جو جس صدر بننا پارٹی کی حکومت آنے پر اسی کو وزیر اعظم بنایا جاتا تھا۔ چونکہ پارٹی اس وقت اپوزیشن میں تھی اس لیے سرکاری ٹی وی چینل ٹی این کے انتخابات کی کوریج نہیں کرتے تھے۔ یہ انتخابات عام انتخابات کی طرح پونٹک اسٹیشن پر بیٹک پیپر کے ذریعے نہیں ہوتے تھے بلکہ اس میں صرف ان ڈھائی لاکھ لوگوں نے حصہ لیا تھا جو پارٹی کے نمبرز تھے۔

ایکشن والے دن ان نمبرز نے اپنے فون سے

پارٹی کی ویب سائٹ پر جا کے اپنا شناختی کارڈ نمبر درج کر کے کسی ایک امیدوار کو ووٹ دینا تھا۔ چونکہ یہ انتخاب سوشل میڈیا کے ذریعے ہوتا تھا اس لیے اس کی ساری مہم بھی سوشل میڈیا پر چلائی جا رہی تھی۔ اس وقت اسکرین پر ان کے سامنے حاکی کے نہیں بلکہ جیجے پر اپ لوڈ کی گئی ایک ویڈیو دکھائی جا رہی تھی جس میں حاکی اور اس کی بیوی ایپرن پہنے کسی مسجد کے باہر گھاس پہ کھڑے چاول پلیٹوں میں بھر بھر کے بچوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ یہ کسی چیرٹی ایونٹ کی ویڈیو تھی جس میں (بقول رپورٹ کے) وہ میاں بیوی باقاعدگی سے حصہ لیتے تھے۔ کیونٹی سرورس کی اس خوبصورت مثال کو وہاں جھوم میں کھڑے۔ لوگ سراہ رہے تھے۔ باری باری تقسیم بنے اپنا پیالہ لاتے اور سیاستدان صاحب مسکرا کے اس کو چادلوں سے بھر دیتے۔

ہر گزرتے بچے کے ساتھ وہاں فارغ کے ہاتھ کے بلوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اشعر نے ریموٹ اٹھا کے اسکرین بھجائی اور کرسی فارغ کی طرف گھمائی جو ناخوش لگ رہا تھا۔

”حاکی ابھی یتیم خانوں کا دورہ نہیں کرتا۔ میں اسے جانتا ہوں۔“

”ہم سب اسے جانتے ہیں آجنگ۔ مگر آپ کی چائے دالی ویڈیو اپنی مشہور ہوئی کہ حاکی کو یہ اسٹنٹ کرنا پڑا۔“

”یعنی حاکی نے ہماری نقل کی ہے۔ واؤ۔“ وہ سر جھٹک کے بولی تو فارغ نے نظروں کا رخ پھیر کے اسے دیکھا۔ وہ سنہرے بالوں کی سچ کی مانگ نکال کے پونی بنائے سیاہ کوٹ میں سنجیدہ سی لگ رہی تھی۔

اس کے ذہن میں صبح دیکھا گیا خواب ابھرا۔ کچھ اور سرخ مٹی سے لت پت چہرے والی تالیف جسے وہ جھٹک کے کہہ رہا تھا۔

”کوئی خواہش کرو۔“

اس پھل کی خوشبو ابھی تک اس کے نتھنوں میں محسوس ہوتی تھی۔

فاریح نے سر جھٹکا اور میٹنگ پر توجہ دی۔
 تالیہ کہہ رہی تھی۔ ”اور اب حاکمی کی ویڈیو بھی
 مشہور ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا پر لوگ اچھی چیز کم
 اور مشہور چیز زیادہ دیکھتے ہیں۔“
 ”ہاں تو ٹھیک ہے۔“ اشعر نے ہاتھ
 جھاڑے۔ ”ہم کوئی نیا اسٹنٹ کر لیتے ہیں جو اس
 ویڈیو کو باند کر دے۔“
 مگر فاریح نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ دونوں
 پہلوؤں پر ہاتھ جمائے کھڑا وہ اکتایا ہوا لگتا تھا۔
 ”کسی کی لکیر کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے کاٹنا
 ضروری نہیں ہوتا۔ اس سے بڑی لکیر لگانی پڑتی
 ہے۔ اس سے مقابلے کے بجائے اس سے بہتر کام
 کرنے کی کوشش کرو۔“ وہ ناشوخی سے کہہ کر مڑا اور
 دروازے سے باہر نکل گیا۔
 اشعر نے براہ اختیار تالیہ کو دیکھا۔
 ”میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ ہم اس سے بہتر
 اسٹنٹ کر سکتے ہیں۔“
 وہ سر جھٹکے فولڈر میں کاغذات ڈالنے لگی۔
 ”ان کو اسٹنٹ کرنا پسند نہیں ہے۔ ہم ان کی مرضی
 کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔“
 ”جائے کا اسٹال بھی تو ہم نے ان کو بغیر
 بتائے منتخب کیا تھا؟ ہے تالیہ۔“
 ”جب ہم ٹیم تھے اور ہم میں سے کسی ایک نے
 دوسرے سے غداری کی کوشش نہیں کی تھی۔“
 کھٹکاک سے فولڈر بند کیا اور جی کے بولی۔
 ”وان فاریح نے مجھے کہا تھا کہ اگر میں آپ
 سے بہتر تعلقات کا خواہاں ہوں تو مجھے آپ سے بچ
 بول کے تمام معاملات درست کر لینے چاہئیں۔ یہی
 دفعہ میں نے ان کی نصیحت مانی اور اس کا نقصان ہی
 ہوا۔“ وہ جی ہوا۔
 (بہتر تعلقات؟) وہ لمبے لمبے ہر کوں رہ گئی۔ اشعر
 نے پہلی دفعہ اتنے ڈائریکٹ انداز میں بات کی
 تھی۔ تو کیا وہ اور فاریح اسے ڈسٹس کرتے رہے
 تھے؟

”یہ نصیحت آپ کو وان فاریح نے کی تھی؟“ اس
 کے گال سرخ ہوئے۔
 ”بالکل۔ آپ ان سے کفرم کر لیجیے۔“ وہ تکی
 سے کہہ کر اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔
 باہر نکلا تو فاریح راہداری میں جا رہا تھا۔ ساتھ
 ہی فون پر کچھ ٹائپ بھی کر رہا تھا۔ کن اکھیوں سے
 اسے آتے دیکھا تو سرسری سا پوچھا۔
 ”تم نے ناشو سے اپنے معاملات درست کر
 لیے؟“
 ”نہیں۔ مزید بگڑ گئے ہیں۔ اب وہ میری شکل
 بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“
 اشعر کڑواہٹ سے کہہ کر آگے بڑھ گیا تو وہ
 چونک کر اسے جانتے دیکھنے لگا۔
 صبح تک اسے لگا تھا کہ اشعر اور تالیہ کا ایک
 ہونا ”ممکن“ ہے مگر یہاں تو...؟
 خیر... اسے دکھ نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔
 محض شانے اچکائے اور اپنے آفس کی طرف بڑھ
 گیا۔
 دروازے پر وہ ٹھہرا۔ تالیہ کی میز کرسی اس کے
 آفس کے باہر چھٹی تھی اور اس پر اس کی چیزیں رکھی
 تھیں۔
 وہاں کوئی مانوس خوشبو اس کے منتھوں سے
 نکرائی تھی۔ چونک کے میز کو دیکھا جس پر ایک چھوٹی
 نوکری میں تین نوکروں روٹ رکھے تھے۔
 کسی سحر زدہ لمحے کے زیر اثر فاریح نے ہاتھ
 بڑھایا اور ایک پھل اٹھایا۔ اس پھل کی کھردری جلد
 رنگ... سب وہی تھا۔
 ”کھائیں گے؟“ تالیہ کی آواز پر چونکا۔
 وہ بال کی چونک پر کھڑی مسکرائے اسے دیکھ
 رہی تھی۔ فاریح نے انہوں کہتے ہوئے آہستہ سے
 پھل رکھ دیا۔
 ”یہ وہی پھل ہے نا جو تمہارا شوہر تمہیں بھیجتا
 ہے۔“ سرسری سا پوچھا۔
 وہ آگے آئی اور اپنی چیزیں میز پر رکھیں۔ پھر

ان کو ترتیب سے رکھنے لگی۔ سر جھٹکانے سے سنہری
 پونی دائیں بائیں جھولنے لگی تھی۔
 ”جی۔ اسے لگتا ہے مجھے یہ بہت پسند ہیں۔“
 ”تو نہیں پسند کیا؟“
 تالیہ نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ہر چیز
 کا ایک وقت ہوتا ہے جس میں وہ اچھی لگتی ہے۔ بار
 بار دہرانے سے وہ اپنا اثر کھودیتی ہے۔ مجھے یہ پھل
 صرف تب اچھا لگا تھا جب... خیر۔“ اس نے سر
 جھٹکا۔ جنگل والا واقعہ یاد آیا تھا۔
 ”جب؟“
 ”میری سالگرہ۔ اس نے مجھ سے میری
 خواہش پوچھی تو میں نے کہا کہ مجھے چاکلیٹ کھانی
 ہے اور اس نے یہ پھل لا دیا۔ اس کے اندر کا گودا
 اس وقت چاکلیٹ جیسا لگا تھا۔ اب نہیں لگتا۔“
 ”اس نے چاکلیٹ کیوں نہیں دی؟“
 تالیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سادگی سے
 بولی۔ ”کیونکہ ہم اس وقت جنگل میں تھے سر... اور
 جنگلوں میں پسند کی چیزیں نہیں ملتیں۔“
 لمحے بھر کو وان فاریح ساکت رہ گیا۔ پلک تک نہ
 جھپک سکا۔
 عجیب De Ja vu (ایسی صورت حال جو
 لگے کہ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہو) جیسا احساس تھا جو اس
 کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ کچھ ایسا ہی دیکھا
 تھا اس نے خواب میں؟
 پھر بدقت وہ مسکرایا اور ”ہوں“ کہہ کر آگے
 بڑھ گیا۔
 (شاید اس نے مجھے یہ کہانی پہلے بھی سنائی ہو
 تھی میرا لاشعور اسے خواب کی صورت میرے
 سامنے لے آیا ہو۔ میں چیزیں بھولنے لگا ہوں۔
 شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔) اس نے ذہن سے ہر
 خیال کو جھٹکتے ہوئے خود کو کھلی دی۔
 جتنا وہ اس خواب کو یاد کرنے کی کوشش کرتا اتنا
 وہ ذہن سے محو ہونے لگتا۔
 تالیہ نے کن اکھیوں سے اسے اندر جاتے

دیکھا اور سوچا۔ (کیا اسے کچھ یاد آیا تھا؟ اس نے
 اسی پھل کے بارے میں کیوں پوچھا؟ شاید ایسے
 ہی۔) وہ مشکوک سی نظروں سے بند دروازے کو
 دیکھتی اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔
 ☆☆☆
 ایڈم بن محمد کے چھوٹے سے گھر کے باغچے میں
 مرغی گھاس پھٹی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چوڑے
 اب بڑے ہو چکے تھے اور چوں چوں کرتے اس کے
 آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ برآمدہ خالی بڑا تھا اور
 راہداری کا دروازہ کھلا تھا۔ بچن سے مسالوں کی خوشبو
 اور برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
 بھاری بھر کم داتن شاچنگ بیگز اٹھائے
 برآمدے میں کھڑی تھی۔ زور سے سلام جھاڑا تو ایڈم
 کی ماں تو لیے سے ہاتھ پوچھتی راہداری میں آئی اور
 تعجب سے اسے دیکھا۔
 ”میں لیانا صابری ہوں۔ ایڈم سے ملتا ہے۔“
 ماں نے اچھی سے اس ڈھیلے سے جے میں
 لمبوس فرہ، عورت کو دیکھا جس کے ہتھکڑیاں لے بال
 کندھوں تک آتے تھے اور وہ اسے دیکھ کے پلکیں
 جھپکا جھپکا کے مسکرائی تھی۔
 ”میں ایڈم کو بلاتی ہوں۔“ وہ اسے سر سے سر
 تک دیکھتی اندر چلی گئی۔
 ایڈم کاغذوں کا ڈھیر پھیلانے بیٹھ پہ بیٹھا تھا۔
 بچن سے غصے جھگڑوں پر نشان لگا رہا تھا۔ ماں اس
 کے سر پر جاکے غرائی۔
 ”یہ تم سے ملے عجیب عجیب لوگ کیوں ہر روز
 چلے آتے ہیں؟“
 ”اب کون آیا ہے؟“
 ”ایک امیری عورت۔“ ماں کی نظروں میں
 اس کے ہاتھوں میں پکڑے ڈیزائنر شاچنگ کے بیگز
 گھوم گئے۔
 ایڈم نے گہری سانس لے کر کاغذ اکٹھے کیے۔
 لیوں پر مسکراہٹ درآئی تھی۔
 ”وہ ایک شہزادیوں جیسی خوب صورت اور رحم

دل لڑکی ہے ایبو۔ اس میں عجیب کیا ہے۔
 پھر سر اٹھایا تو ماں بے یقینی سے اسے گھور رہی تھی۔ وہ چونکا۔
 ”جے تالیہ آئی ہیں نا؟“ ایبو نے دائیں بائیں نفی میں گردن ہلاتی تو وہ کاغذ چھوڑ کے تیزی سے باہر بھاگا۔
 برآمدے میں آرام کرسی پر داتن جیروں کی قیمتی بجائے بیٹھی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میز پر شاپنگ بیک رکھے تھے۔
 وہ کمرہ ہاتھ جمائے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو دھوپ کا راستہ رک گیا۔
 ”یہ آپ کیا اٹھالائی ہیں۔“
 داتن نے ماتھے پہ ہاتھ کا چھتا ہٹا کے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تم جتنے اچھے نظر آسکتے ہو اتنے نظر بھی آؤ۔“
 ایلم کے ہاتھ پیلوؤں میں جا کرے۔ حیران سا ہو کے اس کے سامنے کرسی بٹھک کے بیٹھا۔
 ”آپ مجھ سے کیا کروانا چاہ رہی ہیں۔“
 ”تم نے کچھ نہیں کرنا۔ تم اب ایک معروف اخبار کے رپورٹر ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سیلبرینی رپورٹر بن جاؤ۔ ویسے تو اپنی کسٹلنٹی کی میں نہیں لیا کرتی ہوں لیکن تم تالیہ کے دوست ہو تو تمہیں میں معاف کرتی ہوں۔“
 شان بے نیازی سے ہاتھ جھلایا۔ ایلم نے آنکھیں سکڑ کے اسے دیکھا اور پھر آگے کو جھک کے ان بیگز میں جھانکا۔
 ”برائنڈ سوٹ جوئے، ٹرٹس، گمڑی۔ اور یہ ہینر موز پر فوخر۔ اف داتن۔۔۔ اس سب کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ شرمندہ ہوا۔
 ”یہ سب ضروری ہے اور اب تم میرے ساتھ میری دوست کے سیلون چل رہے ہو جہاں تمہارا نیا ہمسر کٹ کیا جائے گا، تمہیں گروم کیا جائے گا، تمہیں بڑے اینکڑ کی طرح اوڑھنا پھنسا سکھایا جائے گا۔ پھر تم جم جاؤ گے۔ گو کہ تم پہلے ہو مگر تمہیں خبیث میں

آنے کی ضرورت ہے۔ اور پھر۔۔۔“
 ”آپ مجھے جے تالیہ کے قابل بنانا چاہتی ہیں؟“ وہ زخمی سا مسکرایا تو داتن نے گہری سانس لی۔
 ”تم کسی بھی طرح دان فارچ سے کم نہیں ہو۔ کیڑوں جوتوں سے بہت فرق پڑتا ہے۔ ابھی دان فارچ کو عام سال لباس پہنا دو تو کوئی اسے دیکھے گا بھی نہیں۔“
 ”وہ جیا میں معمولی لباس پہن کے ہی جائے بنایا کرتے تھے اور جے تالیہ ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا کرتی تھیں۔“
 اس کی مسکراہٹ کا زخمی پن گہرا ہوا۔ داتن نے گہری سانس لی اور آگے ہو کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
 ”تم ایمان داری سے اسے حاصل کرنا چاہتے تھے نا؟ ایمان داری میں مشقت ہے۔ اور قیمتی انسان مشقت کے بغیر نہیں حاصل کیے جاسکتے ایلم بن محمد۔ خود پہ محنت کرو اور اپنی ذات میں اعتماد لاؤ۔ اگر اس کے بعد بھی وہ تمہیں ٹھکرا دے تو قسمت کو الزام دینا، رشہ ٹوٹنے کے تم کو سزا دینا کہ مشکل ہو جاتا ہے۔“
 وہ چند لمحوں اور اسی سے اسے دیکھے لیا، پھر مسکرا کے سر ہلایا۔ ”اوکے۔ تو اب ہم سیلون چل رہے ہیں؟“
 ”ہاں اب ہم سیلون چل رہے ہیں۔“ داتن بھی مسکرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 اگر اسے تالیہ کی نظیروں میں خود کو کسی قابل بنانے کے لیے محنت کرنی تھی تو وہ کرے گا۔
 اگر زندگی چانس کا دھرم انام ہے تو ایک چانس وہ بھی لے گا۔ مگر سے نکلنے وقت اس نے طے کر لیا تھا۔

☆☆☆

ابھی اتار ہو کے پورچ میں آئی تھی اندر آتی کار کو دیکھ کے وہیں ٹھہر گئی۔ ڈرائیور اس کے لیے دروازہ کھولے کھڑا منتظر تھا اور وہ اس کار کو رکھتے ہوئے دیکھ رہی تھی جس کے اندر اشعر بیٹھا تھا۔
 ”تم نہیں جا رہی تھیں؟“
 وہ کار سے باہر نکلا اور اس کی طرف آیا۔ عصرہ کو دیکھتے ہی نظیروں میں ستائش درآئی تھی۔ ہنر اسکرٹ بلاؤز کے اوپر زرد اسٹول سر پہ اوڑھے وہ کانوں میں ہنرے پہنے بہت باوقار لگ رہی تھی۔
 آنکھیں الینٹ مشکوک انداز میں اس پر جمی تھیں۔
 ”ہاں۔ دن میں کئی جگہوں پہ جانا پڑتا ہے۔ تم اس وقت یہاں؟“
 وہ ناشتے کے وقت آیا کرتا تھا یا رات میں۔
 یوں کام کے اوقات میں کب آتا تھا۔
 ”نہیں یہ بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے خود آ گیا۔“ ساتھ ہی اشعر نے ہاتھ کے خفیف اشارے سے اسے ارد گرد کھڑے گاؤں اور ڈرائیور کو دور جانے کا کہا۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئے۔ اب وہ دونوں عصرہ کی کار کے پاس آئے سامنے کھڑے تھے۔
 ”وہ بہت ناراض ہے مجھ سے۔“ کا کا۔ ہمیں اس کے خلاف یہ چال نہیں چلی چاہیے تھی۔“
 ”کون؟“ عصرہ نے اٹھتے سے اسے دیکھا۔
 ”تالیہ اور کون۔“ پھر وہ ٹھنکا۔ ”اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مجھ سے اسے خود سارے معاملے سے آگاہ کر دیا ہے کہ صوفیہ رحمن کے پاس عثمان کو بیچنے کا آئیڈیا آپ کا تھا۔“
 ”اللہ! اللہ!“ عصرہ دنگ رہ گئی۔ ”میری تو اس سے کل سے بات ہی نہیں ہوئی۔“
 اشعر نے گہری سانس لی۔
 ”مجھے شک تھا۔“
 ”اللہ! تم کیا کہہ رہے ہو۔ تالیہ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم اس کے خلاف فٹیش شروع کروا رہے تھے؟“
 ”ظاہر ہے میں نے بتایا تھا مگر آپ کا نام نہیں

لیا تھا۔۔۔“ اس نے مجھ کے سر جھکا۔ ”اس نے خود ہی بجانب لیا کہ اس میں آپ کا ہاتھ ہے۔ بہر حال ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور۔۔۔“
 لیکن عصرہ کی سوئی ایک ہی بات پہ انگ مٹی تھی۔
 ”تم نے اسے۔۔۔ تم نے اسے خود بتا دیا؟“
 اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”مگر کیوں؟“
 اشعر نے کار سے ٹیک لگائی اور شانے اچکائے۔
 ”آجنگ نے مجھے کہا تھا کہ اگر میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اس سے بچ بولنا چاہیے۔“
 ”سچ مائی فٹ۔“ وہ ایک دم غصے سے غرائی۔
 ”تم نے فارچ کو تو نہیں بتایا نا؟“
 ”نہیں۔۔۔ اور میرا نہیں خیال وہ ان کو بتائے گی۔“
 ”تم کس دنیا میں رہتے ہو اشعر محمود یا اللہ۔۔۔ یا اللہ!“ لال بھجھو کا چہرے کے ساتھ عصرہ دبا دبا چلائی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اشعر کا منہ ٹوچ لے۔
 ”وہ دونوں تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ وہ لڑکی یہاں کیریر بنانے نہیں آئی۔ وہ فارچ بن راجزل کو حاصل کرنے آئی ہے۔ وہ۔۔۔ وہ مکار gold-digger میرے شوہر کے پیچھے ہے۔ تمہارے نہیں۔“
 اشعر ایک دم سیدھا ہوا۔ اس پہ جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کی باکی الٹ دی تھی۔
 ”واٹ؟“
 ”تم ان کے ساتھ رہتے ہو اور تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوا؟ کہاں گیا میرا عیار اور شاطر بھائی؟ اور کہاں سے آ گیا یہ بے وقوف مرد جس کی آنکھوں پہ تالیہ مراد نامی پٹی بندھ گئی ہے؟“ وہ پھٹکار رہی تھی اور وہ سن سا کھڑا تھا۔

بدلتا۔ جس ایڈم نے ان سے محبت کی تھی وہ یہ ایڈم ہے۔“ سیتے پہ اگلی سے دستک دی۔ ”بدلا ہوا ایڈم معلوم نہیں ان سے محبت کرتا ہوگا یا نہیں؟ انہوں نے وہ لٹی میں سر ہلارہا تھا۔

”ہر انسان یونیک اور الگ ہوتا ہے۔ خود کو نکھارنا اور گردن کرنا اچھی بات ہے لیکن کسی دوسرے انسان کے لیے؟ ہرگز نہیں۔ مجھے دان فارغ کا lesser version نہیں بنتا۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ مجھے.....“ اپنے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے ان اکی میلو پہ کام کرنا ہے۔ آئیں کھانا شروع کرتے ہیں۔“ اس نے ساری بات ہی ختم کر دی تھی۔

داتن دھکی دل سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

سوموار کی صبح وہ آفس میں تھی اور جب سے آئی تھی اسٹافرز کے ساتھ بیٹھی قطار میں لگے کمپیوٹرز پہ بیٹھیں کہ اصرار و شکار کا تجربہ کر رہی تھی۔ ارد گرد پر جوش اسٹافرز کا جھمکا لگا تھا اور بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔

بھی اشعر کا پیغام فون پہ جگمگایا۔ ایک ریستوران کا نام اور وہاں پہنچنے کی ہدایت کے ساتھ یہ بھی درج تھا کہ ادھر فارغ اور وہ اس کے منتظر ہیں۔

تالیہ نے سر اٹھا کر گھڑی دیکھی تو بج کر یک قریب تھی۔ صبح سے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ جانے یہ غیر اعلانیہ سچ اتنا ضروری کیوں ہو گیا تھا کہ انکسشن سے چاروں پہلے وہ لوگ اس میں وقت ضائع کر رہے تھے؟ کوفت سے سوچتی وہ نیچے آئی اور کیب بلالی۔

”مجھے ہر چیز یاد آگئی ہے، ذوالکفلی۔ آپ بھی۔“ کیب کی پچھلی نشست پہ بیٹھے اس نے ذوالکفلی کو فون ملا کے کان سے لگا یا تو دیکھا ڈرائیور نے چونک کے بیک ویو مر میں اس کو دیکھا تھا۔ وہ سنبھلی اور گھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے قدیم طے

میں کہنے لگی۔

”پچھلے دو دن سے مجھے سب یاد آ گیا ہے۔ میرا بچپن۔ ہم کیسے محل سے نکالے گئے تھے۔ اور پھر مراد راجہ کیسے راتوں کو چنپ کے پمپرو کے لوگوں سے ملتا تھا وغیرہ وغیرہ وہ بے زاری سے کہہ رہی تھی۔

”جانتا ہوں۔ تمہاری بوتل خالی ہو چکی ہے پتری تالیہ۔“ وہ گہری سانس لے کر انہوں سے بولا۔

”میرے ماضی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو مجھے حیران کرے۔ تمہارا کردار بھی مجھے اچھا نہیں لگا۔ سب کچھ میں جانتی ہی تھی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”یادیں عجیب چیز ہیں پتری تالیہ۔ لوگ ان کو یاد کرنے سے نہیں ڈرتے۔ ان کے وار سے خوف کھاتے ہیں۔ ماضی یاد آ جانا الگ چیز ہے مگر کسی خاص موقع پہ اس یاد کا دل پہ حملہ آور ہو جانا بالکل الگ۔“

”واٹ ایور۔“ اس نے سر جھٹک کے فون رکھ دیا۔ کیب منزل تک پہنچ چکی تھی۔

وہ ایک خوب صورت اور پریش ریستوران تھا جس کے بڑے سے ہال کی چھت اور اوچی تھی اور اس سے نکلنے فالوئرس کے کرکٹرز دوپہر میں بھی چمک رہے تھے۔ دور دور تک پھیلی میزوں پر امراء اور با اثر کاروباری حضرات لٹچ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک میز پہ فارغ اور اشعر کے ساتھ عصرہ جمود بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔

تالیہ نے گہری سانس لی۔ (تو وہ ایک فیملی لڑکی تھا؟ پھر اسے کیوں بلایا تھا؟ اھنیا یہ بھی مسز عصرہ کا آئیڈیا ہوگا۔)

وہ قریب آئی تو اشعر فوراً اپنی جگہ سے اٹھ اُٹھی مگر عصرہ نے دیکھا کہ دان فارغ بھی کھڑا ہوا تھا۔ وہ اتنا بے نیاز انسان تھا کہ ہم کسی کے لیے اٹھتا تھا۔ تاہم عصرہ مسکراتی رہی۔ تالیہ کے سلام کا جواب بھی

انہی سے دیا۔ میز گول تھی اور چاروں طرف ایک ایک کرسی رکھی تھی۔ عصرہ اور اشعر آٹھ سائے تھے اور تالیہ دان فارغ کی سیدھ میں بیٹھی تھی۔ چونکہ محل تھا۔

”اس لڑکی کو کوئی خاص وجہ ہے سر؟“ اس نے ہلکی پھیلاتے ہوئے تجذیبی سے پوچھا۔

”تم سب لوگ پچھلے میں اتنے مصروف ہو کر ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔“ فارغ سے پہلے عصرہ ہتھیلی پہ ٹھوڑی بجائے خوش دلی سے گویا ہوئی۔ ”میں نے زبردستی آج ان دونوں کو وقت لانے پہ مجبور کیا ہے۔ ان شاء اللہ اگلا ڈنر ہم فارغ کے جیسے ہی خوشی میں ساتھ کریں گے۔“

تالیہ نے اس کے بچے سنو رے چہرے کو دیکھا اور مسکرائی۔ ”آپ کی پلائنک کی داد دینی چاہیے مسز عصرہ۔ آپ تو وہ گزرتی ہیں جو ہمارے گمان میں ہی نہیں ہوتا۔“

عصرہ جمود کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ سر پہ اسٹول اوڑھے میک اپ اور تازک جیولری سے خود کو مزین کیے وہ ٹھوڑی کو ہتھیلی کے پیالے پہ لگائے تالیہ کو دیکھتی رہی۔ اشعر البتہ نکھارنا تو تالیہ نے نظریں اس کی طرف موڑیں۔

”انکسشن ابھی ہم نہیں جیتے لیکن سلیر یٹ کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک چیز ابھی بھی ہے۔“ وہ یوں دوستانہ لہجے میں بولا جیسے دونوں کے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”اچھا۔ وہ کیا؟“ فارغ نے اس سے پوچھا۔ وہ آج گرے سوٹ میں ملبوس تھا، ایک کھٹے ہوندا سے کن انٹرویو میں جاتا تھا۔ البتہ بانی دونوں کی نسبت ادھشاش بٹاش اور آرام دہ نظر آ رہا تھا۔

”بچے تالیہ نے اذیب کا اسکیٹل جس طرح ڈنر لیا اور ایمان کو جھوٹا ثابت کیا، وہ قابل تحسین ہے۔“

”حالانکہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔“ عصرہ کی مسکراتی گہری نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ”ہم سب

مکمل
حنا

بہنوں کا اپنا ہمارا

لاہور

اپریل 2019 کا شمارہ شائع ہو گا ہے

اپریل 2019 کی شمارہ کی ایک چوٹی

ہر گھر کے لیے مکمل حنا

☆ ”دل دیان گلان“ رمانا آلاب کا مکمل ناول

☆ ”آنڈیل“ سید وجیہ بخاری کا مکمل ناول

☆ ”کھل انھے گلاب“ حشری کا مکمل ناول

☆ ”میں وقسم“ بشری سیال کا ناول

☆ ”شہر دل کا راستہ“ حسین اختر کا ناول

☆ ”ماصل زیست ہونم“ نصیر امف کا ناول

☆ ”سیما بیت عام، سوچا لک، شاہنواز“

سادیہ چوہدری اور راجہ اختر شیخ کے ناول

☆ ”دل گندیدہ“ امہرم کا سلسلے وار ناول

☆ ”اسیر عشق“ سدرہ البتھی کا سلسلے وار ناول

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ تمام مستقل

سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

اپریل 2019

کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی

بک اسٹال سے طلب کریں

جانتے ہیں کہ ادیب کتنا غلط — اور بدکردار آدی ہے۔

”کاکا۔“ اشعر نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا۔ ”ادیب کو پروڈیکٹ کرنا پارٹی کے لیے ضروری تھا۔“

”یہاں میڈیا کے کیمرے نہیں لگے، ایش۔ ہم ایمان داری سے ایک معاملے کو ڈسکس کر رہے ہیں اور میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ ایمان کو غلط ثابت کر کے ہم نے ادیب جیسے عزم کا ساتھ دیا ہے۔ ہے تا تالیہ؟“

ویٹر کھانے کی ٹرے لے آئے اور باری باری سرو کرنے لگے۔ ایسے میں تالیہ نے بڑے غلے سے عصرہ کو دیکھا۔ ”ادیب بن سوت کو ہم نے پارٹی سے نکال دیا ہے، مسز عصرہ۔“

”مگر عزت کے ساتھ۔ حالانکہ تم سب کو اس کے جرائم کا علم تھا مگر تم سب نے اس کا پردہ رکھا۔“ مسکرا کے پلکیں جھپکا کے بولی تو تالیہ نے کچھ سخت کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ۔۔۔۔۔

”تم جانتی ہو یہ witch hunt کی اصطلاح زبانِ زعام کیسے ہوئی تھی؟“ وان فارح نے بھاپ اڑاتا پلیٹر اپنے سامنے کھکاتے ہوئے کہا تو عصرہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

”وچ ہنٹ؟“

”ہاں۔ جب انقلابی سوچ رکھنے والے لوگوں کو ناجائز الزام لگا لگا کے ہارگٹ کیا جا رہا ہو تو کہتے ہیں نا کہ وچ ہنٹ ہے۔“ اس نے پلکیں کھولا اور اپنے گھٹنوں پہ پھیلا لیا۔ پھر پلیٹر سے اسٹیک کا ٹکڑا اٹھانے لگا۔

”یہ قدیم امریکہ کے Salem witch hunt کے قصوں سے ماخوذ اصطلاح ہے۔ جانتی ہو Salem میں کیا ہوا تھا؟“

عصرہ کو اس کی مداخلت اچھی نہیں لگی تھی، مگر ضبط سے سنتے گئی۔ تالیہ بھی فارح کو دیکھ رہی تھی اور اشعر۔۔۔۔۔ وہ خاموشی سے باری باری آنے سامنے

بیٹھے باس اور چیف آف اسٹاف کے چہروں کو ہنسنے رہا تھا۔

”Salem میں چھوٹی چھوٹی لڑکیوں نے ایک نیا کام شروع کیا تھا۔ وہ کسی بھی مرد کی طرف اشارہ کر کے کہتیں کہ یہ آدی witch (جادوگر) ہے۔ جادو کرنا ان دنوں گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جب پادریوں نے اس معاملے کو دیکھا تو کہا کہ خدا ان بچیوں کے ذریعے جادو گروں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ وہ بچیاں پادریوں کے ساتھ گھر گھر جاتیں اور جس کی طرف جاتے انگلی اٹھا دیتیں۔ وہ آدی چیتا چلاتا کہ میں جادو نہیں جانتا مگر ان کا اعتبار نہ کیا جاتا۔۔۔۔۔ عصرہ کی آنکھوں میں دیکھ کے دھیرے دھیرے بتانے لگا۔ ”ایسے معاملے کو وچ ہنٹ کہتے ہیں۔“

آخر میں اس کی ٹون قدرے سخت ہو گئی اور عصرہ کی مسکراہٹ بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اس نے بس سر جھکا، ایک قہر آلود نظر تالیہ پر ڈالی اور اپنا کھانا پلیٹ میں رکھ لے گئی۔ اشعر بھی بغور فارح کو دیکھ رہا تھا جو تالیہ کا دفاع کر کے اب کھانے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

ماحول میں ایک دم تناؤ آ گیا تھا۔ چاروں خاموش تھے۔

دفعاً تالیہ کھٹکھٹا دی۔

”سراسر ابھی پلکیوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لے کر آ رہی ہوں۔“

”اچھا۔ اور؟“ فارح نے کانٹے سے جھپکی کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”حاکمی صاحب ہر روز کوئی نہ کوئی اسٹنٹ کر کے ویڈیو پبلک کر دیتے ہیں۔ اور ان کو کافی آئینش مل رہی ہے۔ ہم البتہ صرف آپ کی تقریروں اور ووٹرز سے رابطوں میں لگے ہیں۔“

”تو یہی کیا جاتا ہے نا انتخابی مہم میں۔ لوگوں سے ووٹ مانگے جاتے ہیں۔ تقریریں کی جاتی ہیں۔“

عصرہ تیز آواز کے ساتھ چھری کانٹے سے

اسٹیک کاٹ رہی تھی۔ ماتھے پہ پل تھے اور چہرہ جھکا ہوا۔ اشعر دونوں کو باری باری دیکھتا خاموشی سے کھا رہا تھا۔

”مگر سر۔۔۔۔۔ ہمیں کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔ کچھ۔۔۔۔۔ کچھ حیران کن جو اکثریت کا فیصلہ ہمارے حق میں بدلی دے۔ میں شام تک کچھ آئیڈیاز آپ کو دکھاؤں گی جو۔۔۔۔۔“

عصرہ نے زور سے کانٹا پلیٹ میں گرایا۔ سب اسے دیکھنے لگے۔

وہ مسکرائی اور محذرت خواہانہ انداز میں کندھے اچکا۔

”سودی۔۔۔۔۔ مجھے سیاست پور کرنے لگتی ہے۔ ہم کوئی اور بات بھی تو کر سکتے ہیں۔ جیسے۔۔۔۔۔“ انگلی سے گال پر آئی لٹ کو مصیبت سے چپے کیا۔ ”جیسے بچے۔۔۔۔۔ جولیان بالخصوص جو تالیہ کو بہت پسند کرتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ (فارح کو دیکھ کے بتانے لگی) کوئی بچک ٹرک دکھائی تھی جولیان کو۔ وہ ب سے اس کی فین ہے۔ اس دن بولی کہ۔۔۔۔۔“

”بڑی اپنائیت سے بیویوں والے انداز میں شوہر کو باری باری۔ وہ مسکرا کے سنتے لگا۔

تالیہ کی نظریں اس کی کلائی پہ جھکیں۔ وہاں نہری بر سیلیٹ ابھی بھی موجود تھا۔ یہ اس اسٹیج پر سیلیٹ کی نقل تھی۔ تالیہ کے لیوں پہ مسکراہٹ ابھر کے معدوم ہوئی۔

”آریا نہ بھی مجھے بہت پسند کرتی تھی۔“ وہ اسے سے بولی تو عصرہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

”سر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میرا ایک ڈرامہ دیکھنے آئی تھی۔ اس میں میں نے تاش تاشی ایک پری کا کردار کیا تھا اور آریا نہ کو وہ بہت پسند آیا تھا۔“

عصرہ کی آنکھوں میں دیکھ کے بتایا۔ ”اسی لیے سر مجھے تاش کہتے ہیں کیونکہ آریا نہ کو میرا یہی نام معلوم تھا۔“

”ہاں۔ اسے بہت پسند تھا وہ ڈرامہ۔ تاش ادا پورا۔“ فارح بھی مسکرا کے یاد کرنے لگا۔

”مگر تم دوبارہ اس شو میں نہیں نکلیں۔ کیا

ادا کاری چھوڑ دی؟“ وہ عام سے انداز میں پوچھنے لگا تو عصرہ سر اٹھنے والے انداز میں بولی۔

”ادا کاری اتنی آسانی سے تھوڑی چھوٹی ہے؟“

”درست کہہ رہی ہیں مسز عصرہ۔ ایک رول اس کے بعد بھی کیا تھا میں نے جو یادگار تھا۔“ وہ مسکرا کے بتانے لگی۔

”اچھا۔ کون سا رول؟“

تالیہ نے کانٹے سے پھلی کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے چبانے کے بعد مزے سے بولی۔

”ایک شہزادی کا کردار جو ملکہ سلطنت کے ایک بندہ لہارا کی بیٹی تھی۔ بندہ لہارا اس کی شادی زبردستی ایک بگڑے امیر زادے سے کرانا چاہتا تھا مگر چونکہ شہزادی کو اپنے باپ سے نفرت تھی تو وہ ایک غلام سے۔۔۔۔۔“

اور وقت بلی بھر گھبر گیا۔

سارے حساب کتاب اٹھ ہو گئے۔

سارے لمحے گھڑی کی سوئیوں کا تھام کے رک گئے۔

تالیہ مراد کے دل میں درد کی لہر اٹھی۔ اس کا سانس رکا۔

پھلی کا ٹکڑا حلق میں پھنسا۔

وہ ہلکا سا کھانسی۔ پھر بندہ دل پہ رکھی۔

”کسا ہوا؟“

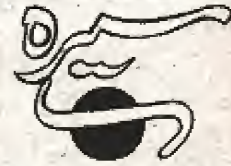
”تم ٹھیک ہو تاش؟“

آوازیں۔۔۔۔۔ فکر مندہ چہرے۔۔۔۔۔ اسے وہ سب دھندلے سے نظر آئے۔ اور پھر اپنی آواز کسی کونوں سے آئی سنائی دی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

سورج کی عیبت

ماٹیل ————— فریہ اججاری
میک لپ ————— ووڈ بیٹی پاوالو
فریہ گولائی ————— موسیٰ دھما



”سیرہ..... سیرہ..... آ نکھیں کھولو، پلیز آ نکھیں کھولو!“

اس نے اپنے گال پر اک ہاتھ کا پس محسوس کیا تھا۔ وہ ہاتھ گال سے ہٹا رہا تھا۔ ہاں اودھ محسوس کر سکتی تھی..... اچھا تو وہ محسوس کر سکتی تھی تو وہ زندہ تھی۔ زندہ تھی۔ اس نے نیم غنودگی میں ہی ڈرپ کی سوئی والا ہاتھ نفاہت سے پکڑ رہا تھا۔

وہ مریکوں نہیں گئی تھی؟ آخر کیوں؟ وہ بری طرح سے ٹوٹی تھی۔ نہیں رہنا چاہتی تھی وہ زندہ..... اس تکلیف کے ساتھ اتنی اذیت کے ساتھ..... ہل ہل سکتی زندگی..... لہو لہو درویش ڈوہ بی حیات یوں کہ ساعت ساعت تڑپتی ہوئی تھی۔

اسے ایسی زندگی نہیں چاہیے تھی۔ زندگی ہو تو وہ ہو کے اسے جینے کا من چاہے نہ کہ یوں مرنے کا..... اور اگر کسی نے زندہ ولی کا مطلب جاننا ہوتا تو وہ لغت کا سہارا نہ لیتا..... وہ بس سیرہ غفار کو اک بار مل لیتا۔ سیرہ تو ایسی سیرہ تھی مگر اب.....

☆☆☆

اس شہر میں اگر کوئی بابائے کیمسٹری تھا تو وہ حسان بن زید تھا۔ پڑھاتا نہیں تھا کانسٹریٹ کو حفظ کروا دیتا تھا فارمولے، مساوات، بیلیٹس کرتا کوئی اس سے سیکھے ازیر کر دیتا تھا۔ کیمیکل ری ایکشن روڈا دیتا تھا۔ ایسی خدا داد صلاحیت کا مالک تھا کہ سارا شہر اپنے بچوں کو کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کروانا چاہتا تھا۔ حسان بن زید بنانا چاہتا تھا اور اگر ابھی حسان بن زید کو دیکھو تو وہ پتھر دیتا نظر آئے گا۔

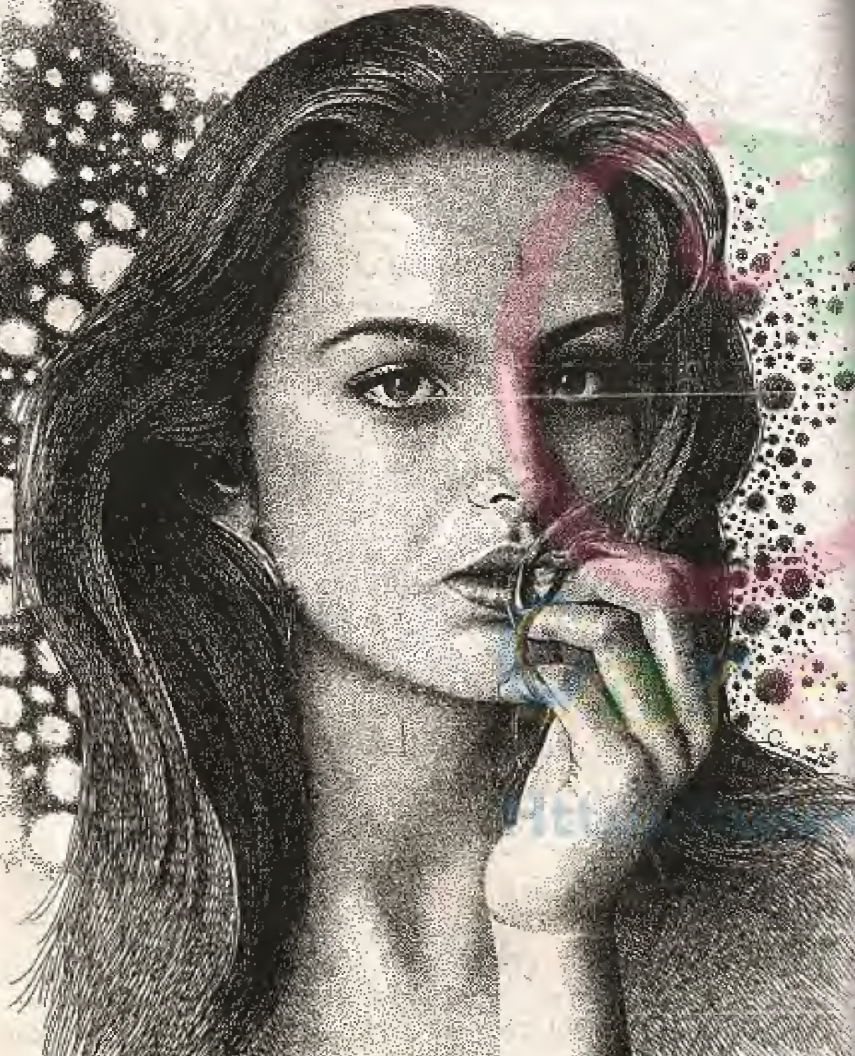
یہ ایک کوچنگ سینٹر کا کمرہ تھا۔ اور وہ آنکھوں پر کالا چشمہ لگائے۔ مٹی میڈیا کے سہارے کھٹا کھٹ

اتنا ہی سرد تھا جتنا کہ موت کا ہوتا۔

اور گرویشنوں کی آواز بھی اور اس کا سانس دھیمبا دھیمبا چلتا تھا۔ بھرے بھرے گالوں کی سرخی کھو گئی تھی۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آتی تھیں۔ رنگت زرد سے زیادہ ہچکی اور سفید ہو چکی تھی۔ اور وہ مرنے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔

☆☆☆

کیمو کا سائیکل ہوا۔ اسپتال میں چند دن گزارنے کے بعد جب وہ گھر آئی تو اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ خود سے اٹھ کر بیٹھنے سے بھی قاصر تھی۔ وہ اپنے ہر کام میں خدائی کا شکار ہو چکی تھی۔ اپنی ارد گرد چلتے پھرتے زندگی کے مختلف کام سر انجام دیتے لوگ



لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتے ہوئے ٹیکچر ڈیلیور کر رہا تھا اور بچے..... وہ اپنے علم تیز تیز چلاتے۔ اس بچہ کو..... اس کے بولے گئے الفاظ کو اسکرین پر نظر آتے مواد کو اتارتے جاتے تھے وہ ایک خاص قسم کے سرافٹ ویئر کی مدد سے پڑھاتا تھا اور ابھی جب وہ ٹیکچر دے رہا تھا تو اک کونے سے یک دم آواز آئی تھی۔

”سرا یہ مساوات کیسے بیلیٹس ہو رہی ہے؟“ ”اوجھر آئے۔“ اس نے طالب علم کو بلایا اور جب وہ ڈائس کے پاس گیا تو حسان نے بازو برہند کر کے اس کے آگے کی۔

اور اب وہ طالب علم اس برہند بازو پر سمجھ نہ آنے والی مساوات لکھ رہا تھا۔

☆☆☆

گول چہرہ..... بھرے بھرے گال..... یا قوت کی سرخی کو مات دیتے ہونٹ..... سیاہ سیدھے، پشت تک آتے بال..... اور اوپر سے اٹھارواں سن..... جوانی تھی تو اند کر آئی تھی۔ جوانی میں تو گدھی بھی پیاری لگتی ہے وہ تو پھر سیرہ تھی۔ جس کو دیکھو اور زندگی کا مطلب جان لو۔ ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی لڑکی اور جب وہ ہنستی تھی نا تو آنکھیں مسکرا کر چھوٹی ہو جاتی تھیں تو اور وہ بھی پیاری لگتی تھی۔

اور اب..... یہ وہ ہی سیرہ تھی..... وہ ہی سیرہ..... پیاری Acute leukemial کیمو تھراپی کا تیسرا سائیکل اور پڑنے والی سیرہ..... جو کہ اب ہار مان چکی تھی۔

اگر ابھی تم اسے دیکھو تو وہ ہسپتال کے ایک بستر پر جٹ لیٹی جھٹ کو کھورتی نظر آتی تھی۔ چہرے پر کچھ

اسے زہر لگتے تھے۔

”وہ کیوں تندرست تھے کیوں؟ انہیں بھی بیمار پڑنا چاہیے۔ بستر پر ہونا چاہیے۔ وہ چلتے کیوں ہیں کیوں؟“

اسے شدت سے حسد محسوس ہوتا اور حسد آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ جانا چاہتا تھا مگر شفاہت اسے روکنے بھی نہ دیتی تھی۔

ابھی بھی وہ لاؤنج کے کاؤچ پر لیٹی اسکرین پر چلتی تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ اپنی زبردستی اسے کمرے سے نکال کر لائی تھیں اور نی دی آن کر کے لگائیں۔ اسے ان تحریریں تصاویر میں رہتی بھر دل چاہی نہ تھی وہ تو انہیں یوں دیکھتی تھی کہ جیسے غائب توڑ دے گی ان کی۔ بازو کے تھے اوپر دے گی اسی طرح کا محتاج بنادے گی کہ جیسے وہ خود ہو چکی ہے۔ کوئی بارنگ شو تھا اور میزبان اب مہمان کو بلارہی تھی۔ چیمبل بھی کوئی مقامی تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر دیکھا تھا اور پھر جیسے نظر نہ ہٹا سکی۔ چند لمحوں بعد۔۔۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھی تھی۔

معلوم نہیں اسے کیا ہوا تھا مشکل سے ہی مگر وہ اٹھ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آئی، پہلے بیڈ کرسیاں ہموار کیا اور پھر لیپ ٹاپ آن کیا۔ کمرہ کھلی کر اس نے وہاں ایک نام ٹاپ کیا اور اب وہ سامنے دیکھنے والی معلومات کو پڑھنا چاہتی تھی مگر نظر بار بار پھر سی جاتی تھی۔ سر کھوتا سا تھا۔۔۔ وہ فوکس نہیں کر پاتی تھی مگر پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ کسی توانائی بھی جو یک دم اس کے اندر ایک جوان انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی اور اس نے اپنی مطلوبہ معلومات گوگل سے حاصل کر لی تھیں۔

”کیا کر رہی ہو سیرہ؟“ اسی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے کمرے سے تک آئی تھیں اور اب یوں اسے لیپ ٹاپ کھولے دیکھ کر حیران ہوئی تھیں۔ ”چیچ۔۔۔ اور طبیعت خراب کرو گی؟“ انہوں نے اس کے ہاتھ سے لیپ ٹاپ لیا تھا۔ جانتی تھیں کہ وہ بہت ضدی ہو گئی تھی۔ اپنی من مرضی کے کام ہی

کرتی تھی۔

”ای!۔۔۔۔۔“

”جی ماں کی جان۔۔۔۔۔!“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔ کتنے عرصے بعد اس نے یوں پکارا تھا۔

”مجھے اکیڈمی میں داخلہ لینا ہے۔“
اور ای کو ایک دم الیکٹرک شک لگا تھا۔
”سیرہ!۔۔۔۔۔“ وہ حیرت سے بس یہ ہی کہہ سکی تھیں۔

☆☆☆

اور وہ یک تنگ۔۔۔۔۔ ملک چھپکے بنا۔۔۔۔۔ سانس لیے بنا اسے کتنی تھی۔ اسے زندگی سے اب اور کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔۔۔۔۔ بس اک وہ آواز۔۔۔۔۔ بس وہ آواز چاہیے تھی۔ وہ سننا چاہتی ساری عمر، تاحیات۔ اور ہاں اودہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔

محبت اک معجزہ اور وہ دروغ ہونا چکا۔ اللہ کی نازل کردہ اک پھونک۔۔۔۔۔ جو مردہ دلوں کو زندگی کی حرارت بخشنے۔۔۔۔۔ محبت اگر اک غیر منطقی شے ہے تو یہ منطقی سیرہ غفار پر فٹ بیٹھی تھی۔ محبت اودہ جو کہ ہوئی ہوئی ہے اور ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ سو وہ سیرہ غفار کو بھی ہو گئی تھی۔ کیا فرق پڑتا تھا؟ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ بستر مرگ پر پڑی تھی۔ اس کا وجود ہڈیوں کی ایک گائتھ بن چکا تھا۔ بیماری سے اس کے حواس خسرے متاثر ہو رہے تھے۔ مگر اس سب سے کیا فرق پڑتا تھا، جان لو کہ لگو میا جان لیوا نہ تھا۔

جو بیماری اب کہ لاحق ہوئی تھی نا۔۔۔۔۔ وہ تو جان ہی نہ چھوڑتی تھی اور اس کے لیے تو کیمو کا کوئی سائیکل بھی نہ تھا جو کہ اس کی Acutends کے آگے ذرا سا اثاب ہی لگا دیتا تھا۔ وہ اس کو چنگ سینٹر میں بس اک کیمیشری کی کلاس لینے آئی تھی۔ وہ کلاس لینے نہیں آئی تھی۔ وہ تو حسان بن زید کو دیکھنے آئی تھی۔

☆☆☆

وہ تیسرا دن تھا۔

”رول نمبر سترہ۔۔۔۔۔ نیو ایڈمیشن۔۔۔۔۔ سیرہ غفار۔“

اور اس کے مسکرانے پر رول یوں دھڑکا کہ جیسے کسی پہلی کوکر یک کر کے ہی چھوڑے گا۔ اس کا سانس لینا مشکل ہوا۔ ہاتھ پرا بھی تک کیوں لگا ہوا تھا۔ گو کہ حالت بہتر ہونے پر ہی اس کی ضد کے آگے ہار مانتے ہوئے اس کا داخلہ کروایا گیا تھا مگر وہ پھر بھی کسی دوسرے عام، نارمل انسان کی طرح نہیں تھی۔

رول نمبر سترہ۔۔۔۔۔ سیرہ غفار؟

اور اب کے سب بچوں نے گروپیں گھاگھا کر اسے دیکھا۔ اس کی زرد رنگت کچھ اور زرد ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔
”جی سر!“ اک منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔
”طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟“ اور اس نے بے حد حیرت سے حسان کو دیکھا۔
”آپ کو میری طبیعت کا۔۔۔۔۔“

”یہ بات اہم نہیں۔۔۔۔۔ اہم میرا سوال ہے۔ طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟“ اس کی بات ترنت کائی گئی تھی۔ سیرہ نے رد عمل میں ہونٹ پیچھے تھے۔
”طبیعت اب ہی تو اچھی ہوئی ہے۔“ وہ ہڑبڑائی۔

”ٹھیک ہوں سر۔۔۔۔۔!“
”مجھ میں آرہا ہے آپ کو؟ کوئی مسئلہ تو نہیں۔“
”لو سر۔۔۔۔۔!“ رٹا رٹایا جواب آیا۔ ”پر وہاں سمجھنے کے لیے آنا ہی کون تھا۔“

”اچھا!۔۔۔۔۔ ذرا ادھر آئیے پھر۔۔۔۔۔“ وہ اب اپنی آستین چڑھا رہا تھا اور سیرہ کا خون خشک ہوا۔
”یہاں آ کر ذرا یہ تو پینکس کریں۔“

اور سیرہ غفار نہیں جانتی تھی کہ وہ یوں پکڑی جائے گی۔ وہ ٹھنک کھڑی رہی۔
”سیرہ۔۔۔۔۔!“ اب کے حکم سے بلایا گیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے ڈانس کی جانب بڑھی تھی۔ اس نے پہلے ہی بازو پر اک مساوات لکھ رکھی تھی۔ (یوں تو وہ oral ٹیسٹ لیا کرتا تھا مگر سیرہ

جیسے طالب علموں کو پکڑنے کا اس کا یہ ہی طریقہ تھا) سیرہ نے اک نظر اس کے برہنہ بازو پر ڈالی۔ دوسری نظر سے اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر نظر جھکائی۔ جانتی تھی کہ وہ دیکھ نہیں سکتا۔ وہ تاپنا تھا مگر پھر بھی اس سے اس کا چہرہ بند نہ دیکھا گیا۔
اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اور اس وقت اس کا دل شدت سے جاہا۔ اتنی شدت سے کہ شدت آنکھوں سے بہہ نکلی۔

”کاش حسان بن زید تم ذرا دیر پہلے ملے ہوتے۔۔۔۔۔ یا پھر کاش۔۔۔۔۔ اے کاش میں یوں نہ ہوتی۔۔۔۔۔ کوئی عام سی لڑکی ہوتی مگر یوں نہ ہوتی۔۔۔۔۔ میں اب چاہ کر بھی تمہارے ساتھ کی چاہ نہیں کر سکتی۔ کہ یہ ہو نہیں سکتا۔۔۔۔۔ سیرہ کیسا دکھ بھرا دل لے کر مرے گی۔ آہ! اور آنسو کا اک گرم قطرہ حسان کے بازو پر گرے۔۔۔۔۔ وہ میری طرح چونکا! سیرہ نے قلم اٹھایا۔ اور لکھا۔۔۔۔۔!“

”مساوات میں نہیں تم برابر کرو حسان بن زید!۔۔۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اب ذرا کرنا یہ مساوات برابر؟ تمہاری ساری کی ساری کیمیشری ٹاک کے راستے باہر نہ نکلی تو کہنا۔“

اس نے جملہ لکھا۔ زور سے قلم کو ڈاکس پر رکھا، سر اٹھا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ حسان نے ترنت اپنی آستین نیچے کی تھی۔ اس کا بندہ سرخ ہوا۔۔۔۔۔ جڑے بچھ گئے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ ”گیٹ آؤٹ۔“

وہ دھواڑا سیرہ پھر وہاں رکی نہ تھی۔ وہ ٹاک کی سیدھ میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ چند لمحوں تو کتنے ہی تھے خود پر قابو پانے کے لیے۔ سو وہ بھی فوراً ہی نارمل نہ ہو سکا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم بے تاثر ہوا اور وہ پھر معمول کی طرح یوں پیچر دینے لگا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور طالب علم سوالیہ نظر دن ایک دوسرے کو تکتے تھے کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔

☆☆☆

حسان بن زید - پیدائشی ناپتا۔ ہوسکتا تھا کہ حسان بھی عام ناپتاؤں کی طرح۔ ایک محتاج کی زندگی گزارتا۔ ایسی زندگی کہ جس میں کوئی وسیلہ روزگار بھی نہ ہوتا۔

وہ میرے تیرے کا محتاج رہتا مگر..... یہ اس کی غیر معمولی ذہانت تھی جس نے اس کے باپ کو مجبور کیا تھا کہ وہ حسان کے لیے کچھ لگ سوچے۔

حسان انجیل اسکول میں پڑھتا رہا اس کا باپ اسے کسی چیز کا محتاج نہیں بنانا چاہتا تھا۔ سو وہ قرض اٹھا کر اس کے لیے باہر ممالک سے خاص الیکو پینٹ منگواتا رہا۔ گوکہ پاکستان میں بھی کچھ الیکو پینٹ موجود تھا مگر زید صاحب! یوں کچھ لیجے کہ ایک لیول آگے جانا چاہتے تھے۔ Auditory Access Devices سے لے کر ٹیکنک اسکیلز تک انہوں نے حسان کے لیے بہت محنت کی تھی۔ حسان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے اور جب ایسے کسی گھرانے کو حسان جیسا بچہ پالنا پڑے اور پھر تعلیم کا حصول ممکن بنانا پڑے تو آپ ان کی کی جانے والی محنت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس کے باپ نے اپنی ہڈیاں محنت میں لگائی تھیں تو آج حسان اس مقام پر تھا کہ یونیورسٹی ایجوکیشن حاصل کر رہا تھا اور وہ بھی اپنے خرچے پر۔

سن یہی سن کوئی پچیس تیس کا ہوگا۔ وہ اگر آنکھوں سے کالا چشمہ نہ اتارے تا تو کوئی جان نہ سکے کہ وہ ناپتا ہے۔ شخصیت وہ کہ لڑکیاں پیچھے رہ جاتی اور اسے دیکھتی زیادہ تھیں اور جب کسی کو کوئی نمبر پیکل یا مساوات یا پھر کوئی موضوع سمجھ نہ آتا تو وہ یوں ہی۔ بازو بٹھک کر سمجھاتا تھا۔ پہلے وہ طالب علم کا مسئلہ سمجھتا اور پھر کاغذ قلم کے ذریعے اسی مسئلے کو سمجھاتا تھا۔

اور یہ اس کے ساتھ چلی مرتبہ ہوا تھا۔ چلی مرتبہ یوں ہوا تھا کہ کسی لڑکی نے ایسی حرکت کی تھی۔ وہ عموماً لڑکیوں کے معاملے میں احتیاط کرتا تھا اور اگر کسی لڑکی کو کچھ سمجھ نہ آتا تو وہ کسی اچھے لائق طالب علم کو

سمجھانے کا کہہ دیتا۔ بہت کم..... بہت ہی کم وہ لڑکیوں کو یوں ڈانس تک بلاتا تھا اور آج.....

اس کا بازو عادی تھا..... کہ اس پر بہت سے عدد لکھے جاتے تھے۔ علامتی نشان بھیجنے جاتے تھے۔ مگر آج وہ کیا تھا جو کچھ لکھا گیا..... کسی شے کا علامتی نشان تھا جو کچھ لکھا گیا۔ بازو میں اس جگہ سے دیکر رہا تھا کہ جہاں وہ لفظ لکھے گئے۔ مل مل کر دھونے کے باوجود..... وہ جلن جیسے بار بار تازہ ہوتی تھی۔ دیکر دیکر جاتی تھی اور حسان بن زید نے زندگی میں پہلی بار محبت کے اظہار کا مزہ چکھا تھا..... ایسا اظہار جو سکون نہ دے۔ قد اونچا نہ کرے۔ کسی سنگھاس پر نہ بٹھائے بلکہ اک بے چینی بھری انجمن بخش جائے۔

تو کیا وہ باگل بھی جو کچھ جیسے..... ہاں باگل ہی تو تھی۔ اس کی آنکھ سے چپکنے والا گرم پانی جیسے روح کو جھلسا گیا تھا اور اس بات پر مہر ثابت کرتا تھا۔

کہ ہاں! ابھی اسے حسان بن زید سے محبت! کر لو پھر جواب کرتا ہے، ہے تو بس ہے۔

☆☆☆

وہ ”زندگی“ جو یک دم اک جوان انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی تا وہ جیسے پانی کا بلبل ثابت ہوئی تھی، اپنی موت آپ مری گئی۔ لڑنے کا حوصلہ جو پہلے ہی ختم تھا۔ اس کا گراف کچھ اور نیچے گیا تھا۔ وہ میڈیسن نہ کھانے کی ضد کرتی اور بعض اوقات آنکھ بجا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتی۔ اس دوران وہ اسپتال کا چکر بھی لگا آئی تھی۔ ایڈمٹ رہی تھی۔ بیکو کا چوٹھا سائیکل ہوتا تھا اور حالت تھی کہ دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے موت کو گلے لگانے کی تیاری میں تھی۔ اسے ترس نہیں آتا تھا۔ اپنے ماں، باپ پر..... ماں جیسی بہن جو بھی اسے سنتوں ترلوں سے بھی بہانوں سے، کبھی جذباتیت سے اور کبھی رعب سے دوا کی کھلانے کی کوشش میں بلکان رہتی تھی۔

وہ رو پڑتی..... ہاتھ باندھ دیتی پر سیرہ غفار کو علینا غفار پر رحم نہیں آتا تھا۔ ذرا سا بھی نہیں آتا تھا۔ اتنا سا بھی نہیں..... محبت نے اسے ”بے حس“ سنگ

دلی“ کا تھخہ بخشا تھا..... جب اسے زندگی سے راحت نہیں ملتی تھی مرتے مرتے بھی زندگی نے اسے نہ بخشا تھا تو وہ کیوں راحت باخشی پھرے..... کیوں؟

”سیرہ..... سیرہ کیوں کرتی ہو ایسا؟..... خدا را ترس لکھاؤ ہم پر۔“ اس کی بہن رو پڑی تھی۔

”اسے ترس آیا..... آیا ترس اسے؟..... نہیں آتا! تو نہیں کیوں کھاؤں ترس..... کیوں؟“ وہ حلق کے بل چلائی۔ اور علینا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

”کس کی بات کر رہی ہو سیرہ!“ اور سیرہ نے آتسو بھری آنکھوں کے ساتھ منہ موڑ لیا۔

”سیرہ مجھے بتاؤ..... بتاؤ نا چیز..... کس کی بات کر رہی ہو۔“ مگر اس کے ہونٹ مہر بند ہو گئے۔

علینا پوچھتی رہی..... اس کی منت کرتی رہی لیکن اسے جواب نہیں دیتا تھا سو نہیں دیا۔ علینا تھک ہار کر اٹھ گئی اور جب دروازے تک پہنچی تو۔

”آپنی امیری وصیت لکھ کر محفوظ کرلو۔ مجھے اپنی آنکھیں ڈونٹ کرنی ہیں اور تمہیں انہیں حسان بن زید تک پہنچانا ہے۔ وہ جب بھی دیکھے تو میری نظر سے دنیا کو دیکھے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا نا آپ! تو روز قیامت مجھے اپنا چہرہ نہ دکھانا۔“

وہ بڑے بے حس لہجے میں بولتی تھی۔ سرد انداز میں بات کرتی تھی۔ اور علینا.....!

”حسان بن زید!“ اس کے لب بنا آواز بولے تھے۔

”یہ تو اس کا یکمشری کا..... اوہ! تو اس نے اس لیے اکیڈمی میں..... اور علینا شاک کے عالم میں منہ پر ہاتھ رکھے اسے تک رہی تھی اور وہ گردن موڑنے کھڑکی سے باہر۔

☆☆☆

”میں علینا ہوں سیرہ غفار کی بہن؟ آپ کو یاد ہوگا میں آپ کو اس کے بارے میں خاص تاکید.....!“

”سیرہ آپ کو اپنی آنکھیں ڈونٹ کرنا چاہتی ہے تو.....“

”اب میں کیا اس کے مرنے کا انتظار کروں گا۔ اسے کہیے گا کہ میری فکر میں بلکان ہونے کے لیے میرے ماں باپ ہیں اس کی ضرورت نہیں مجھے!.....“ اسے سخت جملوں پر علینا کا دل چسپے کٹ کر گر تھا۔

”اس کے مرنے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا آپ کو۔ وہ مر رہی ہے۔“ اس نے مر رہی ہے پر زور دیا۔

”Acute Leukemia“ اس نے تکلیف سے کہا اور وہ سن کر رو گیا تھا۔ بازو پر اک قطرے کی تیز جلن جیسے زندہ ہوئی تھی۔ کچھ الفاظ جیسے خون سے داغے گئے تھے۔

”ایم سوری.....“ وہ دھیمی آواز میں بس یہی کہہ سکا۔

”یاد ہوگا آپ کو۔ اس کی طبیعت کی خرابی کا بتایا تھا آپ کو۔“

”میں سمجھا ایسے ہی کچھ بخار و خار ہو گیا ہوگا۔“ اور اس کا لہجہ معذرت کرتا ہوا لگتا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ میں انوار ہو گئی ہے۔ تب ہی ضد کر کے آئی تھی۔ نہیں معلوم..... نہیں جانتی میں کہ اس نے آپ کو کہاں دیکھا مگر سیرہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو یوں منہ سے کسی کا نام لیتی۔“ اور حسان کا منہ سرخ ہوا اس نے نام نہیں لیا بس آنکھیں آپ کو ڈونٹ کرنے کا کہا تو.....

ذرا سی دیر کو اس نے سانس لیا۔

”مگر پیاری کی وجہ سے وہ بہت بدل گئی ہے۔ باغی ہو گئی ہے۔ اس نے آپ کا نام نہیں لیا مجھے روشنی کی کرن دکھائی ہے۔“

اور علینا چپ ہو گئی اتنی چپ کہ بے ساختہ حسان کو کھانٹ کر اسے متوجہ کرنا پڑا۔

”وہ بیکو کے سائیکل کے لیے نہیں مان رہی..... اور میں۔“ علینا نے بے ساختہ خشک پڑتے ہونٹ تر کیے۔

”میں آپ سے ایک فیور لینے آئی ہوں۔“

”جی؟“ وہ ذرا سا حیران ہوا۔

”کیا آپ اس سے ملنے آ سکتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کے کہنے پر وہ مان جائے گی۔“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں میں؟“ وہ بدکا۔

”پلیز!..... خدایا بات کو سمجھیے۔ وہ مر رہی ہے اور آپ.....“

”پلیز خاتون..... پلیز۔ میں کیسے یہ کر سکتا ہوں۔ آپ جانتی ہیں نا..... سمجھ سکتی ہیں نا میرے آنے کو وہ دنیا سے کبھی کی اور میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔“

”آپ کے دھوکے سے کسی کو زندگی ملتی ہے حسان صاحب! زندگی!..... جو اک بار چلی جائے تو لوٹ کر نہیں آتی۔ واپس نہیں ملتی۔“ علینا جذباتی ہوئی۔

”پلیز!..... میں آتا ہوں۔ وہ سائیکل کرا لیتی ہے۔ پلیز یہ بھی فرض..... بلکہ اللہ کرے کہ اس کے بعد وہ مکمل صحت یاب ہو جاتی ہے تو پھر سچ اسے پھر سے مار نہ دے گا۔“ وہ بھی تندہ میں بولا تھا۔

”تب کے مرنے اور ابھی کے مرنے میں بہت فرق ہے حسان صاحب! بہت فرق۔ دل کے مرنے سے سانس نہیں ٹوٹتی اور سانس کے ٹوٹنے سے لوگ مر جاتا کرتے ہیں..... اس پار چلے جایا کرتے ہیں کہ جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا۔“

”میں اس کے دل کی نہیں..... اس کی ضرورت ہے۔ ہمیں وہ اپنے سامنے سانس لیتی نظر آتی رہے بس دکھتی رہے۔ سوچ سکتے ہیں آپ اس کے جانے سے..... اس کے ماں باپ پر، مجھ پر کیا بے گئی؟ سوچ سکتے ہیں آپ؟ سوچ سکتے تو یوں بات نہ کرتے۔ زندگی اہم ہے..... اس کی سانس ضروری ہے اور تب کیا ہوگا؟

کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ چار دن رو پٹ لے لی..... مردہ دل ہو جائے گی مگر پھر اگر زندگی ہوگی نا تو وہ اسے خود..... گھٹنوں پر ٹیک کر زندہ رہنے پر مجبور کرے گی۔

محبت کے بنا بندہ جی سکتا ہے حسان صاحب! اس سانس کے بنا نہیں۔

اس کا آٹھ کو کیمو ہے اور اگر آپ تین کو تشریف لے آئے تو یقیناً..... جانے آپ کا احسان..... چار دن.....

”پلیز..... پلیز اگر آپ..... کو ان دنوں سب سے

ہوگا۔ ہماری نسلیں آپ کے پاؤں دھو دھو کر پینیں گی اور بچے آپ کے نام کا تعویذ پہنا کریں گے۔“

وہ ایک کاغذ اس کے سامنے بٹختے ہوئے بولی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے آنسو ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔

ناک سرخ ہو رہی تھی اور ہونٹ لڑ لڑ کر اندر کی حالت بیان کر رہے تھے..... اور حسان بن زید یوں سناکت بیٹھا تھا کہ جیسے ہوتو یوف کا مجسمہ مگر پھلنے کو تیار.....

”زندگی دینے والی ذات ہے شک اللہ کی ہے حسان بن زید مگر یاد رکھیے گا..... یاد رکھیے گا کہ وسیلہ ہمیشہ وہ انسان کو ہی بناتا ہے۔“

اور اس نے ایک اور آج دینا جملہ پھینکا تھا۔ وہ کچھ اور کھلا تھا۔

☆☆☆

8 جولائی 2018ء۔

صبح سے دن ڈھلا۔ دوپہر ہوئی۔ سہ پہر آن پہنچی مگر وہ نہیں آیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ علینا کا دل یوں جیسے گھٹ گھٹ جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ آج تو دل بند ہو کر ہی رہے گا۔ وہ نہیں آیا تو؟.....

اور اس کے بعد، اس کی آنکھیں بھر بھر آئیں اور چھلک چھلک پڑتی تھیں۔

اس نے چاہا کہ وہ اسے ایک کال کرے مگر ذہن نے کہا تو ہوا انتظار، دل نے کہا نہیں نہیں انتظار جان لیوا ہے۔ عزت نفس نے بھی ہش ہش کر کے چپ کروانا چاہا مگر وہ جوا ندر بیڈ پرسونیوں اور تالیوں میں جکڑی پڑی تھی۔

وہ جو کہ کیمو نہ کروانے پر ہند تھی، وہ جو کہ کسی زس، ڈاکٹر کو آتا دیکھ کر زور زور سے چیختے لگتی تھی۔ سوئیاں کھینچ کھینچ کر جسم سے اتارنے لگتی تھی۔ ہاتھ مار کر دوایاں کرا دیتی تھی۔

وہ اس کی ”زندگی“ تھی اور زندگی کے آگے کیا دماغ اور کہاں کی عزت نفس..... جوتی تلے جل نہ ڈالے وہ نہیں۔ اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کال ملائی۔

”پلیز یہاں بیٹھیے.....! علینا نے مدد کی۔ وہ اسی طرح سے ٹوٹتے ہوئے کہہ رہا تھا

پاری ہے تو آپ کو اس کا واسطہ..... باپ جان ہے تو میں ان کی جوتیوں کو ہاتھ لگاتی ہوں..... اور اگر اللہ آپ کا بھی رب ہے تو اس کی رہائیت کا واسطہ۔ خدا را آجائیں۔“

وہ ہلکتے ہلکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور اس کا سسکنا، ہلکانا دل کو درد سے بھر رہا تھا۔

”میں یہاں رہیں پشمن پہ ہوں۔ کمرہ نمبر بتائیے پلیز!.....“

اور وہ آواز نہ تھی..... آپ حیات تھا۔ اس نے فون بند بھی نہ کیا۔ ایک دم پھینکا اور روتے ہوئے رہیں پشمن کی طرف بھاگی تھی۔ اور اسے دیکھ کر.....

میں اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”اب سیرہ کیسے نہ کروائے گی کیمو..... ہاں تو سیرہ اب بولو..... کیسے نہ کوگی۔“

☆☆☆

”سیرہ!.....! اور اس نے پیرا ریت سے اسے دیکھا۔

”حسان بن زید آیا ہے۔“ اور سیرہ اس کی آنکھ اس جملے پر حیرت کی آخری حد تک پھیل گئی۔ وہ اگر اتنی توانا ہوئی کہ اک جھٹکا کھا کر اٹھ سکتی تو وہ یہ ضرور کرتی۔ اتنی سکت ہوئی کہ وہ دوڑ کر دروازہ کھول کر دیکھ کر یقین کرتی تو وہ ضرور دوڑ کر دروازہ کھولتی۔ سیرہ لی الوقت حیران ہو سکتی تھی بہت حیران! سو وہ ہوئی.....

اس نے بے یقینی سے دروازے کی سمت دیکھا..... اور دروازہ آہستہ سے کھلا..... وہ اسٹاک اور ہاتھ کی مدد سے ٹوٹے ہوئے آگے بڑھا۔

”سیرہ.....؟“ اس نے پکارا۔ مگر سیرہ تو ساکت تھی..... اک دم ساکت۔ جواب دیتی تو دیتی کیسے؟

”پلیز یہاں بیٹھیے.....! علینا نے مدد کی۔ وہ اسی طرح سے ٹوٹتے ہوئے کہہ رہا تھا

پاری ہے تو آپ کو اس کا واسطہ..... باپ جان ہے تو میں ان کی جوتیوں کو ہاتھ لگاتی ہوں..... اور اگر اللہ آپ کا بھی رب ہے تو اس کی رہائیت کا واسطہ۔ خدا را آجائیں۔“

وہ ہلکتے ہلکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور اس کا سسکنا، ہلکانا دل کو درد سے بھر رہا تھا۔

”میں یہاں رہیں پشمن پہ ہوں۔ کمرہ نمبر بتائیے پلیز!.....“

اور وہ آواز نہ تھی..... آپ حیات تھا۔ اس نے فون بند بھی نہ کیا۔ ایک دم پھینکا اور روتے ہوئے رہیں پشمن کی طرف بھاگی تھی۔ اور اسے دیکھ کر.....

میں اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”اب سیرہ کیسے نہ کروائے گی کیمو..... ہاں تو سیرہ اب بولو..... کیسے نہ کوگی۔“

☆☆☆

”کیسی ہو؟“ نرم سا لہجہ اور سیرہ کی آنکھ بھر آئی۔ وہ نیچے پر سر رکھے، گردن موڑ کر اسے ایک ٹک ٹک رہی تھی۔

”علینا! کیا آپ ذرا سا وقت دیں گی ہمیں؟“ ”شش..... شیوہ!.....“ علینا بھڑائی آواز میں کہتے ہوئے وہاں سے ہٹی تھی۔ اور اب..... حسب دستور خاموشی۔

اثر بھی لے رہا ہوں تیری چپ کا تجھے قائل بھی کرتا جا رہا ہوں

”مجھے کہا گیا کہ سیرہ مجھے آنکھیں ڈونٹ کرنا چاہتی ہے مگر سیرہ کو کیا معلوم..... کہ جب سے وہ مساوات برابر کرنے کے لیے دے آئی ہے مساوات حل نہیں ہوئی۔ کسی طرح سے برابر نہیں ہوئی۔ اور لو بھی میری یکسری تو نکل گئی ناک کی راہ پکڑ کر۔“

بولو سیرہ اب بھلا کریں تو کیا کریں؟.....“ اور سیرہ وہ روتے روتے ہنس دی۔

”مساوات برابر کرو حسان بن زید..... ہمدردی نہ کرو۔“ وہ کبھی سی آواز کے ساتھ جھنجھے انداز میں بولی۔

”ہمدردی کرنی ہوتی تو اسی لمحے ہوتی سیرہ غفارا! جب حسان بن زید ہمیں شٹ اپ بولتا.....

یوں کمرے سے باہر جانے دیتا جب کہ اسے تمہاری طبیعت کا معلوم بھی ہو چکا ہو۔“ سچ میں ذرا سے جھوٹ کی آمیزش ہوئی۔

”جان آگے ہی رخصت پہ جا رہی ہے حسان! یوں تو نہ مارو.....! اور وہ بے طرح سے رو دی۔

”سنو سیرہ غفارا..... سنو حسان بن زید تمہاری آنکھوں سے نہیں“ تمہاری آنکھوں کو“ دیکھنا چاہتا ہے۔“ اور وہاں کوئی خوشبو بہار کے جھوٹے کی صورت چھٹکی اور سیرہ غفارا کے گھٹنوں سے ہوتے ہوئے اس کے پورے وجود کو مہکا گئی تھی۔

”میں ذرا ڈاکٹر سے مل کی ٹائمنگ پتا کروں اور تم!..... خیر دار اب جو تم نے ذرا سی بھی بدتمیزی کی۔“

کمرہ نمبر بتائیے پلیز!.....“

اور وہ آواز نہ تھی..... آپ حیات تھا۔ اس نے فون بند بھی نہ کیا۔ ایک دم پھینکا اور روتے ہوئے رہیں پشمن کی طرف بھاگی تھی۔ اور اسے دیکھ کر.....

میں اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”اب سیرہ کیسے نہ کروائے گی کیمو..... ہاں تو سیرہ اب بولو..... کیسے نہ کوگی۔“

☆☆☆

مسکراتے لبوں کے ساتھ فنی میں سر ہلایا..... یوں جیسے وہ دیکھ ہی لے گا۔

”حسان! یہ ہمدردی ہوئی یا جھوٹ ہونا تو جان لینا تمہاری جان سے کم پر نہیں ٹلوں گی میں!“ اور وہ ہنس دیا۔ ”اور اس سب کے لیے تمہاری صحت شرط ہے۔“ سیرہ نے جیسے ہار مان کر اسے دیکھا تھا۔ اندر اس کا علاج ہو رہا تھا اور باہر حسان کے کانوں میں اس کی آواز گونجتی تھی۔

”حسان! پہلے میں مرنا چاہتی تھی۔ خود مرنا چاہتی تھی اور اب اگر میں مر گئی تو خود کو بھی معاف نہ کروں گی..... اور اللہ بھی مجھے میری اس غلطی کے لیے معاف نہ کرے۔“

اف وہ شدت پسند لڑکی..... لیکن ہر محبت کرنے والا شدت پسند ہی تو ہوتا ہے۔ سیرہ بھی تھی۔ لمحہ لمحہ جیسے اپنے ساتھ پتھر کی بھاری سل باندھ لایا تھا۔ دل پر بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور حسان شدت سے منتظر تھا..... شدت سے چاہتا تھا کہ اس کے کان اک ایسی آواز سنیں جو یہ کہے کہ سیرہ اب ٹھیک ہے۔ کبھو کا کامیاب سائیکل ہوا۔

اس موت جیسے سرد کورڈور میں بیٹھے، انتظار کی سل میں لیٹے..... اس کی آنکھ سے اک قطرہ گرنا تھا۔ اور وہ قطرہ نہ تھا..... وہ محبت کی پہلی بوند تھی کہ جو سیرہ

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے

بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ گلیاں یہ چوہارے

فائزہ انصاری

قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اورنگ آباد، کراچی

کی محبت میں گری تھی۔

”زندگی دینے والی ذات ہے شک اللہ کی ہے مگر وسیلہ وہ ہمیشہ انسان کو ہی بناتا ہے۔“ اور وہ وسیلہ بنایا گیا تھا۔ وہ چن لیا گیا تھا۔ اس کے دل کو سیرہ کے لیے نرم کر دیا گیا کہ سیرہ کو ابھی مرنا نہیں تھا..... اسے جینا تھا۔ حسان بن زید کے ساتھ اور حسان کا وسیلہ..... وہ سیرہ تھی..... سیرہ کیا پتا کوئی ذور وقت کے کسی لمحے میں اسے آن ملے اور پھر وہ سیرہ کی آنکھوں سے نہیں سیرہ کی آنکھوں کو دیکھے۔ اور اس لمحے حسان بن زید نے شدت سے خواہش کی..... بری طرح سے ٹوٹ کر دعا کی..... اتنی کہ جو آج تک نہ کی تھی۔ اسے سیرہ کی آنکھیں دیکھتی تھیں اس لیے اسے سیرہ رب

اسے زندگی بخشے والے، اسے روشنیوں کے خالق تو نور ہے سو میری آنکھوں کو بھی نور سے مجر دے۔

”محبت بڑی ہی Odd شے ہے کہ یہ even ہو نہیں سکتی اور یاد رکھیے گا اگر باضی کا ایک اصول ہوتا ہے کہ دو Odd نمبر مل کر ہمیشہ ایک even نمبر بناتے ہیں۔“

اس کمرے کا دروازہ کھلا..... ساعتوں نے وہ آواز جیسے اچک لی تھی..... گھبراہٹ میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دل کی دھک دھک جیسے کچھ اور سننے نہ دیتی تھی مگر اس کی سماعتوں نے اس دھک دھک کے شور میں بھی سنا.....

”شی از فائن ناؤ۔ تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔“ اور اس نے ایک گہرا سکون بھرا سانس لے کر آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا۔ علیٰ ناچار کچھ کہہ رہی تھی مگر اسے سنائی نہ دیتا تھا اور کراچی کے ایک اسپتال میں ایمری صاحب نے دم توڑا تھا۔

”اور وہ اب ہے..... جو زندگیاں بخشا بھی ہے اور لیتا بھی ہے۔“



بہنوں شمع کا اپنا مابینامہ

اپریل 2019 کا شمارہ شائع ہو گیا

اپریل 2019

کے شمارے کی ایک جھلک



”اس آسمان کا چاند“ حیات بھاری کا مکمل ناول،

”ایم کرم ہے تو“ شیریں ملک کا مکمل ناول،

”شہر تمنا“ نعیمہ ناز کا سلسلہ دار ناول،

”شہر زاو“ صائمہ اکرم چوہدری کا ناول،

”شام کی حویلی میں“ رخسانہ نگار عدنان کا ناول،

”سین کا سرال“ راشدہ رفعت کا ناول،

افشین نعیم، عندلیب زہرا، نذیر فاطمہ، عائشہ تنویر اور سوریا ملک کے افسانے،

معروف اداکار ”احمد میر“ سے ملاقات،

”دشک“ فنکاروں سے تعارف کا سلسلہ،

”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ قارئین کا سلسلہ،

”شمع کے ساتھ ساتھ“ قارئین سے سروے،

”پیارے نبی ﷺ کی بیماریاں“،

خط آپ کے اور دیگر مستقل مستقل سلسلے شامل ہیں،

شمع ہر ماہ پوری محنت سے ترقیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خطا میں بتاتے ہیں کہ اپنی محنت میں کئے کامیاب نہ رہے، ہمیں خط لکھنا ہو لیے گا۔

شمع اپریل 2019 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

عمیرہ احمد

القہ

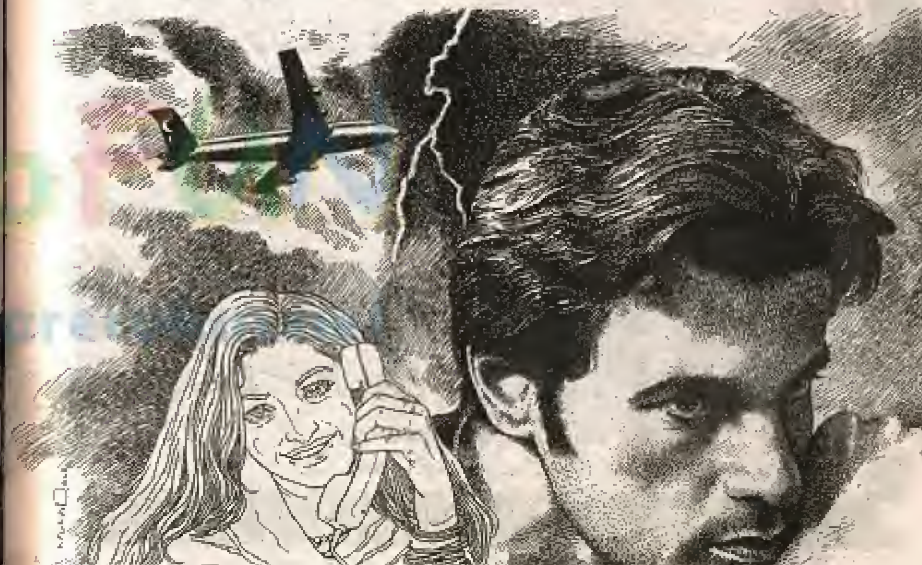
حسن جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے۔

ایک بچہ تو اسے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ جواب کا منتظر ہے ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آ گیا ہے۔

ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ ایک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے گرد روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ مومن سلطان ایک باصلاحیت فنکار ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی موقع نہیں ملا ہے۔ انڈسٹری میں ہیر وٹس اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومن کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہت بڑا مداح ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومن کی ماں ثریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ اب انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومن کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں۔ وہ ڈائریکس پر ہے



گردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومن فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔

نویں قسط



میرے استاد محترم!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ سے مل کر آیا ہوں اور ابھی تک حذرزدہ پھر رہا ہوں۔ پیرس فیشن ویک میں شرکت کے لیے پیرس آیا ہوا ہوں اور ہر شام شانزے لیزے پر دنیا کی چکا چوند میں سے گزرتے ہوئے آپ کو یاد کرتا ہوں۔

خوب صورت عورتوں کے جھوم میں ہنگے ترین برانڈز کی یلغار میں دنیا کی اس بھیڑ میں سکون صرف اس تخلیق میں ہے جو آپ کرتے ہیں، وہاں ترکی کے اس چھوٹے سے گھر کی خاموشی اور سکون شانزے لیزے کی اس چکا چوند پر بھاری پڑتی ہے۔

آپ کے پاس اس گھر میں بیٹھ کر مجھے نہ پیرس یاد آتا تھا، نہ میلان مگر یہاں اس دنیا میں گھومتے ہوئے آپ کی باتیں اور آپ کی خطاطی میرے ساتھ گھومتی ہے، میرا سایہ بن کر۔۔۔۔۔۔ نہ میں کان بند کر سکتا ہوں نہ آنکھیں۔۔۔۔۔۔ کبھی لوں تو فرق نہیں پڑے گا، آپ تو کہیں دل اور دماغ کا حصہ بن گئے ہیں۔ یا شاید روح کا۔۔۔۔۔۔

بڑا غلط کیا آپ نے اسے بیدار کر کے۔۔۔۔۔۔ اب یہ اس جھوم کے بیچ میں رہنا نہیں چاہتی جہاں میں رہتا ہوں، مجھ سے اپنے جیسوں کی محبت مانتی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ میں اسے کہاں سے لا کر دوں عبدالحی صاحب؟ میں تو آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو جانتا ہی نہیں جس کے پاس یہ خوش ہو جائے اور اسے خوش کرنے کی تلاش میں نکلوں گا تو دنیا چھوڑنی پڑے گی، وہ میں چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اس "دنیا" کو اپنے لیے میں نے بہت محنت کی ہے۔ اس دنیا کو پا کر کھودینے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ آپ تو مومن ہیں، آپ نے بھی "دنیا" کی تنہا کی ہی نہیں۔ وہ بار بار چل کر آپ کے پاس آئی بھی تو آپ نے اپنی روح کے دروازے بند رکھے۔ مگر آپ کسی ایسے کو جانتے ہیں جو دنیا کو پا کر اسے خود کھودے؟ کوئی ایسا ملے تو مجھے ضرور ملوائیں اس سے۔ ابراہیم کی مشکل شاید وہ ہی آسان کر دے۔

اس بار آپ کو دیکھ کر دل بڑا بوجھل ہوا، شاید اس لیے بھی زیادہ یاد آ رہے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔ آپ کو غم زدہ اور رنجیدہ دیکھ کر مجھے اپنے ماں باپ یاد آتے رہے۔

میں نے پہلی بار جانا، میرے یورپ آ جانے اور پیچھے سارے رابطے ختم کر دینے کے بعد وہ کیسے تڑپتے ہوں گے۔ طو تو مر گیا، مگر میں نے تو زندہ ہوتے ہوئے بھی انہیں ترسا دیا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا عبدالحی صاحب کہ یورپ آ کر پیچھے رہ گئے رشتوں کو بھول ہی گیا تھا میں۔۔۔۔۔۔ گاؤں۔۔۔۔۔۔ گھر۔۔۔۔۔۔ ماں، باپ، بہن، بھائی۔۔۔۔۔۔ سب۔۔۔۔۔۔ آزاد پرندہ بن کر بیٹا چاہتا تھا میں، پر یہ یاد ہی نہیں رہا تھا مجھے کہ آزاد پرندہ آڑٹا آسمان میں ہے مگر گھونسلہ وہ بھی درخت پر ہی بناتا ہے جس کی جڑیں مٹی میں ہوتی ہیں۔

آپ طے کے لیے کم کو دیکھ کر مجھے اپنے ماں باپ نہیں بھول رہے۔ آپ ظالم نہیں تھے پر میں ظالم تھا۔ ظالم کو اپنے ظلم کا احساس ہو چر تک مظلوم ہی نہ رہے تو پھر ظالم کیا کرے؟ میرے ماں باپ سالوں پہلے دنیا سے چلے گئے اور مجھے احساسِ نیاں آج ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اب اگر تو یہ بھی کروں تو کس منہ سے کروں؟

میرا دل چاہتا ہے، میں آپ سے آپ کا غم بانٹ لوں۔ کاش غم کوئی چیز ہوتا جو میں آپ سے لے کر کہیں دور پھینک آتا۔

میں نہیں جانتا، آپ کا بچھتاوا کیا ہے جس کا بار بار ذکر کر کے آپ پچ ہو جاتے تھے۔ مگر میں یہ بھی نہیں جانتا، طے آپ کے پاس کیوں واپس نہیں آیا مگر میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس نے جو کیا کیوں کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ پیار بہت کچھ بھلا دیتا ہے۔ رب سب سے پہلے۔۔۔۔۔۔ ماں باپ اس کے بعد۔۔۔۔۔۔ دنیا سب سے آخر میں۔۔۔۔۔۔ میں گزرا

ہوں اس راستے سے۔۔۔۔۔۔ اس کے سب خقیب جانتا ہوں اور فراز تو اس راستے میں کہیں ہے ہی نہیں اس کا کیا ذکر کروں۔

طے کی بد قسمتی بس اتنی کہ اس کی قسمت میں شو بزنس کی عورت لکھی تھی۔ میں پاکستان کے شو بزنس کو نہیں جانتا۔ اٹلی اور یورپ کے شو بزنس کو جانتا ہوں۔ شو بزنس کی عورت میں جانتا ہی نہیں رہتی۔ یہ اس بیٹے کی مجبوری ہے پروفا کیوں نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔ یہ وہ خود بھی نہیں جانتیں۔ طے ایک روح تھا، بھٹک گیا۔ شو بزنس بڑی ظالم دنیا ہے اور اس دنیا سے جڑنے والے بھی۔ یہ سراسر بن کر نظروں کو بہکا تا ہے اور تب تک بہکا تا ہی رہتا ہے جب تک انسان اندھا نہ ہو جائے۔

آپ کی بہو ایک بڑی عورت تھی، اس لیے آپ کے لیے آزمائش بن کر آئی۔ لیکن عبدالحی صاحب یہ آزمائش آپ کی زندگی میں نہ آئی تو آپ کا مرتبہ کیسے بڑھتا۔ نیکوں کے راستے میں آزمائشیں آتی ہیں اور بُروں کے راستے میں نکل۔ یہ آپ ہی نے کہا تھا نا مجھے؟

استاد محترم! آپ کی باتیں آپ ہی کو لکھتے ہوئے شرم سے پانی پانی ہو رہا ہوں میں۔ پر کیا کروں، آپ کو دلاسا دینا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میرے پاس لفظوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اگر میں کچھ کر سکتا ہوں آپ کے لیے تو مجھے حکم دیجیے۔ سید ابراہیم آڑٹا ہوا آئے گا۔ آپ کا بیٹا نہیں بن سکتا مگر آپ کا فرماں بردار ضرور ہو سکتا ہوں۔

ایک گمراہ
سید ابراہیم

☆☆☆

وہ میز بہت سارے کاغذات سے بھری ہوئی تھی اور اُن کاغذات میں کیا کیا تھا، کوئی پہلی نظر میں جان بھی نہیں سکتا تھا۔ قلب مومن نے اس میز پر ہمیشہ کھانا دیکھا تھا یا تو وہ یا پھر اخبار گراب اُن تینوں چیزوں میں سے کوئی چیز دوبارہ اس میز پر نہیں آنے والی تھی۔

وہ کتنے دن سے وہاں اس گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں سے مل رہا تھا۔ وہ کتنی بھول گیا تھا۔ وہ کتنے دن سے وہاں آنے والی ڈاک بغیر کھولے اس میز پر ڈھیر کرتا جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ وہ غم میں نہیں تھا وہ حیرت میں بھی نہیں تھا۔ وہ کس کیفیت میں تھا؟ وہ یہ بوجھ نہیں بارہا تھا۔ بے خبری کی وہ کون سی دنیا تھی جس میں وہ اب تک جیتا آیا تھا، وہ صرف یہ بوجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور کسی سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے آخری بار انہیں آئی سی یو میں دیکھا تھا اور اس کے وہاں پہنچنے کے چند گھنٹوں بعد اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اس ہاسپٹل میں اُن کو اُن آخری چند گھنٹوں میں ملنے کے لیے آنے والا واحد شخص نہیں تھا۔ وہ ہاسپٹل اس کے آنے سے پہلے عبدالحی کے اُن شاگردوں سے بھرا ہوا تھا جو اُن کے ہاسپٹل میں ہونے کا سن کر پتا نہیں کہاں کہاں سے آئے تھے اور قلب مومن کا عبدالحی سے رشتہ جان کر اس سے تعزیت کرنے لگے تھے۔

قلب مومن کا خیال تھا، اسے اب عبدالحی کی تدفین کے انتظامات کرنے پڑیں گے۔ اسے یہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسٹیٹ کی طرف سے ان کی آخری رسومات ادا کی جا رہی تھیں اور اس سب میں قلب مومن کی جیسے کوئی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ بیک گراؤنڈ میں چلا گیا تھا۔ ایک خاموش تماشا کی کے طور پر۔۔۔۔۔۔ یا شاید اچھے میں آجانے والے تماشا کی کے طور پر۔

انہیں اپنی زندگی میں قلب مومن کی ضرورت شاید رہی ہو۔ موت کے بعد نہیں رہی تھی۔ وہ مجمع جو انہیں دنیا سے رخصت کرنے کے لیے آیا تھا وہ کہاں کہاں سے آ رہا تھا اور کیوں آ رہا تھا۔ قلب مومن سشدر تھا۔ وہ

جانتا تھا۔ عبدالعلی نامور خطاط تھے مگر وہ ناموری کتبی تھی۔ قلب مومن نے اتنے سالوں میں یہ بھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی اور اب جب وہ ان کا مقام دیکھ رہا تھا تو وہ ششدر تھا۔
 آدھی رات کو وہ اُس میز پر پڑے اُن لٹاؤں کو باری باری کھولنے لگا تھا۔ وہ مختلف ممالک کے کلچرل میگزین کی طرف سے آئے ہوئے تعزیتی پیغامات تھے۔ دُنیا کے بڑے بڑے آرٹ میوزیمز اور گیلریز سے آئے ہوئے تعزیتی خط۔ عبدالعلی کا کام کہاں کہاں نہیں رکھا ہوا تھا اور وہ اُن کا اکلوٹا پوتا اس سب سے بے خبر تھا۔
 اُس گھر میں رات کے اس پہر عجیب سی خاموشی تھی اور اس خاموشی میں اگر کچھ تھا تو کاغذ کی آوازیں یا آتش دان میں چلتی لگتی یوں کی آواز۔

قلب مومن نے ہاتھ میں پڑا وہ سرکاری خط میز پر رکھ دیا جس میں حکومت جاپان نے عبدالعلی کے لیے بعد از مرگ ایک سول ایوارڈ دینے کی اطلاع دی تھی۔ اُس خط میں اس سے پہلے دیے جانے والے ایک اور ایوارڈ کا ذکر بھی تھا اور اس گھر میں قلب مومن نے بھی کہیں ان ایوارڈز میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس گھر کی دیواروں پر پمپل اور نامکمل خطاطی کے نمونوں کے علاوہ کچھ اور تھا ہی نہیں۔ قلب مومن کے اپارٹمنٹ کے برعکس جو اُس نے ہر اُس "ثبوت" سے سچا رکھی تھیں جو دنیا نے اُسے اُس کی نام وری کے لیے دیے تھے۔ اشتہار کی طرح۔

اور اُن اپارٹمنٹ میں کھڑے ہو کر وہ عبدالعلی سے پوچھتا رہا تھا کہ انہیں اُن کے کام نے اتنے سالوں میں کیا دیا اور عبدالعلی بغیر گوائے چپ کھڑے اُس کی باتیں سنتے رہے تھے۔ اور اب اُن کے جانے کے بعد اُن کے سامان میں قلب مومن وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جو دنیا نے انہیں دیا تھا۔
 وہ کتنے دن اور کتنی راتوں سے نہیں سوچا تھا، وہ جیسے کتنی بھول گیا تھا۔ اُسے عبدالعلی کے بارے میں سوچنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ رونے کا بھی نہیں۔ پچھتائے کا بھی نہیں، اور اب اتنے دنوں کے بعد رات کے اُس پہر میں وہ جیسے بھی سارے کام کر رہا تھا۔
 "تو دادا ایہ تھے آپ۔۔۔ اور میں قلب مومن کبھی آپ کو جان ہی نہیں پایا۔۔۔ یا آپ نے جاننے دیا ہی نہیں۔"

ایک کے بعد ایک لفاظی کھولتے، اُن تعزیتی پیغامات پر نظر ڈالتے قلب مومن نے سن ذہن کے ساتھ سوچا تھا۔

"مجھے ساری دنیا جانتی ہے۔ آپ کو کون جانتا ہے۔ آپ نے زندگی کے اتنے سال جس کام کو دیے اُس نے آپ کو کیا دیا۔؟ اور مجھے دیکھیں۔۔۔ مجھے کون نہیں جانتا۔" اُس نے دادا سے کہا تھا۔
 Lourve میوزیم میں اُس ہفتہ The Last Master of Mohaqqiq کے نام کیا گیا تھا۔ قلب مومن نے ہاتھ میں پڑے اُس اطلاع نامہ کو بھی بے حد خاموشی کے ساتھ کاغذوں کے اُسی ڈھیر پر رکھ دیا جنہیں کھولتے کھولتے اُس کے ہاتھ تھکنے لگے تھے۔

Lourve سے برٹش میوزیم، برٹش میوزیم سے یونائیٹڈ نیشنز کی جنرل اسمبلی۔ عبدالعلی کا کام ہر جگہ موجود تھا اور اب اُن کے کام کی تصاویر اخبارات کے اُس ڈھیر میں مختلف ہیڈ لائنز کے ساتھ تھیں جو اس گھر میں سالوں سے آتا تھا اور اتنے دنوں میں جمع ہوتے ہوتے رڈی کے ایک ڈھیر کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اُس رڈی کے ڈھیر کو قلب مومن اب کھنگال رہا تھا۔ اُس شخص کے بارے میں جاننے کے لیے جس کو اُس نے ساری عمر جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ اُسے ترکی کے بہترین بورڈنگ اسکول میں پڑھانا کیسے افورڈ کر پائے تھے۔ اُسے امریکا کی اُس مہنگی

ترین یونیورسٹی میں کیسے پڑھاتے رہے تھے۔ قلب مومن کو آج اندازہ ہوا تھا۔ عبدالعلی کے لیے "دنیا" جمع کرنا اتنا آسان تھا۔۔۔ چلی بچانے جتنا۔۔۔ اور وہ پھر بھی اُس کی طرح اس پیٹنٹ ہاؤس میں نہیں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اُسی مکتوبی کے چھوٹے سے گھر میں گزار دی تھی۔ وہ سارے ایوارڈز جو انہیں دنیا بھر کی حکومتوں اور آرٹ ایسوسی ایشنز کی طرف سے ملتے رہے تھے، وہ اسی گھر میں پڑے چند کسوں میں بند تھے۔ دھول مٹی اور جالوں میں اُلے ہوئے۔ یوں جیسے لینے والے نے اپنے اُن اعزازات کو بھی کھول کر دیکھا تک بھی نہ ہو۔ وہ گھر زندگی میں پہلی بار قلب مومن کے لیے بھول بھلیاں بن گیا تھا۔ وہاں پڑی ہر چیز عقل کو خیرہ کرنے والی۔۔۔ اور اُس گھر کا جانے والا مالک اُس کو سارے جواب دہے ہوئے گونگا کر گیا تھا۔

وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دیواروں پر لگی کیلی گرافیز کو اُس نے پہلی بار بغور دیکھنا شروع کیا۔
 "اور میں قلب مومن" عزت" اور شہرت میں بھی تیزی نہیں کر سکا۔ نام اور ناموری کا فرق ہی نہیں پہچان سکا۔ کامیابی کا مفہوم ہی نہیں سمجھ پایا۔"

اُن کیلی گرافیز کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس کو عبدالعلی کے جنازے کے مناظر نظر آنے لگے تھے۔ وہ ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ تھے جو عبدالعلی کے لیے نکل آئے تھے اور قلب مومن اُس میں بچوٹی جیسا رہ گیا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو بھی وہ دنیا سے اپنا آخری سفر اُسی شان و شوکت سے کرتے۔

"اور وہ جمع جو دادا کو آخری بار رخصت کرنے آیا تھا۔۔۔ وہ لاکھوں کا مجمع کیا صرف انسانوں کا تھا۔۔۔ یا پھر۔۔۔ اللہ کی بھیجی ہوئی ہر مخلوق تھی اُس میں جو عبدالعلی بن تراب کو آخری سلام پیش کرنے آئی تھی۔"
 قلب مومن نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ وہاں اب جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ دیوار پر لگے وہ خطاطی کے شاہکار رات کے اس پہر جیسے عبدالعلی کی زندگی کی داستان قلب مومن کو سامنے میں مصروف تھے۔ ہر رنگ، ہر اسٹروک پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "میرا لکھنے والا اپنے عہد کا بڑا انسان تھا۔"

وہ اب دوسرے کمرے میں پڑا وہ صندوق کھولنے لگا تھا جس کے اوپر پینٹنگ کے بہت سارے پرش اور رنگ پڑے رہتے تھے اور قلب مومن نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اُس کے اندر کیا ہو سکتا تھا۔ مگر اب وہ اُسے کھول کر بیٹھا تھا۔

وہ سارے ایوارڈز اور اعزازات اُس صندوق میں اوپر نیچے پڑے ہوئے تھے جن کا ذکر وہ کچھ دیر پہلے اُن اخبارات اور لیٹرز میں پڑھ رہا تھا۔

"اور میں سمجھتا تھا، عبدالعلی بن تراب کو گھمنڈ ہے۔ ایسے کام کا گھمنڈ جو بے مقصد ہے۔ مگر عبدالعلی بن تراب نے تو اپنی ساری زندگی صرف اللہ کی بڑائی اور کبریائی بیان کرنے میں صرف کر دی تھی۔ اپنی عظمت اور بڑائی بیان کرنے والی ہر شے تو چھپادی تھی انہوں نے۔" اُس نے اس صندوق کو دوبارہ بند کر دیا تھا۔
 "وہ ٹھیک کہتے تھے، انہوں نے ساری زندگی اللہ کی کبریائی بیان کی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا، وہ اللہ کی نظر میں نہ رہتے۔ بند صندوق کے ڈھکنے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے سوچا تھا۔

"اور میں۔۔۔ میں کون ہوں؟ اللہ کی بڑائی بیان کرنے سے انکار کرنے والا۔۔۔ عبدالعلی کے خاندان کا آخری فرد۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

خسارہ ہی خسارہ تھا جو وہ اتنے سالوں میں جمع کر رہا تھا۔ اُس کے سارے اٹاٹے اپنے مالک سمیت پل بھر میں بے سول ہو گئے تھے اُس گھر میں پڑی چیزوں کے سامنے۔

"ہم سمجھتے ہیں جن چیزوں کو ہم خرید لیتے ہیں، حاصل کر لیتے ہیں ہم اُن کے مالک بن جاتے ہیں۔ ہم اُن کے مالک نہیں بنتے اُن کے غلام بنتے ہیں۔ وہ چیزیں ہماری مالک بن جاتی ہیں۔ اُن کی زندگیاں ہمارے گرد

نہیں گھومتیں، ہماری زندگیوں ان کے گرد گھومتے لگتی ہیں۔“
عبدالعلی نے ایک بار کہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ اُسے عبدالعلی کی زندگی کی فطرتی بھیجی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اُس کا خیال تھا، اُسے سمجھنے کی کوشش کرنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ انہیں ایک ”نا کام“ انسان سمجھتا رہا تھا کیونکہ اُس کا خیال تھا۔ اُن کا کام اگر ان کے لیے دنیا کی آسائشوں کا ذخیرہ نہیں لگا سکتا تو وہ کام ”اچھا“ کام نہیں۔ وہ انسان ”کامیاب“ انسان نہیں۔ اور اب اُن کے جانے کے بعد کئی راتیں کو اسی طرح جاتے ہوئے وہ اس ”نا کام“ انسان کی کامیابی کو اپنے کی کوششوں میں بے حال ہوا جا رہا تھا۔

عبدالعلی دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلے تھے مگر دنیا کو اپنے اوپر حاوی کے بغیر۔ وہ قلب مومن صرف دنیا سمیٹے بیٹھا تھا اور دنیا اب آکٹوپس کی طرح اُسے اپنی گرفت میں لے ہوئے تھی۔ وہ کلنا چاہتا تھا اور کل نہیں پار رہا تھا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا اور اُس کی ٹانگیں شل تھیں اور قلب مومن کو کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔
زندگی میں بڑے ”سچ“ وقت پر سارے پردے اُس کی نظروں کے سامنے سے ہٹے تھے مگر بڑے غلط وقت پر اُسے اپنی زندگی کے بارے میں دوبارہ سے سوچنا پڑ گیا تھا۔

اُسے اپنے ایئر ٹرنٹ کے لاؤنج میں گئی ہوئی عبدالعلی کی وہ پیٹنگ یاد آئی جو انہوں نے اُسے قلم میٹنگ کو کیرئیر بنانے کا فیصلہ کرنے پر اُس سال اُسے اُس کی سالگرہ پر دی تھی۔

احمد نالہ صراط مستقیم

مجھے سیدھا راستہ دکھا

وہ سیدھا راستہ جو نہ GPS دکھا سکتا ہے نہ عقل..... وہ راستہ جو دل کی گلیوں سے گزر کر روح تک پہنچتا ہے اور صرف ایمان کی روشنی میں نظر آتا ہے۔ قلب مومن اب ایمان کہاں سے لاتا۔
وہ اُس رات عبدالعلی کے گھر میں بے مقصد پھرتا رہا تھا۔ ایک ایک کمرے کے سو سو چکر کاٹتے ہوئے..... اندر باہر..... اندر باہر..... پتا نہیں کیا تھا جو کم ہوا تھا..... پتا نہیں کیا تھا جو صوفیہ نا تھا۔

☆☆☆

”مومنہ سلطان جنوبی ایشیا کی وہ پہلی ایکٹریس بن گئی ہیں جنہوں نے سپورٹنگ ایکٹریس کے رول کے لیے آسکر ایوارڈ جیتا ہے۔ آپ کے کیا تاثرات ہیں؟“

ریڈ کارپٹ پر شیلی سے انٹرویو کرنے پوچھا تھا۔ وہ ایک ایوارڈ شو میں شرکت کے لیے وہاں موجود تھی مگر ایوارڈ شو سے پہلے ہونے والا وہ ریڈ کارپٹ پوچھنے کے لیے ایک ایئر مومنہ سلطان کی اُس جیت سے شروع ہو کر بار بار اُسی پر ختم ہو رہا تھا۔ جو غیر متوقع تھی ناقابل یقین تھی..... مگر اس وقت پورے پاکستان کے لیے وہ بے پناہ خوشی اور فخر کا باعث بنی ہوئی تھی۔

پاکستانی میڈیا پوچھنے کے چند ہیمنوں سے اُس کی آسکر کے لیے نامزدگی کو بھی اسی طرح کو ترجیح دیا آ رہا تھا جیسے وہ صرف نامزد ہونے پر ہی جیت گئی ہو اور اُس کا سفر بس اتنا ہی تھا۔ مگر وہ نامزد ہونے کے بعد آسکر جیت بھی جائے گی، اس کا یقین کسی کو ابھی تک نہیں آ رہا تھا۔ وہ پاکستان شو بزنس انڈسٹری کے بڑے اور یادگار لوگوں میں سے ایک تھا اور اب اگر اُس کی گونج بار بارستانی دے رہی تھی تو یہ کسی کے لیے بھی اچھے کی بات نہیں تھی۔

شیلی نے اپنی ٹیلیکس بے حد مصنوعی انداز میں جھپکا کیں۔ اپنے گاؤں کو سیدھا کرتے ہوئے اُس نے انٹرویو کے بجائے کیرئیر کو دیکھتے ہوئے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

I am so proud of her..... میں نے خاص طور پر ایکٹیویٹ ایوارڈ شو کی اس تقریب کو مومنہ سلطان کے لیے لائیو دیکھا تھا اور جب اُس کا نام دز کے طور پر پکارا گیا تو میں نے اتنی جھپکیں ماریں خوشی میں کہ

اتنی جھپکیں تو مومنہ سلطان نے بھی نہیں ماری ہوں گی۔“
شیلی بے حد جذباتی انداز میں بات کرتی جا رہی تھی۔

”میں بتائیں سکتی اپنی ٹیلیکس۔“ اُس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ انٹرویو نے اُس کی بات کو درمیان سے کاٹنے ہوئے بے حد غیر جذباتی انداز میں اگلا سوال کیا۔
”آج کس ڈیزائن کو پہنا ہوا ہے آپ نے؟“

شیلی ایک دم گڑبادی تھی۔ ابھی تو اُس نے جذباتی انداز میں اپنی آنکھوں میں آنے والے وہ آنسو بھی حریف کرنے تھے جو اُنہی نہیں رہے تھے تب ہی اُس کے ریڈ کارپٹ پر مومنہ سلطان کے بارے میں دیے گئے ٹکٹس کو جھپکیوں میں جگہ ملتی۔

”میں.....؟ ہاں یہ HSY ہے..... as always۔“ اُس نے لمحہ بھر لگا یا تھا جذباتی سے غیر جذباتی ہونے میں۔ اب وہ اپنا گاؤں جھپک کر دکھا رہی تھی۔ کسی دوسرے کی کامیابی کے بارے میں بات کرنے سے زیادہ تکلیف دہ کام دنیا میں کوئی نہیں ہوتا اور وہ بھی اپنے شو بزنس کے ساتھیوں کے بارے میں..... شیلی نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ مومنہ سلطان پر حسد اور رشک وہ کبھی بھی۔ اب اُسے اُس سے موازنے اور مقابلے کا مسئلہ تھا۔

”آپ کی اگلی قلم قلب مومن کے ساتھ تھی..... وہ کب شروع ہو رہی ہے؟“ انٹرویوور گاؤں کو سترانے کے بعد سیدھا اُس کی دکھتی رنگ پر آیا تھا..... قلب مومن کی spiritual قلم جواب قلم انڈسٹری میں قلب مومن کی نفسیاتی قلم کے طور پر مشہور تھی۔

”ہاں..... وہ..... بہت جلد..... اب ڈیٹ دوں گی جلدی۔“

شیلی نے مسکراہٹوں کے جلوے بکھیرتے ہوئے جیسے اپنی عزت بچائی اور دل ہی دل میں قلب مومن کو چار گالیاں اور دیں۔ وہ اتنے ہیمنوں سے گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب تھا اور وہ اُسے قلم کی ڈشیں دے کر پھنس گئی تھی اور دنیا مومنہ سلطان کا طواف کرنے میں مشغول تھی۔

☆☆☆

”اس وقت ہم مومنہ سلطان کے پرانے گھر کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں مومنہ سلطان نے اپنی زندگی کا ایک بڑا وقت گزارا اور یہاں پر لوگوں کی خوشی دیدنی ہے۔ ہم اُن کے ایک ہمسائے سے ابھی ابھی بات کر کے بٹے ہیں اور اب ہم اُن کے علاقے کے ایک اور ساتھی سے آپ کی ملاقات کرواتے ہیں اور اُن کے تاثرات آپ کو سنواتے ہیں۔“

نیوز رپورٹر خوشی اور سینے دھنوں سے بے حال تھا اور گلی میں اُس کے گرد لوگوں کا جھوم تھا جو ہر قیمت پر کیرئیر کے فریم میں آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رپورٹر اب جھوم سے بات کرنے لگا تھا۔

”میں تو جی اُس دن سے تاج رہی ہوں جس دن سے ایوارڈ ملا ہے..... ذک ہی نہیں رہی جی میں..... مجھے تو ہمیشہ سے پتا تھا کہ مومنہ باجی نے کوئی بڑا کام کرنا ہے۔ میں کوئی رشتہ بھی انہیں۔“ جھوم نے شاید اور بھی کچھ کہنا چاہا تھا مگر نیوز رپورٹر نے مداخلت کرتے ہوئے اُس کی بات سچ میں کافی تھی اور وہاں اسٹوڈیو چلنے کا اعلان کیا تھا۔

ایل ای ڈی پر اب وہ نیوز کاسٹر آنے لگی تھی جو اسٹوڈیو میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”ابھی آپ نے اسٹیشن رپورٹ دیکھی ہے مومنہ سلطان کے آسکر کی جیت کے بعد عوام کا رد عمل اور اُن کے اپنے سننے اور پرانے علاقے کے رہائشیوں کے اُن کی اس جیت پر تاثرات..... ہم آپ کو یہاں یہ بتاتے

لینے جاؤ گی۔۔۔۔۔ پھر اسے پہنچ کر بنا اور میرا ٹھیک ہو کر ناکہ اگر جہانگیر نہ ہوتا تو۔۔۔

اس کے کانوں میں جہانگیر کی آواز گونجی تھی۔ وہ جانے سے پہلے جیسے اُس کی قسمت کا حال بتا کر گیا تھا اور مومن نے اُس کو ایوارڈ لینے ہوئے جہانگیر کو وہ ایوارڈ ڈیڈی کیٹ کیا تھا بالکل ان ہی الفاظ میں اُس کا شکر یہ ادا کیا تھا جن میں اُس نے کہا تھا۔

”جہانگیر نہ ہوتا تو مومن سلطان آج یہ ایوارڈ لے یہاں کھڑی نہ ہوتی۔ اُس کے ہونے نے مجھے ایک اداکارہ بنایا۔ اُس کے نہ ہونے نے ایک ستارہ۔۔۔۔۔ وہ نہیں آسمان میں آج یہ ثرائی تھا مے مجھے دیکھ رہا ہوگا اور منتظر ہوگا کہ میں اُس کا نام لوں اور شکر یہ ادا کروں تو جہانگیر تہہ دار بہت بہت شکر۔۔۔۔۔ تم نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔“ اُس کے کانوں میں اپنی بھاری ہوائی آواز اور گونجتی ہوئی تالیوں میں جہانگیر کے لیے کہے ہوئے لفظ اس خاموشی میں بھی بازگشت کی طرح گونجنے لگے تھے۔ وہ پچھلی رات پاکستان آئی تھی اور آنے کے بعد سب سے پہلے جہانگیر کی قبر پر گئی تھی۔ اُسے آسکر دکھانے۔ یوں جیسے اُس آسکر کو حاصل کرنے کا سارا مقصد ہی یہ تھا۔

میز پر پڑا ہوا اُن کا اُس نے اُس کی سکرین دیکھی۔ وہ ایرویلین موڈ میں تھا اور بے حد شائستہ تھا وہاں کوئی پیغام تھا نہ کوئی مسد کال، نہ کوئی آنے والی کال نہ کوئی آنے والی میٹنگ کی یاد دہانی۔۔۔۔۔ اور اب وہ اُسے آن کرئی تو یک دم بار بار اُسے اپنا سانس بحال کرنے کی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔۔۔۔۔ نام کے لیے؟۔۔۔۔۔ ناموری کے لیے؟۔۔۔۔۔ شہرت کے لیے؟۔۔۔۔۔ کامیابی کے لیے؟۔۔۔۔۔ رزق کے لیے؟۔۔۔۔۔ یہ سب اب تھا اُس کے پاس ان میں سے کسی چیز کے لیے بھاگنا نہیں پڑ رہا تھا اُسے۔ مگر اس کے آگے کیا تھا اور اس سب کے بعد کیا تھا یہ وہاں بیٹھے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”What is next to ecstasy?“ اُس نے ”چیر کامل“ میں ایک جگہ پڑھا تھا اور اب وہ خود سے وہی سوال کر رہی تھی۔

”کامیابی کے بعد کیا۔۔۔۔۔؟ اُس سے بڑھ کر اور کیا؟“

☆☆☆

”یار! کوئی اس طرح تھوڑی کرتا ہے جس طرح مومن بھائی نے کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ دادا کی ذمہ دہ ہوگی لیکن مہینوں عاقب ہو جاؤ۔۔۔۔۔ نہ بیچ کا جواب دو نہ فون اٹھاؤ نہ ای میل کھولو اگلا خوار ہو جائے۔“ دادا اُس شام بڑی طرح تپا ہوا تھا۔

وہ مومن کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا اور یہ اُس کی اور ٹینا کی روز کی روٹین تھی وہ بے مقصد وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ کام کرنے کے لیے نہیں تھا اور جو بھی تھا وہ اتنا میں پڑ چلا گیا تھا کیونکہ مومن یہاں نہیں تھا، اور اُس کے بغیر کبھی کا کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں کپنی کے بانی لوگوں کی طرح ہر روز آتے اور بیٹھ کر قلب مومن کے نمبر پر کالز اور ای میل ایڈرلین پر میسج کرتے رہتے اور پھر تھک بار کر اٹھ جاتے۔ وہ ترکی میں تھا مگر کس حالت میں تھا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے۔ مگر وہ اب تنگ آ چکے تھے۔

”بغیر بے کے اتنے مہینوں سے بیٹھے ہیں اور مومن بھائی کو احساس تک نہیں ہے۔“ دادا وہ واقعی بڑی طرح بکڑا ہوا تھا۔

”میں نے تو اب پہلی فرصت میں کوئی بھی کپنی جو ان کر لینی ہے۔ جہاں سے بھی مجھے لیٹر آ گیا۔“ ٹینا نے جیسے اعلان کیا تھا۔

”اور میری تو قسمت خراب ہے، جہاں ایلانی کر رہا ہوں۔ آگے سے کوئی جواب ہی نہیں ملتا۔“ دادا نے جیسے انا انا دہرایا۔

اس سے پہلے کہ ٹینا کچھ کہتی، دروازہ کھول کر ایک شخص اندر آیا تھا اور پہلی نظر میں ٹینا اور دادا نے اُسے پہچان ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ قلب مومن تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے، بڑھی ہوئی شبیہ، بے ترتیب بالوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ وہ دونوں بے اختیار اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے تھے۔

”مومن بھائی۔۔۔۔۔ واٹ اسے سر پر اٹھ۔۔۔۔۔ آپ کب آئے؟“ دادا نے بے اختیار لپک کر اُس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

”ابھی ایک گھنٹہ پہلے۔۔۔۔۔ ایرپورٹ سے سیدھا آفس ہی آیا ہوں۔۔۔۔۔ یہ اسکرپٹ دینے۔۔۔۔۔ کل اس پر میٹنگ کروں گا تم لوگوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ فی الحال گھر جا رہا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے اُن کی میز پر ایک اسکرپٹ رکھتا ہواڑ کے بغیر اور اُن کی کوئی بات سے بغیر چلا گیا تھا۔

دادا نے میز پر پڑا ہوا وہ اسکرپٹ اٹھا یا۔ اُس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا۔

”الف۔۔۔۔۔ اسے اسٹوری اینڈ فٹم بانی قلب مومن۔“

”یہ ترکی میں بیٹھ کر یہ کرتے رہے ہیں؟“ اُس نے جیسے بے یقینی کے عالم میں اُس اسکرپٹ کے صفحے اُلٹتے ہوئے کہا تھا۔

”میرا سوال یہ ہے کہ اس اسکرپٹ کو پڑھے گا کون؟“ ٹینا نے اُس کی بات کے جواب میں اتنی ہی تنجیدگی سے کہا۔

”دونوں کو ہی پڑھنا ہوگا۔۔۔۔۔ اگر میٹنگ ہے تو ظاہر ہے پوچھیں گے وہ کہانی کے بارے میں۔“ دادا نے کہا۔

”تم پڑھ کر سنا دینا مجھے کہانی۔۔۔۔۔ میں اپنی رات اسے پڑھنے میں ضائع نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ میرا motivation level اس وقت بہت لو ہے ویسے ہی۔“ ٹینا نے اپنی چیزیں سیٹے ہوئے اپنے بیک میں ڈالیں، وہ آفس سے نکلنے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اُس کا اپارٹمنٹ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہاں شکور اُس کا استقبال کرنے کو نہیں تھا۔ شاید وہ چھٹی پر چلا گیا ہوگا۔ مومن نے اپنے پاس موجود کی کارڈ کا استعمال کرتے ہوئے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول لیا تھا۔ فوجی اُس کا اپارٹمنٹ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس نے باری باری لائٹس آن کرنا شروع کیں۔ اپارٹمنٹ صاف تھا یعنی شکور چھٹی پر نہیں گیا تھا اور اگر گیا بھی تھا تو اُسے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کچھ گھنٹوں کے لیے اُس گھر میں کھڑے کھڑے مومن کو اپنا آپ وہاں بے حد غیر لگایوں جیسے وہ کسی غلط جگہ آ گیا تھا ایک بار پھر سے۔۔۔۔۔ کعبہ سے بہت کدہ میں۔۔۔۔۔ اور اُس بہت کدہ میں بتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔۔۔۔۔ جگہ جگہ۔۔۔۔۔ اور ویسے ہی بہت سارے بہت اُس کے اندر بھی تھے جنہیں وہ تو ذکر آیا تھا تو اب باہر پڑے ”بہت“، ”بہت“ لگنے لگے تھے۔۔۔۔۔ خدا نہیں۔

اور اُس بہت کدہ کے بچوں سچ چلتے چلتے وہ ایک بار پھر اُس پینٹنگ کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ جس پر اہد تا الصراط المستقیم کی آیات جگمگا رہی تھیں۔

قلب مومن چلتے ہوئے اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جیسے اندھیرے سے روشنی میں آ کر کھڑا ہوا تھا۔

”میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا۔ وہ راستہ جس پر فلاح ہے نہ کہ وہ راستہ جس پر صرف کامیابی ہے۔“ اُس کے کانوں میں دادا کی آواز گونجی تھی اور اُس کی آنکھوں میں پانی اٹھ اٹھا۔ یہ پانی پتا نہیں دل کی کون سی نرم مٹی سے پھونکے لگا تھا۔ وہ تو رویا نہیں کرتا تھا۔ اُس کو بہانا تو قلب مومن کا شبیہ ہی نہیں تھا اور اظہارِ ندامت کرنا اُس کی ڈکٹری میں جرم تھا۔ پر اُس پینٹنگ کے سامنے کھڑا قلب مومن اپنا دل ٹٹول رہا تھا اور جیسے اُس

روح میں جان بھونکنے کی کوشش کر رہا تھا جو اُس کے اندر تھی مگر بے جان تھی۔

☆☆☆

”میں نہیں مانتی، یہ اسکرپٹ مومن نے لکھا ہے۔ وہ یہ لکھ ہی نہیں سکتا۔“

”یہ دوسرے دن اپنے آفس میں بیٹھے وہ اسکرپٹ کھولے بیٹھی رو رہی تھی اور ٹشو سے اپنی ناک اور آنکھیں رگڑتے ہوئے اُس نے سامنے بیٹھے داؤد سے کہا تھا۔ جو پچھلی رات یہ اسکرپٹ پڑھ آیا تھا اور اُس نے صبح سویرے سرخ آنکھوں کے ساتھ آفس میں بیٹھا کو وہ اسکرپٹ دیتے ہوئے کہا تھا۔

”You must read it.“ پاگل ہو گیا ہوں میں رات کو۔“ اُس نے بیٹھا سے کہا تھا اور بیٹھا کو لگا وہ مذاق کر رہا تھا یا شاید اُس اسکرپٹ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مگر دو گھنٹے بعد اب وہ اُس اسکرپٹ کو لیے کتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ انہوں نے ہی لکھا ہے مگر وہ اگر یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ انہوں نے لکھا ہے تو جھوٹ تو نہیں بولا ہوگا۔“ داؤد نے اُس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

”کس کی کہانی لکھی ہے مومن نے؟“ ایک ایک صفحے پر مجھے لگتا ہے جیسے یہ کسی کی کہانی ہے جیسے یہ سب کسی پر گزر رہا ہے۔“ بیٹھا اب ایک صفحے پر لکھی ہوئی لائنز پڑھ رہی تھی اور سر دھن رہی تھی۔

”مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ یہ سچی کہانی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی فلم سے انسپائرڈ ہو یا کسی ناول سے۔“ داؤد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”بالکل سچی بات ہے۔ بالکل انسپائرڈ ہے۔ مومن کتابیں بھی تو بہت پڑھتا ہے اور فلمز تو سارے زمانے کی دیکھتا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ اس سے چرائی ہے کہانی یا ملا کر بنائی ہے مگر جو بھی ہے، کمال ہے۔“

”شان دار ہے۔“

بیٹھا کہتے ہوئے اسکرپٹ کے صفحات کو پھر پلٹی جاری تھی۔ وہ بار بار اپنے پسندیدہ سبز اور لائٹ کوئلہ لائن کرتی اور پھر بلند آواز میں داؤد کو سنانے لگتی اور وہ جواباً اسے اگلی لائن سناتا۔ وہ اسکرپٹ پہلی ریڈنگ میں ہی انہیں جیسے رٹ گیا تھا۔

”جس میں پتا ہے عالیہ کا کردار کس کو کرنا چاہیے؟“ بیٹھا نے یک دم اُس سے کہا۔ اُس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ اُس نے داؤد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے سوال نہیں کیا تھا۔ اُس کی رائے کی تھی۔

”وہ نہیں کرے گی۔“ داؤد نے اُس ایکٹریس کا نام جیسے ٹیکس کی طرح بوجھا تھا۔ جو بیٹھا کے ذہن میں آئی تھی۔

”جس میں بھی اُسی کا خیال آیا تھا نا؟“ بیٹھا نے بھی اُس کے جواب کو بغیر سے جانا تھا۔ وہ ایکسا بیٹھ ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ مگر مومن بھائی نے فیملی کو کاسٹ کرنے کا کہا ہے اور فیملی ہی سے بات کرنی ہے ہمیں۔“ داؤد نے ڈوٹک انداز میں اس بار اُس کی ایکسا ٹیٹ ختم کی تھی۔

☆☆☆

”داوا جی بڑے ٹیک انسان، بڑی ٹیک روح تھے۔ مجھے تو پتا تھا ہمیشہ سے۔ ٹیکوں کو ٹیکوں کا پتا چل ہی جاتا ہے۔“

شکور نے ڈارڈار روتے ہوئے قلب مومن سے کہا تھا۔ وہ اُس سے عبدالحی کی تعزیت کر رہا تھا اور وہ بے حد خاموشی سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔

”میرے بارے میں کچھ کہا انہوں نے؟“ اپنی ناک رگڑتے ہوئے شکور کو یک دم خیال آیا۔ قلب مومن

نے سر اٹھا کر اُسے دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”صرف یہ کہ شکور سے کہہ دوں کہ وہ جھوٹ چھوڑ دے۔“ شکور کا منہ چند لمحوں کے لیے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ جیسے رونا ہی بھول گیا تھا۔

”یہ داوا جی نے میرے لیے اس دنیا سے جانے سے پہلے کہا؟“ شکور کو یقین نہیں آیا تھا۔

”تم نے اس بلڈنگ کے چوکیدار سے کہا کہ میں اپنا بیٹ باؤس چھوڑ کر بلیغ پر چلا گیا ہوں؟“ شکور کے آنسو بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہوئے تھے۔

”نہیں تو۔“ شکور کی سانس حلق میں اٹکی۔

”صبح سے پراپرٹی ڈیپارٹمنٹ کے فون بھگتا رہا ہوں میں، اور وہ سب تمہارے ریفرنس سے آرہے ہیں کیونکہ تمہارے ذمہ لگایا ہے میں نے یہ گھر بیچنا۔“ شکور قلب مومن کو یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ عبرانی زبان میں باتیں کر رہا ہو۔

”میرے بڑے دشمن ہیں مومن بھائی۔ آپ کی نظروں میں گرانا چاہتے ہیں مجھے۔“ شکور نے بالآخر کہا۔

”انہیں جا کر پھر بتا دو کہ تم میری نظروں میں جتنا پہلے گرے ہوئے ہو اس سے زیادہ نہیں گر سکتے۔“ قلب مومن نے ٹک کر کہا تھا۔

”ہاں، یہ بات ہوئی نا۔۔۔۔۔ سچی جا کر کہوں گا۔۔۔۔۔ آپ کو بس اسی طرح اعتبار ہونا چاہیے مجھ پر۔“ قلب مومن کی بات اُس کے سر کے اوپر سے گزری تھی یا اگر اُس کی سمجھ میں بھی آئی تھی تو اُس نے نا سچی کا مظاہرہ کیا تھا۔ قلب مومن نے اُس کے ساتھ مزید مغز ماری کا ارادہ ترک کر دیا۔

”تم کسی ماسٹر ایبراہیم کو جانتے ہو؟“ اُس نے شکور سے پوچھا تھا۔

”وہ جو داوا جی کے دوست تھے اور جن سے داوا جی ملنے گئے تھے؟“ اُس نے چونک کر پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ قلب مومن نے مختصر کہا۔

”ہاں جی، جانتا ہوں۔“

”مجھے ملتا ہے اُن سے۔ اُن کا پتا چاہیے۔“

شکور اُس کی بات پر سر کھجانے لگا۔

”پتا تو نہیں ہے میرے پاس۔ بس علاقے کا پتا ہے۔ آپ کو بتایا تھا نا کریم منگوا لی تھی میں نے اُن کے لیے۔۔۔۔۔ پر پورا ایڈریس نہیں دیا تھا انہوں نے۔“

وہ فون نکال کر جیسے ایڈریس ڈھونڈنے لگا تھا۔

”نہیں علاقے کا پتا ہے تو وہی بتا دو میں ڈھونڈ لوں گا انہیں۔“ قلب مومن بڑبڑایا تھا۔

”پراپ ملنا کیوں چاہتے ہیں اُن سے؟“ شکور کو یک دم تجسس ہوا۔

”ہے کوئی بیڑی جو پاؤں سے اُتارنا چاہتا ہوں۔“

اُس کا جملہ ایک بار پھر شکور کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”مومن بھائی صوفی ہو گئے ہیں۔“ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔

”لیکن بس چہرے پر نور نہیں آیا جیسا داوا جی کے چہرے پر ہوتا تھا۔“ اُس نے چور نظروں سے صوفی پر

بیٹھے ہوئے قلب مومن کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اُسے یک دم کچھ یاد آیا۔

”کوئی خالق صاحب آتے رہے تھے آکر۔“

فون نمبر دیا تھا مگر آپ کے فون پر ان کا آپ سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ ان کو داداجی کی وفات کا بھی پتا تھا۔ ”شکور نے قلب مومن کو اطلاع دی۔“
”مجھے اپنا کارڈ دے کر گئے تھے۔ تری جاتے رہتے تھے داداجی کے پاس۔ مجھے بتایا تھا انہوں نے ویسے تو کہہ رہے تھے، دوبارہ آئیں گے فون بھی کریں گے۔“
قلب مومن نے عدم دلچسپی سے اس کی بات سنی تھی۔ اسے فی الحال صرف ماسٹر ابراہیم سے ملنے میں دلچسپی تھی۔

☆☆☆

”شرم آئی چاہیے تم لوگوں کو یہ رول مجھے آخر کرتے ہوئے۔“ شیلی کا بس نہیں چلا تھا کہ وہ داؤد کے سر پر آفس میں بڑی کوئی چیز دے مارتی۔ وہ اپنا رول سننے آئی تھی اور اب غضب ناک تھی۔
”اس سے بہتر میں نے کسی بہر دکن کا کریکٹر مومن کی کسی فلم میں نہیں دیکھا۔“ نینا نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ شیلی نے اس کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”سات سالہ بچے کی ماں؟“ میں کہاں نہیں سات سالہ بچے کی ماں لگتی ہوں؟“ وہ دھماڑی تھی۔
”کتنی برتنیں اور شیڈز ہیں۔ شادی سے پہلے کا پورا ٹیکس سفر ہے۔“ اس بار داؤد نے کچھ بولنے کی کوشش کی تھی اور شیلی نے اسے بھی بات پوری کرنے نہیں دی۔

”چندہ منٹ میں ختم ہو جاتا ہے وہ سارا ٹیکس اور پھر پوری فلم میں، میں ایک بچہ لڑکا کر پھروں گی اور وہ بھی پہلے سات سال کا بچہ اس سے بھی بڑا۔“ فارگا ڈسک۔ مومن سے کو فلمیں بنانا چھوڑ دے اور لکھنا تو مکمل طور پر۔ رائٹر نہیں ہے وہ۔۔۔۔۔۔ یہ کیڑا کیوں ٹکس گیا ہے اس کے دماغ میں۔ جب تک وہ اس فیر سے نکل نہیں آتا۔ اسے کو وہ گھر بیٹھ جائے۔ وہ دھماڑے ہوئے اپنا بیک اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی اور چلتے چلتے اس نے ایک دم ٹوک کر داؤد سے کہا۔

”اور ہاں اسے یہ بھی بتادینا کہ میں نے احسن کی فلم سائن کر لی ہے۔ میرے پاس اب اس سال کسی اور فلم کے لیے ڈش نہیں ہیں۔ ہاں اگر اس نے منم بنانی ہو تو بتانا مجھے۔“ شیلی کہتے ہوئے اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی اور اس کے باہر جاتے ہی نینا کا چہرہ جھپکنے لگا تھا۔

”تھینک گاؤ۔ اس نے انکار کر دیا۔ یہ رول مومن سلطان کا ہے۔ وہی کرے گی میں بتا رہی ہوں تمہیں۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا یہ رول۔“ نینا نے داؤد کو پیچ کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

☆☆☆

”ہاں ہاں مجھے پتا ہے تو نے ایسے ہی کہا تھا۔۔۔۔۔۔ اب تجھے کیا پتا کتنی مصروف ہوں۔۔۔۔۔۔ مومن آئی ہوئی ہے تو اس کے لیے کھانا بنا رہی ہوں۔ تیری طرح وہ بھی ہر وقت فرمائشیں ہی کرتی رہتی ہے۔“ تجھے بتایا تو تھا نا میں نے ایوارڈ ملا ہے اسے۔۔۔۔۔۔ اسکر۔۔۔۔۔۔

کو ریڈ روم میں سے گزرتے ہوئے مومن کو لگا ثریا کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کچن میں تھی اور ملازم ابھی کچھ دیر پہلے باہر گیا تھا پھر وہ کچن میں کس سے باتیں کر رہی تھی۔ مومن عجیب تجسس کے عالم میں کچن میں گئی تھی اور وہ دروازے سے اندر نہیں جا سکی۔ ثریا اب تو سے پر روٹی ڈالتے ہوئے بس رہی تھی اور پھر ہنستے ہوئے اس نے کسی سے کہا تھا۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔ مجھے تھے ہم۔ وزیر اعظم سے بھی ملے۔ صدر سے بھی ملے۔ تیری بہن کی اتنی عزت ہوئی وہاں۔ تو ہوتا تو کتنی تصویریں بناتا۔۔۔۔۔۔ ہاں ہاں پتا ہے مجھے۔“

مومن دروازے میں ساکت کھڑی ثریا کو دیکھتی رہی۔ وہ اسی طرح باتیں کر رہی تھی اس کی موجودگی سے بے خبر۔
”اباں کس سے باتیں کر رہی ہیں آپ؟“ اس نے بالآخر ہمت کر کے جیسے انہیں مخاطب کیا تھا۔ ثریا نے چونک کر اسے دیکھا پھر عجیب براسرا انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
”کس سے باتیں کروں گی۔۔۔۔۔۔ تیرا بھائی جہانگیر ہے۔۔۔۔۔۔ پدیکھ۔“ اس نے اس طرح الماری کی طرف اشارہ کیا تھا جیسے وہ وہاں کھڑا تھا۔

مومن نے اضطراب کے عالم میں وہاں دیکھا تھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا یہ وہ وہاں دیکھتے ہوئے بھی جانتی تھی۔

”اماں! یہاں کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اور جہانگیر کیسے آ سکتا ہے؟“ اس نے ماں کو جیسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

”لو بھلا۔۔۔۔۔۔ اس کی بہن کا گھر ہے، اسے کون روکے گا۔۔۔۔۔۔ اس کا جب دل چاہتا ہے آ جاتا ہے۔ پھر میں اور وہ بیٹھ کے فلمیں دیکھتے ہیں۔“ ثریا نے اس کی بات اس طرح نظر انداز کرتے ہوئے اسے بتایا تھا جیسے وہ عقل سے پیدل تھی۔ جو وہ دیکھ پارہی تھی، وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

مومن سلطان کچھ بھی بول نہیں پارہی تھی۔ وہ بس دروازے کی چوکھٹ کے دونوں اطراف ہاتھ رکھے وہاں مہ سادھے کھڑی رہی تھی۔

☆☆☆

”ٹیز فرینڈ کی علامات ہیں۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے آپ کے بھائی کو دیکھ رہی ہیں۔ آپ نے پہلے کبھی ٹوکس کیوں نہیں کیا؟“

مومن سلطان نے سوچا تھا، اس کی زندگی میں بڑی خبریں اب نہیں رہیں۔۔۔۔۔۔ کچھ دن تو اچھے گزرتے۔ سائیکا ٹرسٹ ثریا کے ساتھ کیے جانے والے سیشن کے بعد اسے اپنی شخصیت بتا رہا تھا اور وہ دم بخود رہی تھی۔

”میں پاکستان میں رہی ہی نہیں اتنے مہینے۔“ اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے سائیکا ٹرسٹ کو بتایا تھا۔

”اسی لیے آپ کو اندازہ نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔ ریگولر میڈیکیشن کرنی پڑے گی اور سیشنز بھی۔۔۔۔۔۔ ابھی ابتدائی اسٹیج میں ہے یہ مرض۔۔۔۔۔۔ وقت پر علاج ہو جائے گا تو کنٹرول ہو جائے گا۔“ وہ اسے امید دل رہا تھا۔ مومن اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے صرف سر ہلاتی رہی تھی۔

”بائی داؤد! آپ کو اسکرینچر پر بہت بہت مبارک ہو۔۔۔۔۔۔ آپ مومن سلطان ہیں نا؟“ سائیکا ٹرسٹ نے کٹنگو کا اختتام کرتے ہوئے اس وقت اس سے کہا جب وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے آفس سے نکلنے والی تھی۔ اس نے ہشکل شکریہ ادا کیا۔ بعض لمحوں میں آپ بیچانے نہیں جانا چاہتے۔ سینگ لگا لینا چاہتے ہیں۔ ماسک بڑھا لینا چاہتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں آپ کو پچھانے جانے کے بعد یاد آتی ہیں۔

☆☆☆

وہ باہر نکلی تو ثریا اور سلطان دونوں باہر ویننگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”بہت پیسا آگیا ہے اس کے پاس۔۔۔۔۔۔ خواجواہ ڈاکٹروں کے پاس چکر لگواتی ہے۔“ ثریا نے نگلی سے اس سے کہا تھا۔ اس نے کچھ کچے بغیر ماں کا چہرہ دیکھا۔

”سب ٹھیک تو ہے نامومن؟“ سلطان نے جیسے ہنسی کے چہرے کو بڑھایا تھا۔

”ہاں اب اس ٹھیک ہے۔“ مومن نے مسکراتے ہوئے بابت کو یقین دلایا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا..... مجھے کیا ہوا؟ وہ دیکھتے سے بس باتیں ہی کیے جا رہا تھا وہ ڈاکٹر مجھ سے آئندہ نہیں جاؤں گی اس کے پاس..... میرا دماغ کھال گیا۔“

”ٹھیک ہے انداز میں کہتے ہوئے ٹھیک سے باہر چل پڑی تھی۔“

مومن نے مہنگی انداز میں فائل پکڑے اُن دونوں کے پیچھے چلی گئی تھی۔ سائیکل ٹرسٹ نے کہا تھا، اُسے شہر کے ساتھ وقت گزارنا تھا اگر وہ یہ چاہتی تھی کہ اُس کا مرض نہ بڑھے اور وقت مومن سلطان کہاں سے ڈھونڈ کر لائی۔ وہ یہ سوچ رہی تھی۔ زندگی نہیں بھی بادشاہ نہیں ہونے دیتی کہ سب کچھ ہی عطا کر دے زندگی ہمیں ہمیشہ فقیر ہی رکھتی ہے۔ کسی نہ کسی شے سے محروم..... کسی نہ کسی شے کے لیے ترستا ہوا۔

☆☆☆

”پہلی فلم اور پہلی فلم پر ہی سپورٹنگ رول پراسکر..... سفر اتنا آسان تھا کیا؟“ اُسے آفس میں بیٹھے آفس میں گئی ایل ای ڈی پر آنے والے مومن سلطان کے ایک ٹی وی انٹرویو پر قلب مومن رک گیا تھا۔ مومن سلطان کے آفس کے بارے میں وہ واپس آ کر جانتا تھا جہاں ٹی وی چینل پر پچھلے دو ہفتوں میں اس کے علاوہ کوئی اور خبر بار بار دہرائی نہیں جارہی تھی۔

”بالکل بھی نہیں..... ہر بڑی کامیابی کے پیچھے بہت بڑی قیمت ہوتی ہے۔“

اُس نے انٹرویو کو جواب دیا تھا۔ بہت کچھ بدلا ہوا تھا اُس کی شخصیت میں۔ یہ وہ نروس گھبراہٹ ہوئی اداکارہ نہیں تھی جو اس کے پاس آڈیشن کے لیے آئی تھی۔ وہ بین الاقوامی ایکسپوڈر جو اسے پچھلے ایک سال میں ملا تھا۔ اُس کے اٹھنے بیٹھنے بولنے ہر چیز میں جھلک رہا تھا۔ وہ بے حد پراعتاد اور گروڈ نظر آرہی تھی۔

”کامیابی ہر مشکل سفر کی محکم کر دیتی ہے۔ خاص طور پر اگر کامیابی آپ کو ملنے والی کامیابی جیسی ہو۔“

انٹرویو پر مسکراتے ہوئے بے حد مرحوب انداز میں اُس کے جواب پر تبصرہ کیا تھا۔

”کامیابی کی اپنی جھلک ہوتی ہے اور ہنسی بڑی کامیابی ہوتی ہے، اتنا زیادہ تھکا جاتا ہے۔“

اُس نے مومن سلطان کو کہتے سنا۔ قلب مومن جھپٹل بدلتے بدلتے ٹک گیا تھا۔ وہ اُس کی گفتگو سننا چاہتا تھا۔ وہ ایک عام اداکارہ کی گفتگو نہیں تھی جو کامیابی کے نشے میں چوراسکرین پر اپنے ڈنکے بھاننا چاہتی ہو۔

”اس مقام تک پہنچنے کے لیے کیا کیا سمجھوتے کیے؟“ سوال کرنے والی نے ایک دم موضوع بدل دیا تھا۔

”سمجھوتہ کام میں کبھی نہیں کیا۔ زندگی میں بہت سارے کیے۔“ رائل بلوسٹ میں اُس کے گلے میں آج بھی ایک دو پتہ تھا۔ قلب مومن کو ہاتھ نہیں کیا کیا یاد آیا تھا اور جو بھی یاد آیا تھا وہ شرم سار کرنے کے لیے کافی تھا۔

”سمجھوتے کو برا سمجھتی ہیں؟“ انٹرویو کرنے گرہا تھا۔

”کام کرنے کے لیے کیے جانے والے سمجھوتے کو بہت بُرا۔ زندگی گزارنے والے کیے جانے والے سمجھوتوں کو بالکل بھی نہیں۔“

وہ بہت مختصر اور مدلل بات کر رہی تھی۔ انٹرویو کرنے والی اُسی کی عمر کی لڑکی تھی مگر وہ مومن سلطان سے بے حد مرحوب اور خائف نظر آرہی تھی۔

قلب مومن جانتا تھا، وہ اُس کا انٹرنیشنل اسٹارڈم تھا جو بات کرنے والی کو بار بار سوچ کر بات کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”چلیں کچھ بلی پھلکی بات چیت کرتے ہیں ہم..... کچھ پرسل سوالات۔“ انٹرویو کرنے ایک دم موضوع

بار بار پھر اُسی انداز میں بدلاتھا جس میں وہ بدلنے کی عادی تھی۔ قلب مومن آفس کا دروازہ کھول کر اندر آنے لے داؤد کو کہیں دیکھ سکا۔ وہ اُس انٹرویو میں اتنا خوش تھا۔ داؤد خاموشی سے آکر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور وہ بیٹھا مومن کو پہلی بار اُس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

”کبھی کسی سے پیار کیا؟“ انٹرویو کرنے بے حد تجسس کے عالم میں اُس سے سوال کیا تھا۔

”ہاں۔“ بے حد بے تاثر انداز میں جواب آیا تھا۔

”ایسا..... کھویا؟“ انٹرویو کا تجسس اور بڑھا۔

”پارک بہت کچھ کھودیتی..... اس لیے کھودیا۔“ مومن سلطان نے اُسی انداز میں کہا تھا۔

”تھوہنے کی تکلیف ہے؟“

”اب نہیں ہے۔“

”زندگی میں کبھی کسی سے نفرت کی؟“ انٹرویو کا اگلا سوال تھا۔

”ہاں۔“ جواب سوچے بغیر آیا تھا، یوں جیسے وہ جانتی تھی۔ اُسے کس کا نام لینا تھا۔

”کس سے؟“

”ایک ڈائریکٹر تھا..... جس کے پاس میں فلم کا آڈیشن دے گئی تھی۔ اُس نے فلم میں نامناسب لباس پہننے کے لیے مجھے مجبور کیا اور میرے انکار پر فلم میں کام نہیں دیا۔ وہ فلم مل جاتی تو شاید میرے بھائی کی زندگی بچ جاتی۔ تو بس اُس وقت ضرورت نے ایسی نفرت کر دالی تھی اُس سے کہ آج بھی اگر کوئی نفرت کا نام لیتا ہے تو بڑی آنکھوں کے سامنے صرف اُس ڈائریکٹر کا چہرہ آتا ہے۔“

وہ پہلا سوال تھا جس کا جواب اُس نے مختصر نہیں دیا تھا۔ بے حد تحمل سے دیا تھا مگر اُس کی آنکھیں اس تحمل کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

قلب مومن کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ آج بھی اُس کی یادداشت کا حصہ ہے اور اُس انٹرویو میں اُس کا حوالہ اس طرح آئے گا۔ ندامت اس لیے بھی زیادہ ہوئی تھی کیونکہ اُس سے کچھ فاصلے پر داؤد بیٹھا ہوا تھا۔ بھی کبھار قسمت میں اس طرح کٹھنرے میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

”نام بتانا چاہیں گی آپ اُس کا؟“ انٹرویو کرنے چند جملے اُس ڈائریکٹر کی شان میں کہنے کے بعد جیسے مومن سلطان کو نام لینے پر اکسایا۔

”وہ اس قابل بھی نہیں کہ میں اُس کا نام لوں۔“ قلب مومن نے ریموٹ اٹھا کر ایل ای ڈی آف کر دی تھی۔

”تم نے مجھے بتایا نہیں تھا، اُس کا بھائی بنا تھا۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مومن نے داؤد سے کہا تھا۔

”بتاؤ تو بھی کیا ہوتا مومن بھائی..... آپ اُس وقت کسی کی نہیں سنتے تھے۔“

داؤد نے شاید زندگی میں پہلی بار مدھم آواز میں اُس کے رویے کی کمی بد صورتی کی نشان دہی کی تھی۔ مومن بپ کا جب پیشہ رہ گیا۔

”اگر تمہاری بات ہوتی ہو اُس سے تو معذرت کرتا میری طرف سے۔“ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے جو کہا تھا، اُس نے داؤد کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ شاید پہلی معذرت تھی جو مومن کسی سے کر رہا تھا۔

”میں اور بیٹا سوچ رہے ہیں مومن بھائی! کہ اگر مومن سے آپ کی فلم کے لیے بات کی جائے۔ فلیکی تو ہ انکار کر کے چلی گئی ہے اور ہم دونوں کا خیال ہے، یہ رول مومن کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔“ داؤد نے اُس کی بات کے جواب میں بڑی ہمت سے کہا تھا۔

”وہ اسکرپٹ تمہارے منہ پر مارے گی۔“ بے حد ٹھنڈے لب و لہجے میں مومن نے اُس سے کہا تھا۔

☆☆☆

”میں یہ اسکرپٹ تمہارے منہ پر مارنا نہیں چاہتی اس لیے اسے اٹھا لو۔“

داؤد نے اختیار قبضہ لگا کر ہنسا تھا۔ مومن کے چہرے کی سنجیدگی میں رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔ داؤد اُس کے پاس کچھ دیر پہلے پہنچا تھا اور ادھر ادھر کی گپ شپ کرنے کے بعد وہ بالآخر اسی موضوع پر آیا تھا اور اسکرپٹ مومن کے سامنے رکھتے ہوئے اُس نے بات کا آغاز کیا تھا اور جواب حسب توقع وہی آیا تھا۔ مومن نے اسکرپٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

”مومن نے یہی کہا تھا۔ تم یہی کرو گی۔“ داؤد نے بالآخر اُس سے کہا۔

”تمہاری جگہ مومن بیٹھا ہوتا تو یقیناً یہی کرتی۔ اُس کی ہمت بھی کیسے ہوئی مجھے یہ فلم آخر کرنے کی۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی بھی۔“ وہ بے اختیار خفا ہوئی تھی۔

”یہ آئیڈیا میرا تھا۔“ داؤد نے اعترافی انداز میں کہا۔

”اُٹھنی ٹھیک کہتی ہے۔ تمہاری عقل گھٹنوں اور رشتوں کے درمیان چلتی رہتی ہے۔“

داؤد نے اُس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دی تھی۔

”وہ بہت شرمندہ ہیں۔“ داؤد نے کہا۔ مومن طنز پر انداز میں ہنسی۔

”اوہ اچھا۔“ ضمیر جاگ گیا تمہارے مومن بھائی کا۔۔۔۔۔ بڑی جلدی جا گا ہے۔ اب مجھ سے یہ مت کہنا کہ وہ مجھ سے معذرت کرنا چاہتے ہیں۔“ داؤد زبان دانوں تلے دبا کر پیشاب پا۔

”تم صرف ایک باریہ اسکرپٹ پڑھ لو۔“ مومن نے اُس کی بات کاٹی۔

”میں بغیر پڑھے انکار کر رہی ہوں۔ اس پر قلب مومن کا نام لکھا ہے اور میں اس نام کو دیکھنا تک نہیں چاہتی۔“

”اس پر اللہ کا نام بھی ہے اور الف اسی کے نام کا پہلا حرف ہے۔“ داؤد نے بے اختیار کہا تھا۔ وہ چپ ہو گئی۔

”میں مومن کے ساتھ کبھی کام نہیں کروں گی۔“ اُس نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”مت کرو۔ صرف اسے پڑھ لو۔۔۔۔۔ پڑھنے میں تو کچھ نہیں جائے گا تمہارا۔“ داؤد نے بے ساختہ اُس سے کہا۔ وہ اس بار خاموش رہی۔

”میں چلتا ہوں۔۔۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ مومن خفا سے انداز میں ہنسی رہی۔

”وہ نہیں یاد ہے مومن! جہاں تکیر کے لیے جب ہم اُس رات پیسے جمع کر رہے تھے تو جو پیسے کم پڑے تھے۔ وہ میں آدھی رات کو کس کو چکا کر لایا تھا۔“ اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے مومن سے کہا۔ مومن اور داؤد ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مومن کو لگا جیسے کسی نے اُس کے پیٹ میں گھونسا مارا ہو۔

”مومن کا نام مت لیتا۔“ وہ جیسے کراہ کر داؤد سے بولی تھی۔

”تمہارا نام لے کر ان سے قرضہ لے کر نہیں آیا تھا۔ اپنا ہی نام لیا تھا۔ واپس دینا چاہتا تھا بعد میں انہیں۔ انہوں نے لیا ہی نہیں کہ یہ چھوٹی رقم ہے۔“ چلتا ہوں۔“

وہ دم آواز میں کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ کم صدم وہاں بیٹھی رہی تھی۔ زندگی میں قلب مومن وہ آخری آدمی بھی نہ ہوتا جس کا وہ بھی کوئی احسان اپنے سر پر رکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے اُس پر احسان کیا بھی نہیں تھا۔ مگر وہ مومن سلطان تھی۔ احساس سے عاری ہوئی تو بہت خوش رہتی۔

☆☆☆

”ہیلو۔۔۔۔۔ جی قلب مومن سے بات کر سکتا ہوں؟“

”جی۔ میں قلب مومن ہی ہوں۔“ دوسری طرف فون پر موجود مرد یک دم بے حد خوش ہوا تھا۔

”شکر ہے۔ آپ سے بات ہو گئی۔ میں اتنے مہینوں سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کے ایڈریسٹ پر بھی کئی چکر لگا آیا ہوں لیکن آپ سے رابطہ ہی نہیں ہو پایا۔“ اُس آدمی نے کہا تھا۔

قلب مومن کچھ الجھا تھا۔ اُس کے ذہن میں اُس آدمی کا نام گونجتا تھا جس کا ذکر شکور نے کیا تھا لیکن اُس نے فون پر اُس آدمی کا نام لینے کے بجائے اُس سے کہا۔

”سوری میں ابھی تک آپ کو پہچانا نہیں ہوں۔“

وہ اُس وقت افس سے نکل رہا تھا اور اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

دوسری طرف اُس آدمی نے بڑے اطمینان کے عالم میں کہا۔

”جی۔ آپ جانتے ہوں گے تو پہچانیں گے نا۔ مرحوم عبدالعلی صاحب بہت اچھی طرح جانتے تھے مجھے ویسے۔“ اُس نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

”آپ دادا کے دوست ہیں؟“ مومن کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا۔

”کاش ہوتا جی۔۔۔۔۔ ہم تو ان کے صرف مداح تھے۔ آپ بتائیں۔ آپ کے پاس کب حاضر ہو سکتا ہوں۔۔۔۔۔ ایک بڑا ضروری کام ہے مجھے۔ اور عبدالعلی صاحب کا حکم بھی۔“ اُس آدمی نے جواباً کہا تھا۔ قلب مومن الجھا تھا۔

”دادا نے آپ سے کہا تھا مجھ سے ملنے کو؟“

”ہاں جی۔“ اُس آدمی نے کہا اور پھر یک دم جیسے اُسے خیال آیا۔

”اپنا نام تو بتانا بھول ہی گیا میں۔ ویسے آپ کے ملازم کو اپنا کارڈ دے کر آیا تھا میں۔ بندے کو خالق علی کہتے ہیں۔“

اُس آدمی نے اپنا نام لیا اور ایک جھماکے ساتھ مومن کے ذہن میں وہ نام اور نمبر چمکا جو دادا نے اُسے دیا تھا۔ ان کے ساتھ ہونے والی آخری فون کال کے بعد۔

”آپ آجائیں۔ اس ویک اینڈ پر میں انتظار کروں گا آپ کا۔“ قلب مومن نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اُسے پتا چل گیا تھا خالق اُس سے کس چیز کے بارے میں بات کرنے آنا چاہتا تھا۔

”خیال تو رکھتا ہوں اس کا ہر وقت۔۔۔۔۔ اس کا خیال نہیں رکھوں گا تو کس کارکھوں گا۔ دو ہی لوگ تو ہوتے ہیں یہاں۔۔۔۔۔ تم تو اتنے مہینے نہیں ہی نہیں۔“

سلطان نے مومن سے اُس رات گھر کیا تھا۔ اُس نے باپ کو ثریا کی بیماری کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اسے راز میں رکھ کر ثریا کا علاج نہیں کر سکتی تھی۔ سلطان کو شیر ذہنی کی بیماری کی کتنی سمجھ آئی کتنی نہیں لیکن اُس نے مومن کے سامنے یہ قرار کر لیا تھا کہ ثریا اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی تھی اور بھی کھار جہاں تکیر سے بھی کرتی تھی مگر اُسے اس میں کبھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مومن نے جواباً اُسے اُس جہنی مرض کی تفصیلات بتانا شروع کر دی تھیں۔

”مہنگا علاج ہے؟“ اُس نے مومن کی ساری بات سن کر عجیب مگر مندا انداز میں اُس سے پوچھا تھا۔

”اب! مہنگے اور سستے کی پروا نہ کریں آپ۔۔۔۔۔ علاج مسئلہ نہیں ہے۔ خیال مسئلہ ہے۔“

اور اُس کے اس جملے کے جواب میں سلطان نے اُسے یاد دلایا تھا کہ اُس نے پچھلے ایک سال میں اس مگر میں کتنا کم وقت گزارا تھا۔

”جانتی ہوں! میری کوتاہی ہے۔ لیکن میں بے بس تھی۔ چاہتی بھی تو رہ نہیں سکتی تھی آپ لوگوں کے ساتھ پاکستان میں۔ کام چاہتا تھا کہیں کہاں لے کر جا رہا ہے مجھے۔ ابھی ایک ہفتہ میں دوبارہ جانا ہے اسی لیے آپ سے کہہ رہی ہوں۔ آپ خیال رکھیں اماں کا۔“ اُس نے بہت نام انداز میں سلطان کو وضاحت دی تھی۔

”تم سے شکایت نہیں کروں ہاں موند پر یہاں تنہائی بہت ہے۔“ سلطان نے کچھ شرمندہ سا ہو کر سر جھکا کر ہوئے اُس سے کہا تھا۔

”آرام بھی تو بہت ہے ابا۔“ اُس نے جیسے باپ کو یاد دلایا تھا۔

”ہاں۔ آرام ہے پر آرام تنہائی تو نہیں ملتا تا۔ اتنا لمبا دن ہوتا ہے اور وہ کتنا ہی نہیں۔ رات ہوتی ہے تو نیند نہیں آتی۔۔۔۔۔۔ وہ جو رانا گھر اور محلہ تھا وہاں یہ سب نہیں ہوتا تھا۔ دن گزرنے کا یہی نہیں چلتا تھا۔ آدھا وقت بانی کے انتظار میں گزار جاتا تھا۔ آدھا بجے کے پھر گلی محلے میں ہونے والے لڑائی جھگڑے دیکھنے میں۔۔۔۔۔۔ دن بھاگ جاتا تھا۔ رات ہوتی تھی تو نیند کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ کب آتی تھی کب نہیں۔۔۔۔۔۔ آگھ جب بھی کتنی تھی دن چڑھے ہی کھلتی تھی۔ چاہے جھگر کاٹتے ہوں، چاہے بجی نہ ہونے پر ہوا بند ہو۔۔۔۔۔۔ پر نیند آ جاتی تھی وہاں۔“

سلطان عجیب تاٹیک انداز میں بولتا جا رہا تھا۔ یوں جیسے اُسے کوئی الف لیلہ کی داستان سنا رہا ہو اور وہ سنی جا رہی تھی یوں جیسے وہ وہی اُس الف لیلہ سے واقف نہ رہی ہو۔

وہ اپنے ماں باپ کے لیے وہی کر سکتی تھی جو کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ جتنی آسائشیں دنیا سے اکٹھی کر کے اس بڑھاپے میں اُن کے گرد و حیر کر سکتی تھی ڈھیر کر سکتی تھی، مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ بڑھاپا آسائشیں ملنے پر نہیں چلتا۔ ضرورتیں پوری ہونے پر چلے اور وہ ضرورتیں وہ پوری کرنے کے قابل نہیں تھی۔

”وہاں جہانگیر اور شہارے جانے کے بعد بھی تنہائی نہیں ہوتی تھی۔ سارا دن محلے میں چلتے پھرتے رہتے تھے یا کوئی آتا جاتا رہتا تھا۔ یہاں چیزیں بہت ساری ہیں۔ آنے جانے والا کوئی نہیں۔ برندے تک نہیں آتے۔۔۔۔۔۔ وہاں یاد ہے۔ صحن میں بچی ہوتی روٹی کے دو ٹکڑے بھی پیچھتی تھی تمہاری اماں تو بتائیں کہاں کہاں سے کھانے کے لیے آ جاتے تھے برندے حالانکہ چھوٹا سا صحن تھا ہمارا۔۔۔۔۔۔ اتنا تک۔۔۔۔۔۔ پتا نہیں آسمان سے کیسے ڈھونڈتے ہوں گے برندے ہمارے صحن میں بڑے روٹی کے ٹکڑوں کو۔ تمہاری شادی ہو جائے تو میں اور شریا اُسی پرانے محلے میں کوئی گھر کرائے پر لے کر رہیں گے۔ وہاں خوش رہیں گے ہم۔ شریا بھی ٹھیک ہو جائے گی وہاں۔“ سلطان اُس سے کہہ رہا تھا۔

”کام تو یہاں بھی بہت سارے ہیں ابا۔“ موند بھٹک بولی تھی۔ اُس بارے ہوئے وکیل کی طرح جسے پتا تھا اُس کا کیس کتنا ضرور تھا۔

”یہاں کیا کام ہے؟۔۔۔۔۔۔ صفائی ملازم کرتا ہے۔ کھانا لگ جاتا ہے۔ ضرورت کا سامان ڈرائیور بڑے اسٹور سے لاتا ہے۔ جہاں چلتے چلتے میں اور تیری اماں ٹھک جاتے ہیں۔ سارا دن میں اور شریا بیٹھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے ہیں۔“ سلطان نے عجیب سی ہنسی کے ساتھ اُسے بتایا تھا۔ وہ ہنسی نہیں جیسے اُس کی بے چاری کی۔

”آپ ڈرائیور کے ساتھ جایا کریں باہر گھومنے پھرتے۔“ موند نے جیسے اُن کے لیے کام نکالا۔

”کہاں؟“ سلطان نے بے حد سادہ لہجہ میں کہا۔

”کہیں بھی اتنا بڑا شہر ہے۔“ موند نے کہا۔

”ہاں پر پورے شہر میں ہمارا تو کوئی نہیں ہے نا۔ جہانگیر تھا وہ چلا گیا۔ تم ہو۔۔۔۔۔۔ تو تم مصروف ہوتی ہو۔“

پوری دنیا میں اور ہمارا کون ہے؟“

وہ بحرمانہ انداز میں باپ کے سامنے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سلطان کی کسی بات کا اُس کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ اُن کے پاس نہیں بیٹھ سکتی تھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔۔۔۔۔۔ ورنہ بیٹھ جاتی۔

یہ اختیار اور انتخاب اللہ نے اُسے دیا ہی نہیں تھا۔ اُس کے پاس جو تھا پوری دنیا اُس پر رشک کرتے ہوئے مری جا رہی تھی۔ اُس کے پاس جو نہیں تھا، وہ اُسے مگر بھی حاصل نہیں کر پار ہی تھی۔ اُس کی زندگی کا مقصد کیا تھا موند کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی اس کامیابی کا مقصد کیا تھا۔ موند کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک ناکام اداکارہ تھی تو بھی اپنے ہر معاملے میں بے بس تھی وہ آج کامیاب اداکارہ تھی تو بھی اپنا کوئی مسئلہ حل نہیں کر پار ہی تھی۔

وہ سلطان کے پاس سے اُس رات اُٹھ کر آگئی تھی مگر سونے کی کوشش کے باوجود وہ سو نہیں پائی تھی۔ سلطان کی آواز اُس کے کانوں میں بار بار گونجتی تھی۔ دو کی گھنٹے اپنے بستر پر کوشش بدلتے ہوئے جیسے کوئی راستہ کوئی حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر جیسے بے حد بے بسی کے عالم میں وہ رات کے پچھلے ہر لمحے میں چائے بنانے چلی آئی تھی۔

چائے کا کپ لیے دلاؤن میں آ کر بیٹھی تھی اور اُس کی نظر اُس اسکرپٹ کے لفافے پر پڑی تھی جو دادور وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ اُس نے خالی الدینی کے عالم میں اُس لفافے کو اُٹھا لیا تھا جس پر الف اور قلب مومن کا نام لکھا ہوا تھا اور اسکرپٹ لفافے سے نکال لیا تھا۔

وہ ایک اور دنیا کی جہاں وہ کاغذ اُسے لے گئے تھے۔ عالیہ جہاں کی دنیا اور اُس دنیا کا مرکز۔۔۔۔۔۔ وہ سات سالہ دانیال۔۔۔۔۔۔ عالیہ جہاں کا محبوب عبداللہ اور عبداللہ کا باپ عبداللہادی۔ وہ کیا کہانی تھی جس کا ایک ایک کردار دل تھا اور بس دل ہی حکمرانی کر رہا تھا۔ موند سلطان نے اپنے اُس مختصر کیرئیر میں ایسا اسکرپٹ ایسے کر دار اور ایسے ڈائلاگز نہیں دیکھے تھے۔ ہر صفحے پر وہ اُجھتی اُسے لگتا، وہ عالیہ جہاں کو جانتی تھی وہ اُس کہانی میں خود بھی نہیں تھی مگر کہاں تھی یہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے بغیر وہ صفحے پر صفحے چلتی اُس اسکرپٹ کو انٹرول تک پڑھتی گئی تھی اور انٹرول کے سپین پر جس کردار کی انٹری ہوتی تھی اُس کردار نے موند کو ساکت کر دیا تھا کیونکہ وہ پہچان گئی تھی۔ وہ کہانی کس کی تھی اور اُسے کیوں وہ جانی پہچانی لگ رہی تھی وہ حسن جہاں کی کہانی تھی اور انٹرول میں اُس کہانی میں آنے والا کردار سلطان تھا جو اپنی محبوبہ عالیہ جہاں سے ملنے ترکی گیا تھا اور عالیہ نے دانیال سے کہا تھا کہ وہ سلطان کے بارے میں عبداللہ کو نہ بتائے۔

اس کہانی کے ہر کردار کا نام فرضی تھا صرف سلطان کے نام کے علاوہ۔ موند کے رو گئے کھڑے ہونے لگے تھے۔ کاپتے ہاتھوں سے اُس نے انٹرول کے بعد اُس کے پڑھنے کے لیے اسکرپٹ کا صفحہ اُٹھا لیا تھا وہاں اُسے ”جاری ہے“ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اُسے جو اسکرپٹ بھیجا گیا تھا وہ انٹرول تک تھا۔ وہ نہت کی طرح بیٹھی رہی۔ عالیہ جہاں یقیناً حسن جہاں تھی اور اگر وہ حسن جہاں تھی تو قلب مومن دانیال کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

”موند! تم اب تک جاگ رہی ہو؟“

وہ سلطان کی آواز پر چونکی تھی۔ وہ اُسے دیکھنے لاؤنچ میں آیا تھا اور اب اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ باپ کو دہ سادھے دیکھتی رہی۔ اُس کی نظروں میں یقیناً کوئی ایسا اثر تھا جس نے سلطان کو پریشان کیا تھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ وہ آگے بڑھا آیا۔

”ایک اسکرپٹ پڑھ رہی ہوں ابا۔“ موند کو بات کرتے ہوئے اپنی آواز کھوکھلی لگی۔

”اسکرپٹ؟“ سلطان اُلجھا تھا۔

”ایک اُردو فلم کا اسکرپٹ“ موند نے نظریں اُس پر جمائی ہوئی تھیں۔

”کیا ہے کہانی؟“ سلطان نے پوچھا، اُسے اُس کی نظریں بے چین کر رہی تھیں۔

”الف کئی جیسی کہانی ہے، انٹرول تک میں نے سانس روک کر پڑھا ہے۔ اب کو بھی سناتی ہوں۔“

مومن نے کہنا شروع کیا۔

”ہاں سناؤ..... حسن جہاں کو بھی بڑا یقین تھا میری رائے پڑا ہر اسکرپٹ سناتی تھی وہ مجھے۔ تم بھی سناؤ میں بتا دوں گا ہٹ ہے یا نہیں۔“ سلطان کہتے ہوئے دوسرے صوف پر اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

”ایک بچے کی کہانی ہے ابا! جس کی ماں ایک ایکٹر تھیں اور ڈانسر بھی اور اسے ترکی میں ایک فوٹیبول کے دوران ایک ترک ڈانسر اور خطاط سے پیار ہو جاتا ہے۔“ مومن نے کہی۔ اس نے سلطان کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

”وہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑ کر ترکی میں رہ جاتی ہے اور وہ ڈانسر جو خطاطوں کے ایک نامور گھرانے سے تھا۔ اپنے باپ کو ناراض کر کے اس سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن پھر وہ خطاطی نہیں کر پاتا اور ان دونوں کے درمیان محبت کی یہ داستان ایک شخص کی وجہ سے شاید ختم ہو جاتی ہے۔“

وہ کہتی رہی تھی۔ سلطان ٹپکیں چھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا جب وہ خاموش ہوئی۔ تو سلطان نے کہا۔

”کس شخص کی وجہ سے؟“ مومن نے اسکرپٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”سلطان کی وجہ سے۔“ لاؤنج میں ایسی خاموشی چھائی تھی جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر مومن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے کہا۔

”کیا تھے ابا! آپ حسن جہاں کی زندگی میں؟ میرے بھائی؟“ سلطان نے جواب دینے کے بجائے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔

”انسٹرول کے بعد کیا ہوا تھا اس اسکرپٹ میں؟“ ”میں نہیں جانتی..... میرے پاس صرف آدھا اسکرپٹ آیا ہے۔“

”منع کرد اس اسکرپٹ کو۔“ سلطان نے بے ساختہ کہا۔

”آپ گئے تھے تازہ کی حسن جہاں سے ملنے؟ کیا ہوا تھا ابا! کیا کیا تھا آپ نے؟“ مومن نے اس کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ سلطان اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”جس نے یہ اسکرپٹ لکھا ہے اس سے پوچھو۔ اسے سب علم ہوگا۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

”کس نے لکھا ہے یہ اسکرپٹ؟“ ”قلب مومن نے۔“ اس بار پہلے سے بھی ایسی خاموشی چھائی تھی لاؤنج میں پھر سلطان جیسے کراہے ہوئے بولا تھا۔

”اس کے بیٹے نے؟“ مومن نے سر ہلایا۔

”یہ وہی فلم ڈائریکٹر ہے جس کی فلم کے آڈیشن کے لیے بھیجا تھا آپ نے اور اس نے مجھے کام نہیں دیا۔“ مومن نے مدھم آواز میں کہا۔

”وہ فلم ڈائریکٹر؟ وہ بیٹا ہے حسن جہاں کا؟“ وہ خطاط نہیں بنا؟ یہاں پاکستان آ گیا؟“ سلطان نے بے یقینی کے عالم میں اس سے کہا۔ اس نے سر ہلادیا۔

”مجھے..... مجھے ملو اور اس سے۔“ سلطان نے بے اختیار کہا۔

”آپ کیا کریں گے اس سے مل کر؟“ مومن نے پوچھا۔

”میں انسٹرول کے بعد والے حصے میں اپنا ردول جانا چاہتا ہوں۔“ ”آپ اس کی فلم کے ولن ہیں ابا! یہ میں آپ کو پورا اسکرپٹ پڑھے بغیر بھی بتا سکتی ہوں۔“ ایک سایہ سلطان کے چہرے پر لہرایا تھا۔

”آپ کس لیے گئے تھے اس سے ملنے؟“ مومن نے دوبارہ پوچھا۔

”حسن جہاں کا نام لکھا ہے اس نے اسکرپٹ میں؟“ سلطان پتا نہیں اپنے کس اندازے کی تصدیق چاہتا تھا۔

”نہیں ابا..... ہر ایک کا نام بدلایا اس نے سوائے آپ کے..... آپ سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس لیے آپ کا نام نہیں بدلا اس نے..... حسن جہاں کی زندگی کے قصے سننے میں آپ سے کہ میں آنکھیں بند کر کے بھی پہچان سکتی ہوں کہ وہ عالیہ جہاں نہیں ہے حسن جہاں ہے اور عالیہ جہاں نے جس کے لیے بے وفائی کی، وہ سلطان تھا۔“

وہ اس کے چہلے پر ہنسنے لگا تھا اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

”بے وفائی کر لیتی سلطان کے لیے تو آج زندہ ہوتی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ابا! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ مومن نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”میں دوں گا بھی نہیں تم یہ فلم مت کرنا..... یہ فلم فلاپ ہوگی۔ تاریخ کی سب سے بڑی فلاپ۔“ وہ کہتے ہوئے وہاں ر کے بغیر چلا گیا تھا۔ مومن مضطرب اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی نے داؤد کو گہری نیند سے جگایا تھا۔ اس نے نیند میں ہی آنکھوں کو مسلتے ہوئے فون اٹھا کر نام دیکھتے ہوئے کال ریسپونڈ کی۔

”ہیلو مومن! رات کے تین بجے کال کر رہی ہو..... سب خیریت تو ہے۔“ داؤد نے فکر مند ہو کر کہا تھا۔

”میں یہی فلم کروں گی۔“ اسے مومن کی آواز سنائی دی۔

”کون سی فلم؟“ نیند میں داؤد فوری طور پر اس کی بات نہیں سمجھا۔

”الف۔“ اس بار داؤد کی نیند اڑن چھو ہو گئی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا..... تم نے الف کہا ہے نا؟“ داؤد بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں۔ الف ہی کہا ہے..... اگلے ایک دو دن میں قلب مومن کے ساتھ میری میٹنگ شیڈول کرو۔ میں دینی جانے سے پہلے اس سے مل کر فلم کا دوسرا حصہ سننا چاہتی ہوں۔“

اس نے کہا تھا اور داؤد کا جواب سننے بغیر فون رکھ دیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ فصل غم کا گوشوارہ رعبہ جمیل قیمت: -/300 روپے
- ☆ زرد موسم راحت جبین قیمت: -/1000 روپے
- ☆ حساب دل رہنے دو نیلہ عزیز قیمت: -/400 روپے

نگرانہ کاپی: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



خزاں کی رست میں گلاب لہجہ بن کے رکھنا کمال یہ ہے
ہوا کی زد پہ دیا جلانا، جلا کے رکھنا، کمال یہ ہے
ذرا سی لغزش پر توڑ دیتے ہیں سب تعلق تعلق والے
سولے دیسوں سے بھی تعلق بن کے رکھنا، کمال یہ ہے
کسی کو دنیا یہ مشورہ کہ وہ دکھ بھرنے کا بھول جائے
اور ایسے لمحے میں اپنے آنسو چھپا کے رکھنا، کمال یہ ہے

خیال اپنا، مزاج اپنا، پسند اپنی، کمال کیا ہے
جو بار چاہے، وہ حال اپنا بن کے رکھنا، کمال یہ ہے

کسی کی رہ سے خدا کی خاطر، اُٹھ کے کھٹے ہنر کے پتھر
پھر اس کے آنکھ لگا دیا، اپنی چھپا کے رکھنا، کمال یہ ہے

مبارک صدیقی

حقیقتوں کو فنا نہ بنا کے بھول گیا
میں تیرے عشق کی ہر چوٹ کھا کے بھول گیا

ذرا یہ دوری احساسِ حُسن و عشق تو دیکھ
کہ میں تجھے ترے نزدیک آ کے بھول گیا

اب اس سے بڑھ کے بھی دار فکلی دل کیا ہو
کہ تجھ کو زیست کا حاصل بن کے بھول گیا

گمان جس پہ رہا منزلوں کا اک مدت
وہ رہ گزار بھی منزل پہ آ کے بھول گیا

اب ایسی حیرت و دار فکلی کو کیا کہیے
دعا کو اتھا اُٹھائے اُٹھ کے بھول گیا

دل و مگر ہیں کہ گرمی سے پگھلے جاتے ہیں
کوئی جس سراجِ تمنا جلا کے بھول گیا

جیل الدین مآلی

دو پل

کون سے دن لگتے ہیں

اس سے ملنے میں، اسے دل میں بسا لینے میں

اس کے ہونے میں اسے اپنا بنا لینے میں

بس یہی پل

جو گزر رہا ہے گزر جاتا ہے

اور یہ دل کی سترت سے سنور جاتا ہے

کون سے دن لگتے ہیں

اس کے جانے میں، میرے دل سے چلے

جانے میں

کچھ نہ کہتے ہیں، کوئی بات نہ بتلانے میں

بس یہی پل

جو گزر رہا ہے گزر جاتا ہے

اور یہ دل ہے کہ دھشت سے بکھر جاتا ہے

فیاض وید

خوش گمانی،

سفر میں شام سے پہلے

اگر بے آس ہو جاؤ

تو اک پل کو

مجھے تم یاد کر لینا

سفرِ آغازِ کر لینا

تمہیں ہر موڑ پر دستہ

ملے گا صاف اور روشن

دھنک کے رنگ ساتوں

جب تمہارے گرد آکر

اک نیا ہال بنائیں گے

حسین کچھ مت لیاں

پروں کو غم لیں اپنے

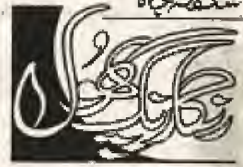
تمہارے ساتھ کر دیں گی

سفر کی سختیوں سے وہ تمہیں محفوظ کر دیں گی

بس اک پل کو

مجھے تم یاد کر لینا

سب اس گل



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
”جو لوگ مر گئے، ان کو بُرا نہ کہو کیونکہ انہوں
نے جیسے عمل کیے، ویسا بدلہ پائیں گے“

سُہری زندگی کے لیے سُہری باتیں،

- ۱۔ رابطہ اتنے ہی رکھو جتنے تکلیف دیں۔
- ۲۔ جب تم جان جاؤ کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تو پھر
اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا کہ کون تمہارے
ملاقات ہے۔
- ۳۔ جو شخص نصیحت مان لے، وہ بعض اوقات نصیحت
کرنے والے سے بھی بُرا ہوتا ہے۔
- ۴۔ وہ شخص کامیاب نہیں ہو پاتا، جس میں ناکامی کا
خوف کامیابی کی چابک سے زیادہ ہو۔
- ۵۔ بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بات کا اونچا
ہونا ضروری نہیں بلکہ بات کا سچا ہونا ضروری
ہے۔

مدیرِ نذیر۔ 26 جنوری

جہنم کی آگ اور ایک آنسو،

خوشحال خان خٹک نے کہا۔
”جہنم کی آگ دہی آنسو بجھا سکتے ہیں جو وقتِ عمر
ایک مومن کی آنکھوں سے ٹپکیں“
اقصی نامہ۔ کراچی

بین الاقوامی کہناوتیں،

- ۱۔ دُعا کا کمال نہیں، بلکہ دُعا کو اُٹھانا کمال ہے۔
(چینی کہادت)

- ۱۔ ہر نیک آدمی خدا کا کام دیتی ہے۔
(جرمن کہادت)
- ۲۔ عمدہ دوا اکثر کڑوی ہوتی ہے۔
(مابائی کہادت)
- ۳۔ جب میرے پاس پیسہ تھا تو ہر کوئی مجھے مچھائی
کہتا تھا۔
(پولش کہادت)
- ۴۔ خیرات دیا کرو تا کہ تمہارے بچے بھی بھیک
نہ مانگیں۔
(جرمن کہادت)

تمرو، اقرا۔ کراچی

ایکسوس،

ایک عورت سے اس کی سہیلی نے پوچھا۔
”کیا تمہارا نوموود بچہ اپنے باپ پر گیا ہے؟“
”خدا کا شکر ہے کہ نہیں۔ درجہ میرے شوہر لوٹنے
سے پاگل ہو گئے۔“ عورت نے شوہر سے
جواب دیا۔

تیسری،

وہ لڑکی ہی ہے۔ جو پادری میں مانتے سے پہلے
آئی شہدو، سکرا، آئی لا منز، لب گوز، لب پینل
فیس پاؤڈر، گیکٹر، پش آن، کابیل، نیل پالش، باڈی
اپرے پر قوم لگانا اور اچھا لباس پہننے کے بعد بھی
کہے۔
”ارے بار ابلدی میں کچھ نہیں کیا“
ادبیر لڑکا ہے جو پادری میں جالے سے پہلے اپنے
دوست سے پوچھے۔
”اوتے تو نہ پا کر آئے گا؟“

دوست جواب دے ”اے پاگل ہے کیا!
اپنا دلیر توڑی ہے؟“
صدف عمران کے ڈی اے سمرانچی

آئینہ،

سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے لڑکی نے اپنے
بولے فریڈ سے پوچھا۔
”ماٹو اتم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟“
لڑکے نے جواب دیا ”میں تمہارے لیے کچھ بھی
کر سکتا ہوں“
”ہائیں۔“ سچ۔ کیا میرے لیے آسمان سے چاند

لا سکتے ہو؟“ لڑکی نے پرجوش ہو کر کہا۔
”ایک منٹ رکو خدا۔“ کہہ کر لڑکا غائب ہو گیا۔
کافی دیر انتظار کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے
ہاتھ میں کوئی چیز تھی، جو اس نے لڑکی کے ہاتھوں میں
پکڑا دی۔

لڑکی نے دیکھا تو وہ آئینہ تھا۔ جب اس کی نظر
اپنے عکس پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
اس نے خوش ہو کر لڑکے کو مخاطب کیا۔
”کیا تم مجھے یاد سمجھتے ہو؟“
”نہیں! میں تمہیں پہچانتا ہی نہیں“ لڑکا نے جواب دیا
”کہا نہ مانگتی ہو، بھی آئیے میں اچھی شکل دیکھی ہے؟“
لڑکے نے بے اعتنائی سے ہونہار ہو کر جواب دیا۔
صافر بھی۔ کراچی

بھروسہ،

سب سے اچھی زندگی وہ بسر کرتے ہیں، جو اپنی
مزدورت بوری کرنے کے لیے اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ
نہیں کرتے۔
بہیم بر حسین۔ ڈنگر

کامیابی،

ایک دین آؤ سیاست دان سے سوال کیا گیا۔
”آپ نے اپنی سیاسی زندگی کے نتیجہ و افراد
سے کیا سیکھا؟“

سیاست دان نے جواب دیا ”اہمیت اس بات
کی نہیں کہ آپ ہارے یا جیتے، سوال یہ کہ آپ الزامات
لگنے میں کس حد تک کامیاب رہے؟“
مسرت الطاف احمد۔ کراچی

مسئلہ،

فلن یہ ایک عورت تھی۔
”ایک نوجوان لڑکی کے راستے میرے کمرے میں داخل
ہونے کی کوشش کر رہا ہے“
”محترمہ مزید پولیس اسٹیشن کا نہیں، فائر بریگیڈ کا
غیر ہے؟“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”مجھے معلوم ہے کہ یہ فائر بریگیڈ کا غیر ہے۔ اسی
لیے تو میں نے فون کیا ہے۔“
عورت بولی ”دراصل اس نوجوان کی میسر می
چھوٹی ہے۔ کھڑکی تک نہیں پہنچ رہی۔ اسے بڑی
میسر می کی ضرورت ہے۔“
آسیہ باوید۔ کراچی

نمک پاپے،

”خیر وہ آئینہ ہے، جس میں دیکھنے والا اپنے سوا
ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔“
(سولفٹ)
”قتلِ مزد لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بے وقوف
اب کیلئے والا ہے۔“

(برائنٹ)
”اے محلِ ہنسا، حیرتزدی گفتگو کرنا اور غلط جگہ
بیٹھنا بے وقوفی ہے۔“
(یوراشٹ)
”ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔“
(ویٹرلٹ)

”جتنی مشورے محض قیمت وصول کرنے کے لیے
ہوتے ہیں اور صحیح مشورے ناراہی مول لینے کے
لیے ہیں۔“
(جارج سنٹیانا)
”مفسد ہلال۔ کراچی“

عقہ کے تو ضرور چلاؤں، شرم میں نہیں،
 ایک مالیہ تحقیق میں بتا گیا ہے کہ وہ افراد جو
 اپنے ساتھ ہمارے مالی نا انصافیوں اور دوسرے اذداد
 کے غلط رویوں پر غصہ رہتے ہیں۔ ان میں دل کے
 دوسرے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ سوئیڈن میں کی جانے
 والی اس تحقیق میں کہا گیا ہے کہ جو افراد اپنی زندگی میں
 ہر بات پر غصہ کرتے ہیں اور غصے کا اظہار نہیں کرتے۔
 ان کی شریاؤں پر دیا اور دل کے دوسرے کا خطرہ بڑھ
 جاتا ہے۔ اس لیے ماہرین کا مشورہ ہے کہ اگر غصہ کی
 قوماں کو نکال لینا چاہیے۔ درحقیقت پر غلاب اثرات
 پڑھتے ہیں۔

سستا طریقہ،
 ایک مہینہ نیو یارک میں ایک بینک کا دفتر دیکھا

اور کہا۔
 ”مجھے پانچ ہزار ڈالر کا قرض چاہیے۔ مجھے اپنے نام
 کے سہیلے میں یورپی ملکوں کے دورے پر جانا ہے۔
 اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“
 بینک والوں نے کہا: ”کوئی مسئلہ نہیں اگر آپ
 کے پاس رقم ٹوائے کے لیے مناسب ضمانتیں ہیں تو
 ہمیں قرض دینے میں کوئی حرج نہیں۔“
 میں نے اپنی دو لڑاکوں کی یاہیاں بینک والوں
 کو تھما دیں۔ بینک نے متعلقہ سیکشنوں والوں کو بھیجا
 کہ جاکر ادارہ اس کے کاغذات کی تصدیق کریں۔
 سب کچھ درست ہونے پر میں نے ڈھائی لاکھ
 ڈالر مالیت کی کاروباری ضمانت کے بدلے میں پانچ
 ہزار ڈالر کا قرض حاصل کر لیا۔
 میں نے کہا کہ کوئی بلڈنگ کے نیچے بنی محفوظ پارکنگ
 لائٹ میں حفاظت کے ساتھ بند کر دیا۔ اودان کے
 رخصت ہونے کے بعد بینک کا عملہ زمین کی اس
 حالت پر گھنٹوں ہنستا رہا۔

دو ہفتے بعد زمین خریدنے پر سیدھا بینک
 جا پہنچا جہاں ان سے پانچ ہزار ڈالر کے ساتھ ہونٹ
 ڈالر انٹرنیٹ ادا کرنے کو کہا گیا۔ ان سیکشن سے
 ایک دہہ دار آدمی آکر زمین کے ساتھ پارکنگ لائٹ

کی طرف چل دیا تاکہ انہیں گاڑی واپس کر سکے۔
 راستے میں اس نے زمین سے سوال کیا۔
 ”میں نے آپ کے بدلے کے بعد آپ کا سارا
 بینک گراؤ بیچ کر کیا تھا۔ آپ کی لاکھوں کروڑوں
 کی ڈائریکشن سے تو بتا چکا ہوں کہ آپ کو اس چھوٹے
 سے خرچے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی
 میں اپنی ذاتی معلومات کے لیے آپ سے پوچھنا
 چاہتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“
 میں نے منگوائے ہوئے جواب دیا۔
 ”اس اتنے بڑے نیو یارک شہر میں مجھے کوئی ایسی
 جگہ یاد نہیں۔ سو ڈالر کے کوئی میری ہتھی کار
 کی حفاظت کر سکے؟“

عامہ ندیم۔ کراچی

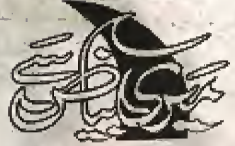
کیا دیکھا،
 ایک آدمی اودان کا بیٹا بینک پر گئے تو انہیں
 وہاں رات ہو گئی۔ دو دنوں سے کھانا کھانے کے بعد
 اپنے ایک ایک شیعہ لگائے اور سوئے۔ آدھی رات
 کو باپ نے بیٹے کو جگا دیا اور کہا۔
 ”آسمان کو دیکھو بیٹا۔“

بیٹا کچھ حیران ہو کر ٹوٹا رہی دیکھ رہا ہوں۔
 باپ نے پوچھا: ”کیا دیکھا؟“
 بیٹے نے جواب دیا: ”میں نے لاکھوں کروڑوں۔“
 ستارے دیکھے۔

باپ نے پھر پوچھا: ”اس سے کیا بتا چکا ہے؟“
 بیٹے نے کہا: ”اس سے بتا چکا ہے کہ ہماری کائنات
 بہت وسیع اور ہمارا نظام کسی بہت بڑے
 ستارے آسمان کی نزہت میں اندھین رات کو
 راستے بھی دکھاتے ہیں۔“
 باپ نے بیٹے کے گال پر زوردار چپکڑ مارا
 اور کہا۔

”اس سے بتا چکا ہے کہ ہمارے نیچے جیو جیو ہو
 گئے ہیں۔“
 حمیرا الویشیں۔ منڈی بہاؤ الدین

نکالا پچھلا



نارہ بھیجی۔ ہونہ

اثر ہوا ترے ضبط کا پھر اس طرح سے کہ ہم
 بدایوں کے تسلسل میں آس کھو بیٹھے
 سنیں صفت۔ گلستان حور
 جن کے لیے چراغ مہر شام جل گئے
 دُنیا کے ساتھ وہ بھی نکلیں بدل گئے

دل اکھ۔ کراچی
 یہ ساری عمر کسی آشتی میں لایں گال کردی
 اسی کو یاد رکھا ہے جسے دل سے جھٹا تھا
 یثقل خان۔ بشارت

چلنے کا حوصلہ نہیں، دیکنا بھال کر دیا
 عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نہ حال کر دیا
 مملکت فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
 اس نے تو ایک بات کی اہم نے کمال کر دیا

اقصی نامہ۔ گلستان حور
 اندھیرے روز تھا قید میں رہے رہتے ہیں
 میں ان میں گھر کے آباؤں کی بات کرتی ہوں
 غم، آقا۔ کراچی

تلمیذ شمس خراسانی اس کے ساتھ ہونے تک
 خیال دہشتہ آیا۔ سخاوت ہونے تک
 ملا تھا اچھے رہتے تھے صبح کی مانند
 بچھڑ گیا تھا مسافر سے رات ہونے تک

صائب مہتمم۔ ایٹ آباد
 دہانے مجھ سے مراحم تو شیک ہیں لیکن
 بختیولہیں کسی کو راز دل نہ کر
 فرمیں میناء اللہ۔ کوٹ اڈو
 روز مل کر بھی کم نہیں ہوتا
 دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے
 کس سے پر اسے تلاش کر دوں
 شخص اک کھو گیا ہے برسوں سے

آرٹیفی۔ سکھ

کہاں سے سیکھ لی تم نے بھی یہ اداکاری
 تمہاری آنکھوں میں آنسو عجیب گھٹے ہیں
 غم۔ لاہور
 وہ ساری خیریاں جو اس نے چاہیں اٹھا کے بھولی میں اپنی رکھ لیں
 ہلکے سے حق میں غم آئے، حجاز آئے، اصول آئے

عذیب اقبال۔ اوکاڑہ
 جو سو روزیاں کی فکر کرے
 وہ عشق نہیں، مزدوری ہے
 میں تجھ کو کتنا چاہتا ہوں
 یہ کہنا، غصہ ضروری ہے

حراساد۔ میان چنوں
 دیوانہ پہ خودی میں بڑی بات کہہ گیا
 اک حشر کی گھڑی کو ملاقات کہہ گیا
 تنیم احمد۔ کراچی

دعایہ کی ہی نہیں تو میرا عقیدہ ہو
 ہول کی طرح مگر سانس بھر بیٹھ ہو
 کبھی کبھی تو دل مضطرب یہ چاہتا ہے
 کہ چاند رات ہو اور سامنے سمندر ہو
 نازیدہ صدیق۔ کراچی

میری ضرورتوں سے زیادہ گرم نہ کر
 ایسا سلوک کر جو میرے حسبِ حال ہو
 سہیں حسن۔ دہلی
 اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا
 یہ بات طے ہوئی لیکن سوال دند کا ہے
 یہ دل، یہ آجری ہوئی چشمِ غم، یہ تنہائی
 ہمارے پاس تو جو بھی ہے، کمال دند کا ہے





باتیں انعم فیاضی سے

شاہین رشید

نکاح ہوا اور وہ بھی مکہ معظمہ میں۔ چند ماہ قبل رخصتی ہوئی ہے۔

7- ”میاں صاحب کیا کرتے ہیں؟“

جی..... اسد نے لندن سے ایم بی اے کیا اور اب ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔

8- ”لو! اور جی میرج؟“

”لو! کو اور جی کیا۔ سب کی پسند سے شادی کی۔“

9- ”محبت کے بارے میں آپ کے خیالات؟“

”ایک خوب صورت جذبہ ہے۔ میں نے جس سے محبت کی، اسے ہی اپنا شریک سفر بنایا۔“

10- ”شوہر میں آمد؟“

”2011ء میں ایک شو ہوا تھا ”ہیرہ بننے کی ترنگ“ میں حصہ لیا۔ دوسری پوزیشن آئی تو ڈرامہ کی

1- اصلی نام؟

”اصلی نام تو انعم فیاض ہے۔ مگر شادی کے بعد انعم اسد کہلائی ہوں۔“

2- ”پیار کا نام؟“

”زیادہ تر انعم ہی کہتے ہیں۔ بہت پیار آ جاتے تو ”انو“ کہتے ہیں۔“

3- ”تاریخ پیدائش/شہر؟“

”17 جولائی 1992ء / کراچی۔“

4- ”بہن بھائی..... آپ کا گھر؟“

”ہم دو بہنیں اور تین بھائی ہیں اور میں پہلے نمبر کی اولاد ہوں اپنے والدین کی۔“

5- ”تعلیمی قابلیت؟“

”مگر بیجوٹ۔“

6- ”شادی؟“

”جی الحمد للہ شادی 2016ء میں ہوئی۔ یعنی آفر آگئی۔“

11- ”پہلا ڈراما؟“

”احمد حبیب کی بیٹیاں“ اس کے بعد تو پھر سلسلہ چل نکلا۔“

12- ”گھر میں کسی اور کو شوق ہوا؟“

”فی الحال تو نہیں..... ابھی تو میں ہی اس فیلڈ میں ہوں۔“

13- ”شوہر میں آمد سے گھر والوں کا رد عمل؟“

”جی..... پاپائے شروع میں تھوڑا اعتراض کیا پھر وہ میرے ساتھ جانے لگے، تب انہیں اطمینان ہوا اور بس پھر کچھ نہیں کہا۔“

14- ”گھر میں سب سے زیادہ سپورٹ کس نے کیا؟“

”ماما نے۔ انہیں میرا کام کرنا پسند تھا۔“

15- ”آپ کی ذیلی روئین؟“

”جی..... صبح اٹھنا۔ میاں صاحب کو آفس بھیجنا اور پھر شوٹ پر نکل جاتی ہوں۔ اسی طرح کی روئین ہوتی ہے۔“

16- ”کس کو دیکھے بنا چھ نہیں ہوتی؟“

”جیب شادی نہیں ہوئی تھی ماما کو دیکھے بغیر صبح نہیں ہوتی تھی۔ اب میاں صاحب کو۔“

17- ”رشتوں میں سب سے پیارا رشتہ؟“

”جو بلڈ ریلیشن ہیں وہ سب پیارے ہیں مگر والدین کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ماما کو بہت مس کرتی ہوں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

18- ”پہلی کمائی/تاثرات؟“

”ایک کرشل کیا تھا۔ بہت خوشی ہوئی تھی اپنی کمائی کی۔“

19- ”کہاں خرچ کی؟“

”گھر میں..... چونکہ بڑی ہوں تو سب کے لیے شاپنگ کی اور پھر سب کو ڈنر پر لے گئی۔“

20- ”آپ کی عام زندگی شوہر سے کتنی مختلف ہے؟“

”میں ایک لڑکی ہی ہوں۔ شوہر کی وجہ سے مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔“

21- ”مشکل کام کیا ہے۔ ماڈلنگ یا اداکاری؟“

”ہر کام کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔ دل سے کام کرو تو سب آسان ہے۔“

22- ”فیوچر پلاننگ؟“

”جی..... ابھی تو سارا فوکس اداکاری پر ہے مگر فیوچر میں پروڈیوسر بننے کا ارادہ ہے۔“

23- ”کیا بننا چاہتی تھیں؟“

”سزہائی کے دوران ہی اس فیلڈ میں آ گئی تو اس کو پروفیشن بنالیا اور نہ شاید بڑے دن ہوئی۔“

24- ”کیمرے سے دوستی؟“

”اب بہت ابھی ہو گئی۔ شروع شروع میں بھی بہت پر اعتمادگی میں۔“

25- ”مغصہ جلدی آتا ہے؟“

”نہیں..... اللہ کا شکر ہے، میں ایک خوش مزاج، منسا اور انہیں کھڑکی ہوں۔“

26- ”کم گویا ہوتی؟“

”بہت باتوتی ہوں۔ کسی کو بور نہیں ہونے دیتی۔“

27- ”خجرا کوئی لمحہ؟“

”جب لوگ تعریف کرتے ہیں۔ گھر والے اور خاندان والے میرے کام کو سراہتے ہیں۔“

28- ”فلموں سے آفرز ہوتی ہیں؟“

”جی بہت آئیں۔ مگر ابھی انتظار ہے بہت ہی اچھے رول کا۔ اپنے ناظرین کو مایوس نہیں کرنا چاہتی چھوٹا رول کر کے۔“

29- ”اگر مارنگ شو کی میزبانی کرنا پڑے تو؟“

”ارے واہ جی۔ ضرور کروں گی۔ بہت انجوائے کروں گی۔“

30- ”پسندیدہ پروفیشن؟“

”مکی فیلڈ..... پھر بزنس پھر ٹیچنگ۔ تینوں پروفیشن مجھے بہت پسند ہیں۔“

31- ”اداس ہو جاتی ہوں؟“

”جب ماما کے ساتھ گزرا وقت یاد آتا ہے تو.....“

32- ”کیا لوگوں میں جلدی گھل مل جاتی

ہیں؟“

”عموماً..... جلدی گھل مل جاتی ہوں۔“

33- ”ایک بیماری جس سے خوف زدہ رہتی

ہیں؟“

”وہ تو ہر بیماری بری ہوتی ہے مگر کینسر سے

بہت ڈر لگتا ہے کیونکہ والدہ کو بھی کینسر ہو گیا تھا اور بہا

اس وقت چلا جب وہ پھیل چکا تھا۔“

34- ”عشق و محبت میں فرق؟“

”عشق خدا سے ہوتا ہے اور محبت انسان سے

ہوتی ہے۔“

35- ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“

”جب کوئی اپنا ٹیچر تھے یا جب ہم کرائس

میں ہوتے ہیں۔ ماما کے جانے کے بعد تو زندگی بہت

بری لگنے لگی تھی۔“

37- ”زندگی سے کیا سیکھا؟“

”بہت بے اعتبار ہے یہ زندگی۔“

38- ”اپنے آپ کو کب ساتویں آسمان پر

دیکھتی ہیں؟“

”کبھی نہیں۔ میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔

اللہ مجھے غرور سے بچائے، آمین۔“

39- ”شوہر نے ذاتی زندگی کو متاثر کیا؟“

”بالکل بھی نہیں۔ میں اپنی ذمہ داریوں کو بہ

خوبی نبھانا جانتی ہوں۔“

40- ”آپ کے ڈراموں کی تعداد؟“

”کافی ہیں۔ جو یاد ہیں، وہ بتا دیتی ہوں۔ میں

ہاری پیا، بند کھڑکیاں، خدا میرا بھی ہے، زرد موسم،

میری ماں، ذرا سی بھول، دل تیرے نام، رخصتی۔

تھی یا ہے؟“

42- ”کوئی کردار جو کر کے چکھتا نہیں؟“

”نہیں۔ ایسا تو کوئی کردار نہیں ہے۔“

43- ”ایک کردار جو کر کے مڑا آیا؟“

”جی ڈراما سیریل ”انتظار“ میں، میں نے

ایک نفسیاتی لڑکی کا کردار ادا کیا تھا جو کہ بہت اچھا اور

چیلنجنگ تھا۔“

44- ”کوئی کردار جس کو کرنے سے انکار کیا

ہو؟“

”ایسے کردار تو ملتے ہی رہتے ہیں۔ سب کردار

تو کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ انکار اقرار تو چلتا ہی

رہتا ہے۔“

45- ”زندگی کے لیے آپ کا فلسفہ؟“

”جیو اور جینے دو کیونکہ دو چار دن کی تو زندگی

ہے۔ کیا گلے شکوے کرتا۔“

46- ”فیس بک، انسٹا گرام اور انٹریٹ سے

آپ کی دلچسپی؟“

”ہاں ہے۔۔۔۔۔ مگر بہت زیادہ نہیں۔ اتنی

کر بڑی نہیں ہوں۔“

47- ”موبائل فون؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بہت ضروری ہے مگر جب نہیں تھا

تب بھی تو دنیا چل ہی رہی تھی۔“

48- ”آپ کے ہاتھ میں موبائل کب آیا؟“

”میٹرک کے بعد کہ والد صاحب بچوں کے

ہاتھ میں موبائل دینا پسند نہیں کرتے۔“

49- ”بچپن کتنا یاد آتا ہے؟“

”بہت زیادہ۔۔۔۔۔ بہت سہرا دور تھا۔ بہت

انجوائے کیا میں نے اپنے بچپن میں۔“

50- ”میلی میں کون خراج کا تیر ہے؟“

”پاپا کا غصہ تیر ہے، ان کے خراج میں نرمی

نہیں ہے۔ شاید والد ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

51- ”گھر میں سب سے زیادہ دوستی کس سے

تھی یا ہے؟“

”دوستی تو سب سے ہی ہے۔ مگر ماما سے کچھ اور

ہی رشتہ تھا۔ پیار والا، ماں والا اور دوست والا۔“

52- ”بچپن کی کوئی خاص بات؟“

”بہت بڑی بچی تھی۔ بس شرارتیں کرتے ہی

گزر گیا۔“

53- ”کیا آپ ہاتھ روم سنگر ہیں؟“

”بالکل ہوں۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ میرے گلے

میں سر ہے۔“

54- ”کب ٹنگٹانے کو دل کرتا ہے؟“

”جب بہت خوش ہوتی ہوں یا پھر بہت اداس

ہوتی ہوں۔“

55- ”میوزک میں کوئی خاص چوہا کس؟“

”میں ہر طرح کے میوزک کی شوقین ہوں

کیونکہ یہ روح کی غذا ہے۔“

56- ”کن فنکاروں کے ساتھ کام کر کے سیکھنے

کو ملا؟“

”نعمان اعجاز اور جاوید شیخ..... بلکہ میں تو سب

سینئر فنکاروں سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتی ہوں۔ ان

کے تجربات سے فائدہ اٹھاتی ہوں۔“

57- ”پچھانے جانے پر لوگوں کے بے ساختہ

ریکارکس؟“

”ارے آپ تو بہت چھوٹی ہیں جبکہ اسکرین پر

آپ بڑی نظر آتی ہیں۔“

58- ”ملنے پر لوگ کیا فرمائش کرتے ہیں؟“

”سیلفی، پلیز۔“

59- ”ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے؟“

”جب لوگ میری اداکاری کی تعریف کرتے

ہیں۔“

60- ”اپنے بارے میں آپ کے خیالات؟“

”کہ میں ایک اچھی لڑکی ہوں اور سب کا خیال

رکھتی ہوں۔“

61- ”سب کو خوش رکھنے میں اپنا دل ٹوٹ

جاتا ہے، ایسا ہے؟“

”ہوں..... اکثر ایسا ہوتا ہے۔“

63- ”مطالعہ کا شوق ہے؟“

”بہت..... جب موقع ملتا ہے کسی بڑے

ادیب اور شاعر کو ضرور پڑھتی ہوں۔“

64- ”زندگی کب تقسیم ہو جاتی ہے؟“

”جب شادی ہو جاتی ہے۔ بہت سی ذمہ داریاں

آ جاتی ہیں پھر پیسے والی روٹیں کہاں رہتی ہے۔“

65- ”تقریبات میں جاتی ہیں؟“

”بہت کم..... کیونکہ شادی کے بعد اب میری

پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔“

66- ”وقت کی باندی کی قائل ہیں؟“

”قائل تو ہوں مگر ”چوک“ ہوتی جاتی ہے۔ وقت

کی باندی نہ ہونے میں بہت سے فیکٹر شامل ہیں۔“

67- ”سات دن شوٹ..... گھر ڈسٹرب ہوتا ہے؟“

”میں نے آپ کو بتایا کہ میری پہلی ترجیح میرا

گھر ہے اس لیے گھر ڈسٹرب نہیں ہوتا اور اتوار کے

دن میں کوئی شوٹ نہیں رکھتی۔“

68- ”گھر کے کس کو نے میں سکون ملتا ہے؟“

”اے کمرے میں اور وہ جگہ جہاں میں نماز

پڑھتی ہوں۔“

69- ”چھٹی کے دن کہاں جانا پسند کرتی ہیں؟“

”اپنی فیملی کے ساتھ کہیں بھی۔“

70- ”فیشن سے لگاؤ؟“

”ہر لڑکی کو ہوتا ہے۔ مجھے بھی میک اپ کرنا،

جوڑیاں پہننا اور میاں صاحب کے لیے سنگھار کرنا

اچھا لگتا ہے۔“

71- ”غصہ آ جاتا ہے؟“

”جی بالکل آتا ہے جب کوئی جھوٹ بولے تو۔“

72- ”روٹل؟“

”خاموشی اختیار کر لیتی ہوں۔ بات کم کرتی ہوں۔“

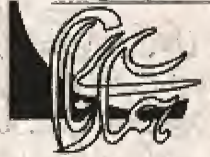
”آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟“

”ایسا نہیں ہوگا کیونکہ میں اپنا کام بہت ایمان

داری اور لگن کے ساتھ کرتی ہوں۔“



نازک کا لہو



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

شاذ بہ الطاف ہاشمی..... شجاع آباد
خواتین ڈائجسٹ کی شاذیہ چوہدری ہوں، فرحانہ ناز ملک یا پھر جواں سال رومی انشاء ان سب کا درد ہمارا اپنا درد ہے جیابخاری وہ خوشبو میں لکھنے والی ہمیں ”کرب“ دے کر ہمیشہ کے لیے کرب سے نجات پا گئیں مگر خوشبودوں کے سفر کبھی ختم نہیں ہوا کرتے۔ لفظ کبھی مرا نہیں کرتے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی اپنے محبت بھرے انداز پر، غلوں سوچ اور تمام تر حساسیت کے ساتھ جنت کی اس شہزادی کو اللہ بلند درجے عطا فرمائے، ان کے دکھ کے ایک ایک لمحے کے بدلے انہیں اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے۔ اس کا سفر کو کہ بہت مختصر تھا مگر اس کے الفاظ کے اندر سنے جہاں آباد ہیں ان چھوٹے، ان دیکھے جنہیں ریتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ پیاری جیامیں نے کبھی تمہیں نہیں دیکھا مگر تمہارا دکھ ماں جاپوں جیسا ہے۔
ج: جی شاذیہ! جیابخاری کو واقعی بھلایا نہیں جا

سکتا۔ جیادہ پیاری ہی لڑکی بہت سارے دلوں میں اپنا گھر بنا گئی۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

راجہ وحید اور کھٹا لہ زابد..... خوشاب 5 چک
ناکل گرل ہندی کی دلہن نکلیں بلکہ اس کی دوست یا کزن معلوم ہوئی تھی اور اب اسٹک کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ خیر اور آل خواتین ڈائجسٹ بورنگ ہوتا جا رہا ہے۔ ”حالم“ نام اچھا ہے لیکن اسٹوری بالکل اچھی نہیں ہے۔ عمیرہ احمد کا ناول اب پور ہوتا جا رہا ہے، کافی مہینوں سے کوئی ایسا ناول نہیں آیا جس کو پڑھ کر دوبارہ پڑھنے کو دل کرے۔ فرح بخاری، مریم عزیز، سیدہ الوب، نیلہ عزیز، فرزانہ کھرل سے ضرور اچھا سا ناول لکھوا دیں۔ عازرہ خان کا انٹرویو شائع کریں۔

ج: پیاری راجہ! ہمیں افسوس ہے کہ ناکھل سے لے کر ناولوں تک آپ کو خواتین ڈائجسٹ میں کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ کوشش کریں گے کہ اسے مزید بہتر بنا سکیں۔

زابدہ محمد خان..... شادیال ضلع کجرات
کبھی سنی میں مدیرہ کی باتوں سے سو فیصد رضامند ہوں۔ ہمارے نام میں دوسروں کے خط مجھ سے بہت بہتر تھے۔ الف بہت شاعر ناول ہے۔ ویل ڈن عمیرہ احمد۔ عالم بھی بہت شاعر ہے۔ زندگی ایک پیکلی کمال کا تھا۔ ”میرا ایک آئینہ ہے“ ویری گڈ ”میرے تم“ سدرة المنتہی کا ناول بھی قابل تحریف ہے۔ باقی سارے افسانے بھی سبق آموز تھے۔ اسامہ اعظم خان سے باتیں اچھی لگیں۔ عدنان بھائی کے شعور سے مجھے ہوتے ہیں۔

ج: پیاری زابدہ! ہماری قارئین ہی کے دم سے ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں۔

راجہ ملک جویریہ عینی..... قصبہ فیروزہ ضلع رحیم یار خان
شکوے تو بہت سنے ہوں گے اب تک لیکن ایسا شکوہ آپ شاید پہلی بار سن رہی ہوں، جی ہاں وہ یہ کہ میری سسر کو اعتراض ہوا بلکہ باقاعدہ روکھ کر بیٹھ گئی کہ آپ نے ہمیں ”پیاری“ کیوں نہیں لکھا؟ الف..... میں نے کافی سمجھا مگر بے سود اس لیے خط لکھنے ہی کی کہ شاید اب کی بار لکھ دیں..... بیٹھے گا مت پلیز۔

جیابخاری کا فکس بک پہ پڑھ لیا تھا اور صدمہ سے کئی دن بے یقین رہی۔ بہت ہی افسوس ہوا حد و حد آفسو تو اتارے بپتے رہے اور کبھی سوچ آتی رہی کہ زندگی بے وفا ہے، دو نیا دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

ج: راجہ اور جویریہ! آپ دونوں ہی ہمیں صرف پیاری نہیں بلکہ بہت بہت پیاری ہیں۔ تو پیاری راجہ! اور پیاری جویریہ زندگی واقعی بہت بے وفا ہے۔ اچانک ہی ساتھ چھوڑ دیتی ہے مگر کیا کریں جو اللہ کی مرضی۔ یہیں آ کر تو احساس ہوتا ہے کہ انسان کتنا بے اختیار اور بے بس ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نہرت اسد اللہ..... کراچی
خواتین سے واقفیت تو بہت پرانی ہے مگر مطالعہ کا سلسلہ ٹوٹا جڑنا رہا ہے جد شادی۔ اور پھر ایک کے بعد ایک بچوں کی پیدائش ہے۔

سب سے پہلے عمیرہ احمد کا ناول الف پڑھا۔ الف بہت شاعرانہ چلا رہا ہے۔ پتا نہیں اتنی خوب صورت تحریریں کیسے یہ رائیٹر لکھتی ہیں۔ بقول غالب آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔

کبھی سنی اور کرن کرن روشنی سے مستفید ہوتے ہوئے سہیل ڈائج کا انٹرویو بہت پسند آیا آج تک ان کے منفرد انداز گفتگو سے ہی محفوظ ہوتے تھے اب پتا چلا کہ وہ بہت قابل انسان بھی ہیں۔

جیابخاری کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا کہ ان کو کیا پیاری تھی ادارے کی طرف سے ان کے بارے میں اور کوئی تحریر نہیں تھی۔

فرزانہ کھرل کی ”میرا اک آئینہ ہے“ مکمل ناول بہت سبق آموز تحریر ہے۔ ”اصول“ سمیرا عثمان گل کی مختصر اور جامع تحریر بہت خوب لگی۔ سدرة المنتہی کی ”میرے تم“ میں رشتوں میں توازن قائم رکھنا کتنا ضروری ہے۔ امیرہ کے چاچا چچی بیوی بچوں، اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو برا بھلا کی محبت دیتے تو یہ مقابلے کی فضا قائم نہ ہوتی۔
ج: نہرت! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تیرے دل سے ممنون ہیں ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

راجیلہ اکرم..... انک

جیابخاری کا افسانہ ”کرب“ پچھلے ماہ پڑھا بہت ہی عمدہ تحریر۔ اچانک سے ان کی وفات؟ اصل کی تحریر (آہ..... جیابخاری) کتنی دیر میں سکھنے کی کیفیت میں رہی اللہ ان کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔

میں تقریباً 82ء، 83ء سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہوں اس زمانے میں میری ایک دوست رسالے خریدتی تھی اور میں اس سے لے کر پڑھا کرتی تھی۔ شادی کے بعد میاں نے لے کے دیے شروع کے میں نے کافی سارے ڈائجسٹ جمع کر لیے تھے پھر مجھے گھر پہنچ کر پڑھا اور میں دوسرے گھر میں آئی تو میری چھوٹی بہن نے وہ تمام ڈائجسٹ ردی والے کو دے دیے، میں اس غم میں ڈھیر سارے دن تک روتی رہی اور اب بھی روتی ہوں، اب میں باقاعدگی کے ساتھ 2010ء سے یہ تینوں ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور میں اپنے بچوں کی طرح ان کو سنبھال کے رکھتی ہوں۔ میں نے ان ڈائجسٹ سے بہت کچھ سیکھا، یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ دسمبر کے بعد جنوری اور فروری میں میری طبیعت بہت خراب رہی اور میں ذہنی طور پر بہت زیادہ ڈسٹرب تھی میرا جی کہ ”ام الحقیقین“ پڑھ کر اس بیماری سے لڑنے کا حوصلہ ملا۔

سب قاری بہنیں اور ان کے خطوط پڑھ کر بہت لطف آتا ہے۔

ایضاً اتنا بہت نام سے غائب ہیں ”کرن کرن روشنی“ پڑھ کے میری معلومات میں بہت اضافہ ہو رہا ہے اور پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے ہم جیسی کم پڑھی لکھی خواتین خاص طور پر باقاعدگی سے احادیث پڑھنے اور سیکھنے باہر نہیں جاسکتی ہیں تو ادارہ ہماری اس تنگی کو بہت عمدہ طریقے سے پوری کر رہا ہے۔

یہ تمام ڈائجسٹ مجھے میرے میاں لا کے دیتے ہیں۔ اور میں تمام ڈائجسٹ کو بہت زیادہ سنبھال کے رکھتی ہوں کہ آئندہ جب میں نہ ہوں تو یہ ڈائجسٹ ہی میری بیٹی کا ہاتھ پکڑ کے چلنا سکھائیں گے۔

ج: پیاری راجیلہ! آپ ایک طویل عرصہ سے ہمارے ساتھ ہیں۔ باقاعدگی سے ہمارے پرچے پڑھتی

ہیں۔ تو خط اتنی تاخیر سے کیوں لکھا۔ جبکہ آپ اتنا اچھا خط لکھتی ہیں۔ اتنے طویل عرصے سے جو پرچے آپ نے سفیال کے رکھے تھے وہ ردی میں چلے گئے تو دکھ کی بات تو ہے نہیں بھی بہت افسوس ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور صحت و تندرستی عطا کرے آمین۔ خط آپ نے بالکل ٹھیک انداز سے لکھا اور بہت اچھا تحریر کیا ہے۔

مارینڈیر..... 26 جنوری

ناٹل بہت پیارا تھا۔ شک بہت پسند آیا اور باقی زیورات بھی۔

”کہنی سنی“ اچھی رہی۔ سحر اور نعت سے مستفید ہوتے ہوئے دوڑ لگائی ”الف“ کی طرف، بہت لا جواب قسط، عمیرہ آئی مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ کریں گی اگر اپنا تیز شیج دوں تو؟

گزارش ہے وسم بادای کا بھی لیں انڈیو، باقی پورے کا پورا ”خواتین“ بہترین رہا۔ ”چکوان“ پلیر پلیر“ جلوہ جات“ کی ترکیب دے دیں۔ خصوصاً چنے کی دال کا طوطہ بنانے کی ترکیب اپریل میں لازمی دیجیے گا پلیر۔

وہ میں نے پوچھا تھا کہ سیدہ نسبت زہرا بی ایچ ڈی کرنے باہر گئی تھیں۔ 2016 میں؟ کیا وہ واپس آگئی؟ لازمی بتائیے گا۔

ج: پیاری ماریہ! اگر عمیرہ احمد نے آپ سے بات کرنا چاہی تو ہم آپ کو بتا دیں گے۔ آئندہ خط میں اپنا فون نمبر ضرور لکھیے گا۔

سیدہ نسبت زہرا کی بی ایچ ڈی مکمل ہوگئی تھی واپس آئیں گی۔ انہوں نے ہماری محفل میں شرکت نہیں کی، اس سے اندازہ ہوا ہے کہ فی الحال پڑھائی میں مصروف ہیں۔ جلوے کی ترکیب دی جا رہی ہے۔

ماہا شیر حسین..... ڈنگہ

ناٹل کافی پیارا تھا۔ کرن کرن روشنی بہت خوب صورت اور پیارا سلسلہ ہے۔ اسامہ اعظم کا انڈیو پسند آیا۔ سبیل و زائچہ انکل کی باتیں کافی دلچسپ رہیں پر ہاف تھا۔ انڈیو؟ خاموشی کو زبان شرمین کے جوابات کچھ خاص نہیں تھے۔ آہ۔ حیا بخاری ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہیں گی۔ الف عمیرہ احمد نے یہ قسط بھی شاعر لکھی۔ عالم نمرہ احمد نے یہ قسط بالکل پورنگ لکھی۔ ساری قسط تالیف کے

ہی گردگوشتی رہی؟ باقی کردار تو تنک برابر ہی تھے۔ اب ناول اینڈ کریں ہم تالیف سے انکار کئے ہیں۔ میرا ایک آئندہ ہے ہر زمانہ کھل اتنا مشکل تھی میں کمر سے گزر جاتا ہے۔ پلیر آسان لکھا کریں میں نے فلسفے میں اسٹر نہیں کیا ہوا۔ ”میرے تم“ سدوہ انتہی کا ناول بھی بالکل پورنگ تھا۔ قسطوں میں پڑھا۔ زندگی ایک پیلن ہے افسین فیم نے کم از کم پڑھنے لائق لکھا۔ کفایت شعار وافی ہر بچت کرنے والا سلیقہ شعرا نہیں ہوتا۔ احساس مرو کو بھی ہوا ہی نہیں (آج تک نہیں دیکھا) سیدہ راستہ ماہم انصاری سر سے گزر گئی، سمجھ میں نہیں آیا اپنی کیا کرتی تھی۔ اصول وہی ساس بھو کی گھریلو سیاسی کہانی۔ گھر آنگن میں علی صاحب آخر محبوب سے شوہر بن ہی گئے میں بھی کہوں ایسا کہاں ہوتا ہے؟ مسعود صدیقی کی غزل اور عمار مسعود کی نظم پسند آئی۔ میری ڈائری سے انہی ناصر اور پارسیز عبدالرؤف کا انتخاب پسند آیا۔ ہمارے نام سلمیٰ ناز کے خط کا جواب نہیں تھا؟

ج: پیاری ماہا! آپ کی تعریف تنقید ہم متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

درخششاں ضیاء..... کراچی

میں پچھلے 20 سالوں سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں، مجھے کئی میں پڑھنے کا شوق، اپنے والد صاحب سے ملا ہے۔ میرے والدین نے کبھی مجھے مطالعہ کرنے سے نہیں روکا بلکہ ہر ماہ خود میرے لیے رسالے لے کر آتے تھے سو کم جماعت میں پہلی بار ایک نظم کہی۔ شادی کے بعد ماشاء اللہ شوہر بھی مطالعے کے شوقین ملے۔

خواتین ڈائجسٹ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ زندگی کو برتنے کا ڈھنگ آیا ہے۔ میری پوری توجہ کا دارو مدار کہنی سنی پر ہوتا ہے۔ کرن کرن روشنی میں وصیت کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اگر والدین اپنی زندگی میں ہی اولاد کو اس کا حق دے دیں یا وصیت لکھ کر رکھ دیں تو ان کے جانے کے بعد اولاد آپس میں نہ لگھے۔ صحتی سبیل و زائچہ مجھے ویسے ہی پسند ہیں۔ بہت مزا آیا ان کے بارے میں جان کر۔ افسین فیم نے بھی اپنے قلم کا کمال دکھایا ہے۔

سمرت جہاں جیسے کردار ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ جوان پاکھنڈی باباؤں کے چکر میں آجاتے ہیں۔ قرۃ العین سکندر کی لکھی تحاریر بہت پسند آتی ہیں پر پتا نہیں کیوں احساس زیادہ متاثر نہ کرکی۔ سائرہ کی حالت پر رونا آ رہا تھا۔ میرا اک آئندہ ہے۔ ہر زمانہ کھل نے خوب لکھا ہے۔ ماہم انصاری کا سیدہ راستہ حالات حاضرہ پر تھا۔ یہ تنک ناگ نامی بلا کسی زہری طرح تو جوان نسل میں سرایت کرگئی۔ سدوہ انتہی بہت اچھا لگا آپ کو پڑھ کر۔ امیر نے بہت کچھ کھو کر بھی سب کچھ پالیا۔ میرا عثمان کے اصول کے بارے میں کیا لکھوں۔ میں خود اس مرحلے سے گزری ہوں۔ نظم اور غزلیں سب کی اچھی تھیں مگر مسعود صدیقی کا تو جواب نہیں۔

حیا بخاری کے بارے میں کیا کہوں۔ بہت ہی پیاری لکھاری بہن تھیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور انہیں جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے آمین۔

ج: پیاری درخششاں! لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ گھر والوں کا تعاون بھی حاصل رہا۔ پھر بھی آپ نے بیس سال لگا دیے خط لکھتے ہیں۔

ہم آپ کو خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ بہت اچھا خط لکھا ہے۔ آپ نے۔ ہر کہانی پر جامع تبصرہ کیا ہے۔ آپ کو خط لکھنے کی اہمیت بہت پہلے کر لینا چاہیے تھی۔

خوشی..... سرانوالی سیالکوٹ

یوں تو خواتین کے تمام سلسلے بہت دلچسپ ہیں لیکن ”حالم“ ناول کے تو کیا کہتے۔

”الف“ ویل ڈن عمیرہ جی، موسن کے راستے موسن کی طرف کاغزن ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ کیا طوطی مریچکا ہے۔

”اصول“ میں سیرا عثمان نے بالکل ٹھیک نقطہ اٹھایا۔

”بیوٹی بکس“ سلسلہ زبردست ہے۔ لڑکیاں اس سے خوب مستفید ہو رہی ہیں۔ اینٹا شرمین کا تعارف اچھا لگا۔ ”آپ کا باورچی خانہ“ ہمیں بھی موقع دے دیجیے۔ ہم سراپا انتظار ہیں۔ ”موسم کے پکوان“ کچھ خاص نہ تھے پارسیز عبدالرؤف کی نظم دل کوگی اور خوب لگی۔

”عمار مسعود“ کی نظم موجودہ حالات کے تناظر میں پسند آئی۔ کرن کرن روشنی بہت ایمان افروز سلسلہ ہے۔ ”حیا بخاری“ کی موت کی خبر نے ہلا کر رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

ج: پیاری خوشی! ہماری محنت اور کوشش آپ کو پسند آئی بہت خوشی ہوئی یہ جان کر..... امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنی رہیں گی۔

آمنہ مہر..... جڑانوالہ

سب سے پہلے ”الف“ پڑھا۔ مجھے لگتا ہے موسن اور موسن مل جائیں گے آخر پر۔ ”گھر آنگن میں“ اچھا نصیحت آموز افسانہ تھا۔ ”کفایت شعار“ وافی میں ایسا ہوتا۔ میں نے بھی دیکھا ہے۔ زندگی اک کھیل میں تین سال بعد ماسٹر جی خٹا ہو جائیں گی سن کے مزا آیا۔ ”احساس“ معاشرے کی سطح حقیقت سے روشناس کرانا افسانہ تھا۔ ”میرا ایک آئندہ ہے“ رسالے کی جان تھا۔ بے حد خوب صورت۔ محبتوں اور ان کے احساس سے گندمی کہانی۔ ماہم انصاری نے بہت اچھا افسانہ لکھا۔ ”میرے تم“ میں چاچو کا کردار پسند آیا اور چاچو کے بھائی کا بھی ”اصول“ بالکل صحیح کہا۔

”حالم“ میرا پسندیدہ ناول ہے۔ اس میں سیکھنے کا خود کو گروم کرنے کا راجن بہت زیادہ ہے۔

ج: پیاری آمنہ! میری خاموشی کو بیاں ملے، کے سوالات اگلے ماہ شائع کریں گے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فرزانہ سلیم شاہ..... نامعلوم شہر

اس صبیحے کی ماہم انصاری کی احساس الگ سی کہانی تھی۔ نمرہ احمد کا عالم بھی کافی پسند آ رہا ہے۔ اور مسعود صدیقی کی غزل بہت ہی پسند آئی۔

ج: بہت شکریہ فرزانہ!

شاہدہ ظفر..... ڈیرہ جنتی بھادلو پور

”کرن کرن روشنی“ پڑھ کر جست لگائی اپنے فیورٹ ناول ”الف“ کی طرف۔ عمیرہ آئی زبردست لکھ رہی ہیں۔ نمرہ احمد کی ”حالم“ واہ ہر کردار۔ ذہانت سے بھرپور ہونے کے ساتھ سیاست سے بھرپور بھی۔ ناول میں سدوہ جی کہانی طویل بھی دلایا بھی۔

ایک صفحہ بڑھا دیتیں امیر کا کسی ایسے ہم سفر کا ساتھ کرویتیں تو دل خوش ہو جاتا کیونکہ ہم قاری بڑے حساس دل رکھتی ہیں۔

مشتیں ہم کی زندگی ایک پیکل میں سرست جہاں پر بڑا غصہ آیا اور آپاچی کا قول چارہ ہاتھ کر اپنے ہاتھ سے گھا دبا دوں۔ کہن کی بیوہ چچی کے ساتھ گئی سنی کام آگئی۔

”میرا اک آئندہ ہے“ فرزانہ آپاچی نے خوب ہی ”اتا“ کو کھینچا۔

افسانوں میں سیرا کی ”اصول“ واقعی زندگی کی خوب صورتی رشتوں کو جوڑنے ہی میں ہے اور خوبی رشتوں میں اعلاظری اور درگزر ہی بہتر ہوتا ہے۔ شازیہ الطاف کی گھر آگن میں خوب رہنمائی کی شہلانے صبا کی ہفتوں لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ماہم انصاری کے سیدھا راستہ میں لکھی کو جلدی عقل آگئی جو کچھ اچھا ہوا۔ بشری احمد کی کفایت شعار نے تو ہنسنے کے بجائے قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ ”احساس“ میں عمران کی انا پرستی پر بہت غصہ آیا۔ باقی اشعار غزل سب اچھی تھی۔ ”نفسانی الجھنیں، اللہ عدنان بھائی کو دین و دنیا کی بھلائی دے۔

بیاری شاہد! عقلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے منتقل تک پہنچا رہے ہیں۔

شازیہ ستار..... ڈی جی خان

ہاجی اچھے خطوط کو شال کیا جاتا ہے۔ کہانی اچھا ہو کہ کہانیاں اور جو افسانے بھیج دیجے ہیں اگر ان کے بارے میں جلدی بتا دیا جاتا۔ ہاجی اگر آپ نہیں تو دوبارہ سے اسی ٹاپک پر لکھ کر سنوار کر ڈرا نکھار کر دوبارہ لکھوں مجھے جو بھی کیسا یا خامیاں لگتی ہیں تو دوبارہ ٹھیک کر کے بچھاؤں۔ ”میں رائٹل ہوں“ اور ”VIP“ ”ڈکوٹہ“۔

افسانے ہاجی آپ کو اتنا غصہ سے بھیجی ہیں۔ آپ نے نہیں پڑھیں؟ یاد رکھنے کے لیے لیا کر دیتی ہیں۔ یہ اور یہ جواب بھی کر دوبارہ لکھ کر بھیجوں۔ شامل پر چلی ہی ماڈل تھی سنواری اچھی لگی۔ حیا بخاری کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا۔

”الف“ عمیرہ احمد کی قطر اور سلسلوں میں ٹاپ پر رہی۔

ہائے ”شازیہ الطاف“ کا نام دیکھ کر ”شازیہ ستار“ نام دیکھنے کی بڑی ہی جستجو انگڑائی لگتی ہے۔ بشری احمد کی کفایت شعار بہت سوں کو آئینہ دکھا گئی ہوگی۔ قرۃ العین

سکندر کی ”احساس“ اور ماہم انصاری کی ”احساس“ کہانیاں مختلف تھیں مگر ”نام“ ایک جیسے بہر حال اچھی تھیں دونوں۔ فرزانہ کھل کا ”میرا آئندہ ہے“۔ زبردست ترین رہا۔ ”میرے تم“ میں ”سندھۃ البتہ“ کی مین میر کو کیوں خالی داکس رکھا گیا یہی شاید اس کی سزا تھی ”اصول“ گھریلو اور ہر گھر کی کہانی تھی کہ ایک کے لیے اور اصول ہوتے ہیں۔ اور دوسرے کے لیے اور اصول ہوتے ہیں۔ رامت! مگر مجھے بہت حیرت ہوئی تبصروں میں جب فرد پر تنقید ہوئی ہے کہ ”تالیہ“ پر کیوں لکھی گئی ہم اتنا عادی ہو چکے ہیں مردانہ معاشرے کے کہ کوئی عورت اگر بادل کی ”ہیر“ بن گئی ہے تو لوگوں کو اچھا نہیں لگ رہا۔ واقعی میں ہم ”ذہنی غلام“ ہیں چنانچہ اب میری بات کن معنوں میں لی جاتی ہے۔

”نفسانی الجھنیں“ میں عدنان بھائی کی بات اچھی لگی ”ڈپریشن“ دانے ٹاپک پر۔

راج بیاری شازیہ! آپ کی ایک بات بہت اچھی لگی کہ آپ اپنی کہانیوں کو بہتر بنانا چاہتی ہیں۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ آپ کہانیاں دوبارہ لکھ کر بھجوائیں دوبارہ لکھیں گی تو یقیناً آپ کی کہانیوں میں بہتری آئے گی۔ ہم سمجھ نہیں سکے۔ ذہنی غلام والی بات آپ نے کن معنوں میں لکھی ہے۔

عورت اور مرد کا رشتہ غلامی کا رشتہ نہیں ہے۔ عورت کا مرد کے ساتھ باپ کا بھائی کا شوہر کا۔ بیٹے کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی رشتہ غلامی کا رشتہ نہیں ہے۔ یہ محبت کے رشتے ہیں۔ بے شک کچھ تنگ دل اور تنگ نظر رشتوں کا احترام نہیں رکھ پاتے اور عورت کو کزن در سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت ایسا ہرگز نہیں۔

حمیرہ ارمیج..... کراچی

خواتین ڈائجسٹ ہر قسم کی تحریروں کا حامل ہے جس سے مختلف ذوق کے حامل لوگوں کی تسکین ہوتی ہے۔

گہانے رنگارنگ سے سے اس جن کی زینت کچھ قلم کار اپنے منفرد انداز تحریر اور موضوعات کے تنوع کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ عمیرہ احمد اور نرہ احمد ان ہی میں سے ہیں۔ اس وقت ”حالم“ پر کچھ لکھنے کی جسارت

کر رہی ہوں۔

نرہ کا انداز حسب روایت لیکن موضوع (معذرت کے ساتھ) خیالات کا اک گورکھ دھندل محسوس ہوتا ہے۔ دوران مطالعہ ان کرداروں کو وقت کے تصور میں چکراتا دیتا ابھرتا دیکھتا ہے۔ اور چیزیں عقلیت کے اعتبار سے ماوراء کی نظر آتی ہیں۔ ذہنی سطح کے اعتبار سے اکثریت اوسط درجے کی ذہانت رکھتی ہے لیکن۔ یہ تحریر اس کے لیے تو خیر ہے البتہ شاید ہر ایک کے لیے کشش نہ رہتی ہو۔

عمیرہ احمد اپنے اسلوب کے اعتبار سے سچ سچ کر چلتی ہوئی کرداروں کو ارتقا تک پہنچاتی ہیں۔

بیاری حمیرہ! غالباً آپ پہلی بار ہماری محفل میں شرکت کر رہی ہیں۔ خوش آمدید کہتے ہیں۔ خطا تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر پچھلے ماہ شامل نہ کر سکے۔ اس کے لیے معذرت۔

صوبہ نو رین..... فیصل آباد

غالباً چودہ چودہ سال پرانی قاری ہوں۔ مگر کبھی رابطہ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ آج جس تحریر نے مجھے اپنی خاموشی توڑنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے ”الف“ اور نرہ احمد کی کا ناول ”حالم“ دیری ناس۔ اس میں تالیہ کا کردار بہت پسند ہے۔ میری رائے میں بہت خراب ہے شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں چنانچہ کہہ کر لکھتے ہیں۔ پلیز شائع ضرور کرویں۔

راج بیاری صوبہ! چودہ چودہ سال بعد آپ کو خط لکھنے کا خیال آیا بہت دیر کی ہر باں آتے آتے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

ریحان چوہدری..... مدو کے

الفاظ میرے اتنے بھی ارزاں تو نہیں تھے آپ نے پڑھے، اور پڑھ کے اک طرف رکھ دیے ہمیشہ کی طرح کرن کرن روشنی سے ذوق مطالعہ کو تسکین ملی۔ سہیل ڈرائی صاحب سے ملاقات کروانے کا شاہین صاحب بہت بہت شکریہ یہ انٹرویو بہت اچھا رہا۔

ابھی کل ہی مجھے شاہنواز اور بھیجی غزل کی شادی سے فارغ ہو کر شادیوال سے واپس آئے ہیں، واپسی میں رستے میں ہی سارہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ساری رات اس کے ساتھ جاگتی رہی۔ سارہ ماشاء اللہ اپنی کلاس (ٹو) میں پہلی پوزیشن لے کر تیسری کلاس میں پروموت ہو گئی ہے۔ حیا بخاری کی وفات کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ انہیں جو ارحمت میں جگہ دے اور مرحومہ کے درجات بلند کرے۔ اصل کے الفاظ ان کے لیے بہترین خراج تحسین تھے فرزانہ کھل میرا اک آئندہ ہے۔

کب الفاظ نے رات اوزمی اور کب سورج کے در پر دستک دی بادل پڑھا اور میں پڑھ کے ڈائجسٹ رکھ دیا۔ جانے اندر کہیں دور تک خاموشی نے کیوں بسرا کر لیا۔ جانے ہاتھ میں کپڑا اٹھم کب میز پر حمل انداز میں گرا کاغذ شیل پر پھڑ پھڑاتے رہے۔ محبت حیرے کتنے ہیں انداز؟

عمار مسعود کی شاعری وقت کی آواز لگی، اعظم فراغ کی چھوٹی تحریر میں بھی نظم بھی بہت خوب صورت تھی۔

راج ریحان! آپ ہمیں بہت اچھا خط لکھتی ہیں۔ رواں تبصرہ اور الفاظ کا خوب صورت انتخاب۔ صفحات کی بھجوری نہ ہوتی تو ہم آپ کا پورا خط شائع کرتے لیکن کیا کریں۔ تبدیلی سرکار نے روپے کی قیمت پر جو قسم ڈھایا ہے اس سے دن بہ دن کاغذ کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ ہم تو صرف دعائی کر سکتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق محفوظ ہیں۔ کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریر اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ اور سلسلہ وار قطعہ کے کسی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریر اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

غذا کی ہے، میری امی کبھی چپن چپن میں بھی بیچے کھلونوں سے کھیلتے تھے اور میں کتابوں میں کم ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹارزن، عمر و حیار، اللہ دین، شہزاد یوں، پریوں کی کہانیاں پڑھتی تھی اور اب لڑکیوں کو میک اپ، چوڑی اور کپڑوں کا شوق ہوتا ہے اور میں خاندان کے نقش کش چھوڑ کر گھر کے کاموں اور رسالوں میں کم ہوتی ہوں۔ سب کو مجھ سے شکایت ہوتی ہے، کافی لمبی کہانی ہوتی۔

(3) اداس رکھو، خوش رکھو، ہم جگہ نہیں کرتے خزاں میں پھول بھی کھلا نہیں کرتے ملاوہ خاک میں ہمیں مگر دھیان رہے ہم جیسے لوگ پھر ملا نہیں کرتے شمع ملک

(1) بچپن میں جنوں، پریوں کی کہانیاں پڑھتے، کوہ قاف کی پریاں تلاشتے، براہ ہیکے، اچانک ڈائجسٹ کی وادی میں آنکھ۔ غالباً ساتویں جماعت میں سالانہ امتحانات میں کامیابی کا انعام تھا کہ سائنس کی ٹیچر نے پہلا ناول سنایا اور یوں ہمارا پیر کا مل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعارف ہوا۔ پھر عمر و حیار، ٹارزن کے کرداروں کی جگہ انسانی جنگل میں رہتے، انسانی رویوں سے لڑتے کرداروں سے ملاقات ہوتی۔

ایپا کو ڈائجسٹ پڑھنا پسند نہیں تھا۔ چھوٹی پیچیدہ پڑھا کرتی تھیں۔

2012ء میں گریجویشن کی غرض سے کالج میں ایڈمیشن لیا تو کالج کے گیٹ کے سامنے بک ڈپو سے جھانکتے رسالوں نے طلب کی چگاری کو ہوا دی۔ اور یوں اپنے جیب خرچ سے پہلا رسالہ خریدا۔ پہلے خواتین، پھر شعاع، پھر کرن۔ طلب کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ گویالت لگ گئی تھی۔

پھر بڑھائی کی ذمہ داریوں کے پیش نظر اسے شہر سے ہجرت کی تو سب شوق گھر کی دلیز پر پڑے رہ گئے۔ میں نے دانستہ بھی اس شوق کو پاؤں کی زنجیر بننے سے روکا۔ جب گھر واپس لوٹی تو یہ شوق میرے لوشنے کی راہ

دیکھ دیکھ ہار چکا تھا۔ پھر پیشہ ورانہ مصروفیت کی بھڑ میں شوق زندہ تو ہوا لیکن کتابی شکل میں۔ کچھ دوست، استاد ایسے ملے جنہوں نے کتابوں کے شوق کو بڑھا دیا۔

چند روز پہلے بازار سے گزرتے عرصے بعد، ایک بار پھر پرانا شوق، چمڑے دوست کی مانند بھرے بازار میں آن ملا۔ اور ہم نے اس کی صدا پر لبیک کہا۔

(2) بڑی بہن کی شادی کے بعد ماما کے سر سے ذمہ داریوں کا بوجھ ہٹانے کی کوششوں میں غلطیاں..... گھر اور پیشہ ورانہ مصروفیات کے حصار میں گھری زندگی زیادہ عیاشی کی اجازت تو نہیں دیتی۔ لیکن ابھی کھار دل کے موسم کے مطابق کتابوں کی الماری سے جھانکتی کوئی کتاب صدا دیتی ہے تو لبیک کہتے ہی بنتی ہے۔ پھر بھانگی، دوڑتی زندگی سے چند لمحے چرا کر، وقت کی لگائی کس کر، کوئی کتاب کھول لیتی ہوں اور کتابی دنیا کے گھر میں کھوجانی ہوں۔ مادی دنیا کچھ وقت کے لیے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ پڑھتی ہوں، کچھ سنتی ہوں اور زندگی کا یہ سفر رواں دواں ہے۔

(3) بیت بازی کے شوق کے پیش نظر کوئی ایک شعر کہنا تو مشکل ہے۔ کچھ اشعار ہیں جو اکثر لبوں پر رہتے ہیں۔

یہ نہیں دیکھتے کتنی ہے، ریاضت کس کی لوگ آسان سمجھ لیتے ہیں آسانی کو

تری شرطوں پہ ہی کرتا ہے اگر تجھ کو قبول یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے

اظہر فراغ

راہبہ حسین..... ممتاز آباد ملتان

(1) میں خواتین ڈائجسٹ تقریباً 2002ء سے پڑھ رہی ہوں۔ جب میں محض چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ تب صرف لطائف، اشعار، کرن کرن روشنی یا کوئی مختصر افسانے وغیرہ پڑھ لیتی تھی۔ پھر ناول بھی پڑھنا شروع کر دیے۔ درمیان میں وقفہ بھی آتا گیا۔ اب 2007ء سے باقاعدہ خرید کر پڑھنا شروع کیا ہے۔ اور ابھی تک ساتھ ہے۔ اللہ کرے کہ ابھی ہمیشہ ساتھ رہے۔ رہ

میں بات تعارف کی تو میری پچھو کے پاس چند خواتین ڈائجسٹ کے پرانے شمارے رکھے تھے۔ کچھ وہ بڑھے، کچھ ردی میں سے خریدے۔ لیکن جب راحت جنیں کی کہانیاں پڑھنا شروع کیں تو پھر میں نے باقاعدگی سے خریدنا شروع کیا۔

(2) روزمرہ کی روٹین..... دلی گھر کے نہ ختم ہونے والے کام۔ شکر ہے سب کچھ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ دوران تعلیم تو کورس کی کتابوں میں چھپا کر پڑھتی تھی۔ ایک بولٹیک میں کچھ عرصہ جاب کی۔ وہاں بھی یہ میرے ساتھ ساتھ ہوتا تھا، میری باس خود بہت شوٹین تھیں۔ وہ حیران ہوتی تھیں کہ تم پرانے رسائل بھی اتنی توجہ اور ذوق و شوق سے کیسے پڑھتی ہو؟ کھانا پک رہا ہے تو خواتین میرے ہاتھ میں ہے۔ حتیٰ کہ میں سلائی کرتے ہوئے بھی رسالہ پڑھتی ہوں۔ میرے لیے تو یہ سوال کچھ یوں ہونا چاہیے تھا کہ مطالعے کی مصروفیات کے دوران باقی کاموں کے لیے وقت کیسے نکالتی ہیں؟ جب میں بیوٹیشن کا کورس کر رہی تھی تو اکثر کٹر خواتین مجھے رسالے والی باجی کہا کرتی تھیں۔ ہے ناخرے کی بات۔

(3) اف۔ یہ کیا پوچھ لیا؟ شعر کے سلسلے میں پسند بدلتی رہتی ہے اور اکثر یاد ہی نہیں رہتے۔ بہر حال آج کل میرا پسند یہ ہے۔

مجل چھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ شرم بھی اے خاند بر انداز چمن کچھ تو۔ ادھر بھی

شرین عرف شرم..... کوٹ برکت علی

(1) ہم نے پہلے شعاع پڑھنا شروع کیا تھا جب ناول بارم شروع ہوا تھا تو میری بہن کی شادی ہوئی۔ اس نے خواتین کی سے لیا اور اس میں خوش نصیب والی کہانی پڑھی اور مجھے بتایا کہ کہانی میں لڑکی کا نام خوش نصیب ہے اور اس کی حرکتیں بھی سنائیں بعد ازاں مجھے بھی پڑھنے کے لیے دے دیا تو خواتین اس طرح ہم نے پڑھنا شروع کر دیا۔

(2) روزمرہ کی روٹین یہ ہے کہ صبح سویرے امی کی آواز سے اٹھتی ہوں نماز پڑھتی ہوں پہلے تو میں نماز پڑھ کے تلاوت کر کے ادھر ادھر پھر کبھی اور ناشتا کرنے کے بعد گھر کے باقی کام کرتی تھی لیکن امی کو بیماری کی وجہ سے

آگ کے قریب جانا منع کیا ہوا ہے تو جب سے میں اٹھتی ہوں، ناشتا بناتی ہوں سب کو کرواتا ہوں، دل کرے تو خود بھی کر لیتی ہوں ورنہ نہیں اور ہماری کوئی بخت روٹیں نہیں ہے۔ برتن دھوئے، جھاڑو لگا لی بیچے اسکول چلے گئے تو گیارہ بجے تک فارغ ہو کر پھر رسالے میں کم ہو جاتی ہوں۔

(3) جی مجھے شاعری سے بہت لگاؤ ہے اور میں خود بھی شاعری کرتی ہوں تو میرا اپنا ایک شعر مجھے خود بہت پسند ہے۔

عرض ہے کہ.....

مجھ سے ملنا ہو تو چا لکھ لو میرا بہرا ہے اداسیوں کے شہر میں

حنا سلیم انوان..... ہری پوری ہزارہ

(1) شعاع و خواتین پڑھنے کا چکا تو جناب 2001ء میں ہی لگ چکا تھا۔ پرانے رسالے خرید کر پڑھنے کا یہ دورانیہ 2001ء سے ستمبر 2006ء تک رہا۔ ستمبر 2006ء سے باقاعدگی سے شعاع کی قاری بنی۔ لیکن ہاں، پرانے خواتین ڈائجسٹ خریدنے کا سلسلہ بھی جاری و ساری رہا۔ مجھے شعاع سے زیادہ خواتین کے ناول اور کہانیاں اٹریکٹ کرتیں۔ اور دل شدت سے چاہتا کہ بس کسی بھی طرح سے خرید لوں۔ پھر مجھ سے رہانہ گیا جب مارچ 2010ء کے دہن کے ناول کو شعاع میں دیکھا۔ تو جناب مارچ 2010ء ہی وہ مبارک ماہ ہے جب میری خواتین ڈائجسٹ سے دوستی استوار ہوئی۔ اور اب اس دوستی کو مارچ 2019ء میں الحمد للہ پورے نو سال پورے ہوئے ہیں۔

(2) روزمرہ کی ذمہ داریاں کچھ اتنی ہی خاص نہیں کہ مطالعہ کے لیے باقاعدہ وقت مخصوص کرنا پڑے۔ جس دن خواتین آتا ہے۔ بس وہی رات ہوتی ہے مطالعہ کی۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ ہو گیا تو آٹھ گھنٹے۔ بس.....

اور پھر میرے گھر کا طویل ترین انتظار شروع۔

(3) پسندیدہ شعر.....

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی تم مانگتے چمرد گئے اپنا غرور ہم سے

(باقی آئندہ)

خجین و گین

دو صفحہ

ہے۔ ڈراموں میں جس خود مختار، لبرل بولڈ اور خوب صورت لڑکی کی چالیس سال تک تعمیر کی اسے سنے ڈراما رائٹر نے چار سال میں ہی مار ڈالا (اور ابھی بھی مار رہے ہیں مرے ہوئے کو) اب ہر ڈرامے میں لڑکیوں اور خواتین کو مار کھاتے، روتے اور تشدد کا نشانہ بننے دکھایا جا رہا ہے۔ (جب کہ ظلم بھی عورت ہی کر رہی ہے درپردہ عورت پر۔)

کچھ عرصے سے پاکستان میں طلاق کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن فریقین ایک دوسرے پر الزام دھرتے نظر آتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ طلاق کی وجہ وہ ہیں۔ ایسے خال خال لوگوں میں صنم سعید کا بھی شمار ہوتا ہے۔

صنم سعید نے اپنی ناکام شادی کا ذمہ دار خود کو ٹھہراتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ شادی کے کچھ



معیار پاکستان کی ڈراما انڈسٹری ان دنوں اچھے اسکرپٹ کی کمی کا شکار ہے (صرف ڈراما انڈسٹری؟ یہاں تو فلم انڈسٹری کا بھی سب سے بڑا مسئلہ اچھا اسکرپٹ ہی ہے) ویسے تو بہت سے نئے مصنفین سامنے آ رہے ہیں۔ ان کے ڈرامے اور فلمیں مقبول بھی ہو رہے ہیں لیکن ان کا معیار وہ نہیں ہے جو کچھ عرصے قبل تھا۔ کیونکہ نئے پروڈیوسرز کو اچھے اسکرپٹ کی تلاش تو رہتی ہے (بغیر محنت کے تلاش) لیکن وہ (معذرت کے ساتھ) معیاری اسکرپٹ پر ڈراما بنانے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ ایک ہی انداز کے بنے ڈرامے یکسانیت کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

ایک پروگرام میں بات کرتے ہوئے ماضی کی معروف ڈراما رائٹر حسنین کا کہنا ہے کہ انہیں آج کل کے ڈرامے دیکھ کر بہت افسوس اور تکلیف ہوتی

عرصے بعد انہیں احساس ہوا کہ ان سے شادی شدہ زندگی نہیں گزاری جائے گی۔ (یہ تو اکثریت کا مسئلہ ہے مگر.....؟)

صنم نے بتایا کہ جب ان کی شادی ہوئی تو اس کے بعد ان کی والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی جس کے لیے انہیں اپنے شوہر اور شادی شدہ زندگی کو چھوڑنا پڑا (ہائیں وہ کیوں بھی؟) جہاں انہیں اپنی والدہ کا خیال کرنا پڑا وہیں انہیں احساس ہوا کہ شادی پر قرار رکھنے کے لیے وہ خرید قربانیاں نہیں دے سکتیں (قربانیاں.....؟ پر کتھوں؟)

صنم سعید شادی کے بعد دینی منتقل ہو گئی تھیں (ان کی لومیرج بھی) جہاں ان کے بقول انہیں آزادی کا احساس تو تھا مگر وہاں انہیں پورے بہت ہوئی کیونکہ وہ سولہ سال کی عمر سے کام کر رہی تھیں۔

ترجیح

معمرا نا کرکڑ کے بیٹے ہونے کے باوجود کرکٹ کے بجائے فلم میں آ گئے (کرکٹ ٹھٹ کھیل ہے اور معمرا.....) معمرا نا جس وقت فلم میں آئے اس وقت سلطان راہی کے ساتھ ساتھ شان بھی کام کر رہے تھے۔ معمرا نا نے اپنی اداکاری سے اپنے سینئرز کو کافی ٹھٹ ٹائم دیا لیکن وہ فلم انڈسٹری کی سیاست کی نذر ہوئے اور انہیں سینئر ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا جاتا رہا حالانکہ ان کی بطور ہیرو فلمیں پھر ٹھٹ رہیں، اپنے غصے کا شکار بھی رہے۔

معمرا نا نے بڑی ملک جا کر بھی کام کیا۔ اس بارے میں معمرا نا کہتے ہیں کہ ”وہ پہلے پاکستانی اور پھر اداکار ہیں“ اب بھی ان کے پاس تین بھارتی فلموں کے اسکرپٹ اور ان کے ایڈوائس ہیں (وہ تو فلم بھی بن گئی) لیکن وہ بھارت میں کام نہیں کرنا چاہتے (کیوں بھی.....؟ پہلے تو کیا تھا اب کیا ہو گیا) پاکستانی فنکاروں میں پاکستانیت کوٹ کوٹ کر بھرتی ہونی چاہیے (کیوں بھی؟ صرف

ادا کاروں میں ہی کیوں؟) عزت کے آگے پیسے کو ترجیح نہیں دینا چاہیے (تو ایڈوائس کیوں لے رکھا ہے؟) پاکستان فلم انڈسٹری پہلے کی نسبت بہتری کی جانب کا حزن ہے (اور آپ کم پیسوں میں کام کر لیں گے؟) بھارتی فلموں پر پابندی سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا (آپ کو؟)

ادھر ادھر سے

☆ کشمیر سمیت اس خطے کو جنگ کی نہیں مکالے کی ضرورت ہے۔ سبے نظیر بھٹو، نواز شریف، اٹل بھاری واجپائی اور آئی کے جبرال جیسی بصیرت کی ضرورت ہے۔ سستے نعروں کے بجائے برکھادت، تنن بوس، غاصہ جہاگیر اور خالد حسن جیسی جرأت آزما آوازوں کی ضرورت ہے۔

(وجاہت مسعود..... عظیم نظر) ☆ غیب نے کچھ عرصہ قبل سابق وزیر اعظم نواز

شریف کے خلاف بھارت میں مٹی لائڈ رنگ کرنے کا الزام بھی لگایا تھا، جب ثابت ہوا کہ ایسا کوئی معاملہ سرے سے موجود ہی نہیں تو معذرت کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی۔

(اعجاز سید..... سیاسی افق) ☆ منیر نیازی صرف ایک اعلا درجے کے منفرد شاعر ہی نہیں، بہت تخلیقی جملے باز بھی تھے۔ ایک دن کہنے لگے ”میں جس دفتر میں جاتا ہوں، بتایا جاتا ہے صاحب مینٹگ میں ہیں، سمجھ میں نہیں آیا یہ دو لے شاہ کے چوہے کیا مینٹگ کرتے ہوں گے۔“ (عطاء الحق قاسمی..... روزن دیوار سے)



ہم چھٹے بگڑے جب بھی اٹھے
پھر تیرے حضور آ گئے ہیں
یا کر بھی تو نیند اڑ گئی تھی
کھڑک بھی تو رت جگے ملے ہیں

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور
جب خوش بھی ہوتے تو روہیے ہیں

دول کی خبر بھی، چارہ سازوا
دامن کے تو چاک سی لیے ہیں

ارتق خان

میری فائزی میں تحریر کوہ یقین ہے
غزل سب قاریں کے لیے ہے

جو ہم پر گزرتے تھے دین سامنے وہ خود بگڑے تو لوگ مجھے
جب اپنی اپنی محبتوں کے عذاب چھٹے تو لوگ مجھے

وہ ہیں ددختوں کی جھاڑی میں سافروں کو اٹھانا صفا
انہیں ددختوں پر اگے موسم تو جوں نہ اترے تو لوگ مجھے

اس ایک کئی سی مردانی کے نلے کو کوئی نہ سمجھا
جب اس کے گزے سے لاشی نکلی اٹھانے لگے تو لوگ مجھے

وہ خواب تھے ہی چنیلیوں سے سوئے حاکم کی کرلی بیعت
چکرک چنبیلی کی اوٹ میں سے جو سانپ نکلے تو لوگ مجھے

وہ گاؤں کا اک غریب دیہاتی مرگ کے خنے پر کون خفا تھا
جب اس کے بچے شہر مار گئے تو لوگ مجھے

پس؟



راہد ملک

میری فائزی میں تحریر ذوالفقار یوسف کی یہ
غزل میری بیعت غزلوں میں سے ایک ہے۔ آپ

بھی پڑھیے۔
منسل درجوں کی یہ قیامت بھاڑیں جانے
محبت گر بھی ہے تو محبت بھاڑیں جانے

نئی سوجوں سے گزینا داس کی ہل گئی تو کیا
یہ بوسیدہ رواں جوں کی عمارت بھاڑیں جانے

کسی کی لاش پر چڑھ کر تم اپنا درختا جاتے ہو
تمہاری چندلوں کی یہ شہر ت بھاڑیں جانے

کہاں کہے، کہاں تک اس لیے کی گونہ ہے یوسف
مگر ایسے سوالوں کی اذیت بھاڑیں جانے

نور قطب

خلیق کا سدا علی اپنی آگ میں جلے کا من ہے۔
جب وہ کرے گزرتا ہے تو اس کے احساس میں

پھول کھلتے ہیں۔ خوشی میں بھی تم کا پہلو ڈھونڈ لیتا
ہے۔ وہ عشق کی اس منزل پر پہنچتا ہے جہاں کھوتا

اور پانا یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی یہ
غزل اسی کیفیت کا اظہار ہے۔

احساس میں پھول کھل رہے ہیں
پتہ جھڑکے عجیب سسلے ہیں

مقراٹنے زہری لیا تھا
ہمکے جینے کے ڈھکے ہیں

آپ کا باورچی خانہ

تیسرا پیشہ

مجھے پسند نہیں ہے۔ تین چار دن بعد شاپنگ کے بعد
باہر کھانا کھایا تھا۔ پرنجھے کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ ہاں
باہر سے لا کر بندہ گھر پر آرام و سکون سے کھالے، یہ
ٹھیک ہے اور میرا جب بھی باہر سے کھانے کا موڈ ہوتا
ہے، ممالا دیتی ہیں۔

س: صبح ناشتے میں کیا پاتی ہیں؟
ج: کوئی ایک چیز مقرر تو ہے نہیں جس کا جو دل
کرتا ہے وہ کھالیتا ہے اور ایک جیسی چیز کھا کر بندہ

پھر اکتا بھی جاتا ہے۔ تو بس بھی چائے، کیک، کچھر،
پراٹھا، سالن، اٹھ پراٹھا، مولی یا آلو کے پرائے، بھی
حلوہ پوری تو بھی صبح صبح بریانی۔

س: چکن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟
ج: یہ تو میرے موڈ پر منحصر ہے کیونکہ میں بہت

موڈی قسم کی ہندی ہوں۔ موڈ نہیں ہے تو جلدی جلدی
سمیٹ کر بس کام ختم کرتا ہے۔ اگر بھی موڈ بن جائے
تو ہمیں اپنے چکن پر بڑا پیارا تا ہے اسے دھو ڈالتے

ہیں۔ فرنچ، چولہا، مسالے کے ڈبے، شیلوں کی
شیٹ پر دے سب چکا چک کر دیتی ہوں۔

س: چکن کی کوئی ٹپ؟
ج: جناب ابھی ہم جو نیئر ہیں، خود سینئر کی نہیں

پر چلتے ہیں اس لیے کوئی ٹپ نہیں بتا سکتے فی الحال۔
اوکے جی سب کو اللہ حافظ۔



خواتین میرا فورٹ ڈائجسٹ ہے اور میں آج
جو کچھ بھی ہوں اسی کی وجہ سے ہوں۔ اس کے سلسلوں
میں شامل ہونے کا مجھے بے حد شوق ہے جب بھی میرا
نام (خواتین، شعاع، کرن) میں شامل ہوتا ہے تو
مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ ارے میں بھی یہ کیا باتیں
لے کر بیٹھ گئی، چلیے سوالات کی طرف۔

س: کھانا بناتے ہوئے آپ کن باتوں کا
خیال رکھتی ہیں؟

ج: صبح متاؤں تو کھانا بناتے ہوئے ہمارے یہاں
صرف اور صرف پسند اور ناپسند کا خیال رکھا جاتا
ہے۔ موسم وغیرہ کا خیال ہم نے بھی رکھا نہیں ہے جو

چیز کھانے کا دل ہو وہ پکالیتے ہیں۔ ہاں البتہ خوراک
سادہ و مطلب زیادہ اشیاء کا استعمال نہ ہو اس بات کا
خیال رکھتی ہوں اور جتنا کھانا ہوتا ہے پکاتی ہوں۔

ورنہ ضائع ہو جائے تو گناہ ملتا ہے۔
س: کھانے کا وقت کتنے اور مہمان اچانک
آجائیں تو کوئی ایسی ڈش جو فوراً بن جائے؟

ج: اگر عین کھانے کے وقت..... مطلب کہ
اگر ہم بھی کھا رہے ہوں اور اسی وقت آجائے تو جو ہم

کھا رہے ہیں انہیں بھی پیش کر دیں گے۔ اگر کھانے
کے آگے پیچھے آجائیں تو سب سے پہلے "ٹک ٹک ٹک ٹک"
یا چائے، سرو کروں گی اور یہی ڈش کی بات تو

"بریانی" جلدی تیار ہو جاتی ہے ورنہ بیکریز اینڈ
آؤر شاپز زندہ باد۔

س: مینیے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی
ہیں؟

ج: مجھے تو باہر کھانا کھانا ڈرا بھی پسند نہیں ہے۔
مما اور چھوٹی بہن اکثر کہتی ہیں کہ چلو کسی شیفٹ
پوائنٹ چلتے ہیں پر میں فوراً انکار کر دیتی ہوں کہ یہ

مہنگے پکوان

خاکہ جیلانی

سبزیوں کے کٹس

اجزاء:-	چار سلاکس
ڈبل روٹی	آدھا کپ
بند گوشتی	آدھا کپ
گاجر	دو عدد
شملہ مرچ	دو عدد
آلو	دو کپ
اے سفید چنے	دو عدد
ہری پیاز	چار چمچے
لیمونس کارس	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت
تیل	آدھی کٹی
ہرا دھنیا	آدھی کٹی
پودینہ	چار عدد
ہری مرچ	ایک عدد
اٹھا	

ترکیب:-

ہری مرچ، ہرا دھنیا، ہری پیاز، گوشتی اور شملہ مرچ باریک کاٹ کر اس میں لیموں کا رس ملا دیں۔ ڈبل روٹی، اے سفید چنے، نمک، زیرہ، ثابت دھنیا، گرم مسالا اور دو کھانے کے چمچے تیل پیس کر اس میں ملا دیں۔ اٹھا بھی توڑ کر ملا دیں۔ آدھا گھنٹہ یا آمیزہ رکھا رہنے دیں پھر اس کے کٹس بنالیں۔ گرم تیل میں سنہری ہونے تک تھلیں۔ کچپ اور ہری چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

قندھاری چکن بریانی

ضروری اشیاء:-

مرغی کا گوشت (بڑے ٹکڑے) چھ سے آٹھ عدد

چاول

پياز (براون کرلیں)	ایک کپ
لہسن اور ک	دو کھانے کے چمچے
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
پسی ہری مرچ	دو کھانے کے چمچے
ہلدی	آدھا چائے کا چمچ
زیرہ	ایک چائے کا چمچ
دہی	ایک کپ
لیمونس کارس	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر (گول سلاکس کاٹ لیں)	دو عدد
انار کارس	ایک چائے کا چمچ
ہری مرچ	چھ سے آٹھ عدد
پختی	ایک کپ
لال فوڈر	دو چمچ
تیل	ایک کپ

ترکیب:-

دہی میں لہسن اور ک، نمک، لال فوڈر، ہلدی، انار کارس اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور گوشت بڑا لگا کر میزینٹ ہونے کے لیے ایک گھنٹہ فریج میں رکھ دیں۔ چاول دھو کر ثابت گرم مسالا کے ساتھ دو گنی مال لیں، لپال کر ایک ٹرے میں پھیلا دیں اور بھٹھا کر لیں۔ دہی میں تیل گرم کریں اور زیرہ ڈال کر خرائی کریں۔ اس میں میرینٹ گوشت اور براؤن پیاز ڈال کر ڈھکن بند کر دیں، گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو بھون لیں۔ ایک بڑی دہی میں چاول کی تہہ بچھا دیں، اوپر سے گوشت اور ٹماٹر سلاکس ڈال دیں اور چاول ڈال کر زردے کا رنگ چھڑک دیں۔ اب

پختی ڈال کر دس سے بارہ منٹ دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکال کر سلاوا اور دہی کے ساتھ پیش کریں۔

ویجیٹبل بریانی / رائیہ کے ساتھ

ضروری اشیاء:-

چاول	تین ماڈ
منر	آدھا کلو
آلو	تین عدد
گاجر	ایک عدد
پودینہ	آدھا کپ
ہری مرچ	تین سے چار عدد
ٹماٹر	دو عدد
پیاز (درمیانی)	دو عدد
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچ
دھنیا پسا ہوا	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
مکس ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچ
زیرہ سفید	ایک چائے کا چمچ
لہسن اور ک	دو چائے کے چمچے

مکس ویجیٹبل رائیہ:-

دہی	آدھا کلو
کھیرا (چوکور)	ایک عدد
گاجر (چوکور بوائل)	ایک عدد
مولی (چوکور)	ایک کپ
ٹماٹر (چوکور)	ایک بڑا
چندر (چوکور بوائل)	ایک عدد
پودینہ، ہرا دھنیا، ہری آدھا کپ (چوب)	
لیمونس	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب:-

چاول کو بھگو دیں۔ آلو چوکور کاٹ لیں، منر چھیل لیں۔ اب ایک دہی میں تیل گرم کریں اس

میں پیاز خرائی کریں۔ لکا سنہرا ہو جائے تو ثابت گرم مسالا منر، زیرہ، آلو، لہسن، اور ک، مرچ، نمک، ہلدی، دھنیا خرائی کریں۔ اب چاول ٹماٹر چوکور، ہری مرچ اور پختی ڈالیں (اگر پختی نہ ہو تو پانی ڈال دیں) پختی خشک ہو جائے تو پودینہ شامل کر دیں اور دم پر رکھیں۔ رائیہ کے ساتھ پیش کریں۔

رائیہ بنانے کے لیے:-

دہی میں نمک، کالی مرچ، لیموں، پودینہ، ہری مرچ، ہرا دھنیا شامل کر دیں۔ گاجر، آلو، چندر کو چوکور کاٹ کر الگ الگ بوائل کر لیں اور چھلی پر رکھیں کہ پانی نکل جائے۔ اب دہی کے کچر میں آلو، گاجر، چندر، ٹماٹر، مولی، کھیرا شامل کر دیں اور ویجیٹبل بریانی کے ساتھ پیش کریں۔



خواتین ڈائجسٹ

کھانے پینے کے لیے ایک سہول

نیا خاں

اسٹریٹ

اتر چتر پور

قیمت = 450 روپے

نمائندہ تصویر

کتبہ عمران ڈائجسٹ 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر 32735021

کھستان گھیلنے والی گھنٹیں

فصل آباد

اس میٹرک کے ایک سال بعد میری معنی میرے ماموں زاد سے ہوئی اور مکمل ان کی رضامندی سے ہوئی میری امی اس رشتے سے بہت خوش تھیں۔ کیونکہ انہیں اپنے بھائی کے بچوں سے بہت پیار ہے۔ میرے ماموں حیات تھیں۔ لیکن میری ممانی بہت اچھی اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ بہت خوشی اور جادہ سے انہوں نے میرا رشتہ مانگا جسے بخوشی قبول کیا گیا۔ اس رشتے سے دونوں فیملیز بہت خوش تھیں۔ خصوصاً میری ماموں زاد کو نر کو نکھان کا ہمارے ساتھ شادی پیرا تھا۔

مکمل کے ایک سال بعد ممانی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سات سال سب ٹھیک رہا میرے کزن سے کبھی کبھار میری بات تھی ہو جاتی تھی۔ وہ میرے ساتھ بہت خوش، اچھے طریقے سے بات کرتے تھے۔ ان کے پیار میں بہت شدت تو نہیں لیکن اگر زیادہ عرصہ میری بات نہ ہوتی تو کہتے تھے۔ تمہارا مجھ سے دل بھر گیا ہے جو میرے ساتھ بات نہیں کرتیں یعنی سب ٹھیک تھا۔

اس سال بڑی عید پر ہماری شادی کی تاریخ رکھی جانی تھی۔ ہم نے ان کا بہت انتظار کیا۔ چند دنوں بعد میری چھوٹی ممانی نے روتے ہوئے میری امی کو فون کیا کہ اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں نے نکاح کر لیا ہے۔

میری کزن نے اسے کال کی تو اس نے میرے کردار کو برا کہا کہ میرا میرے خالہ زاد سے انحراف ہے جس کے لیے میری خالہ نے ہماری معنی سے پہلے رشتہ مانگا تھا لیکن میرے والدین راضی نہیں ہوئے اور وہ بات وہیں ختم ہو گئی۔ ایک شادی کی تقریب میں انہوں نے مجھے بھیج کیا کہ میں نے اس طرح کی بات سنی ہے کہ وہ تمہارا رشتہ مانتے تھے۔ میں نے کہا کہ صرف رشتہ مانگا تھا لیکن انکار ہو گیا۔ اب انہوں اس رشتہ کو جواز بنا کر انکار کر لیا ہے۔

میری وجہ سے میرے والدین بہت پریشان ہوئے۔ میں نے والد کو زندگی میں کبھی اتنا بے بس نہیں دیکھا جتنا اس وقت دیکھا۔ اس کے گھر والے بھی بہت مجبور ہو گئے۔ اسے منایا لیکن اس نے نکاح نامہ دیکھا دیا اور وہ رو دھو کر خاموش ہو گئے۔

اب میرے والدین نے میرے لیے رشتہ دیکھا اور پسند بھی کر لیا ہے۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں جس شخص کو میں نے سات سال سوچا اس کے خواب دیکھے، اس کے علاوہ میں کیسے کسی دوسرے شخص کو قبول کروں گی۔ مجھے یقین نہیں ہوتا سب اپنی مرضی کی اور بعد میں مجھے دھوکا دیا۔ واضح رہے کہ وہ بیرون شہر جاب کرتے ہیں۔ وہیں کسی لڑکی سے نکاح کیا ہے۔

راج: اچھی بہن آپ کی اذیت اور دکھ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور آپ کے والدین کی پریشانی کا بھی۔ لیکن درحقیقت اگر آپ غور کریں تو آپ خوش نصیب ہیں۔ وہ شخص جس نے سات سال کے اس رشتہ کا جو اس کی مرضی سے قائم کیا گیا تھا۔ پاس نہیں کیا۔ جس نے اپنی پھوپھی کا لحاظ نہیں کیا۔ جس نے اس لڑکی کا خیال نہیں کیا جس سے اس نے سات سال تک لگاؤ اور انسیت کا اظہار کیا۔ اس جیسے بے مروت، بد لحاظ اور خست دل آدمی سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ پھر اگر اس کو کوئی لڑکی پسند آگئی تھی اور اس سے نکاح کر لیا تھا تو کم از کم اس میں اتنی

اخلاقی جرات تو ہوتی کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتا۔ اس نے سیدھا آپ کے کردار کو مشکوک بنانے کی کوشش کی اس جیسے آدمی سے رشتہ نہ ہونا آپ کی خوش بختی ہی کہی جاسکتی ہے۔

دوسری خوش بختی یہ ہے کہ آپ کو فورا ہی دوسرا رشتہ مل گیا ہے۔ بے شک ابھی آپ کا دل راضی نہیں ہے۔ لیکن وقت آپ کے ذمہ منڈل کر دے گا۔ آپ اس شخص کے کردار پر غور کریں گی تو آپ کا دل اس سے خود بخود ہٹ جائے گا۔ آپ صرف یہ سوچیں کہ وہ آپ کے قابل ہی نہیں تھا۔ قدرت نے خود ہی آپ کے راستے علیحدہ کر دیے۔ سات سال جس شخص سے جذباتی وابستگی رہی ہو۔ جس کے ساتھ شادی کے خواب دیکھے ہوں۔ اس سے اس طرح علیحدگی تکلیف دہ ضرور ہے لیکن آپ اللہ پر بھروسہ کر کے شادی کر لیں۔ آپ کے حق میں یہی بہتر ہے۔

میر..... فصل آباد

ایک بہن کا خط ملا ہے۔ ان بہن نے عرشی والے خط کا ذکر کیا ہے۔ ان بہن سے کہنا یہ ہے کہ ان صاحب نے اپنی بڑی کو طلاق دے دی ہے اور ان کی شادی ہو چکی ہے۔

یہ بہن گر بچہ پریشان کر چکی ہیں اور ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہیں۔ دو بھائی ہیں جو کراچی میں جاب کرتے ہیں۔

اگر کوئی خاتون اپنے بیٹے یا بھائی کا ان سے رشتہ کرنا چاہے تو ہم سے رابطہ کر سکتی ہیں۔

حریم..... گجرات

اس ماموں کی بیٹی "س" سے بھائی کی معنی ہوئی۔ مکمل میں دونوں گھر انوں کے ساتھ ساتھ بھائی اور "س" کی مرضی بھی شامل تھی۔ دونوں کا فون پر رابطہ تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ چنانچہ کیا ہوا کہ اچانک "س" نے شادی سے انکار کر دیا۔ پتا چلا کہ کالج کی کسی تقریب میں کوئی فحش آئے تھے۔ انہیں وہاں سے پسند آگئی۔ انہوں نے شادی کی بات کی۔ پیسے کی چکا چوند نے سارے گھر والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ ماموں راضی نہ تھے لیکن سب گھر والوں اور خصوصاً "س" کی مرضی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ ہمارے ہاں سے رشتہ توڑ کر انہوں نے وہاں شادی کر دی۔

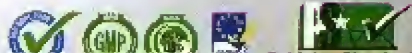
بھائی پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ کافی عرصہ ہسپتال میں رہے۔ اس دوران امی نے کئی جگہ ان کی شادی کی بات چلائی تھی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ "س" کی شادی کا وہی انجام ہوا جو اکثر ایسی شادیوں کا ہوتا ہے۔ فحش صاحب کا دل بھر گیا۔ تو وہ اسے اپنے گاؤں میں رکھ کر بھول گئے۔ اب اس نے بھائی سے رابطہ کیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر بھائی اسے قبول کر لیں تو وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے۔ بھائی اب بھی اسے چاہتے ہیں۔ دونوں کی بات چیت ہوتی ہے لیکن امی رضامند نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس لڑکی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

راج: آپ کی امی کی بات بہت حد تک درست ہے۔ وہ لڑکی جو دولت دیکھ کر سارے عہد و بیان بھول جائے۔ اس پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے زندگی میں جو غلطی کی، اس سے سبق حاصل کیا ہو اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرے۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ کیا وہ فحش صاحب "س" کو طلاق دینے پر آمادہ ہیں؟ اگر وہ آمادہ نہیں تو "س" کو خلع لینا پڑے گی۔ ایک بااثر زمین دار سے مگر لینا آسان بات نہیں خصوصاً موجودہ عدالتی نظام میں جہاں ایک مقدمہ دو سالوں تک جاتے ہیں۔

بہتر یہی ہے کہ آپ کے بھائی ابھی اس مسئلہ سے علیحدہ رہیں اور اس کی طلاق یا خلع سے پہلے اس کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ اگر "س" طلاق یا خلع لے لیتی ہے تو اس وقت جو حالات ہوں، اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

Fairer Your
Skin
Get it now →



بیوتی ہیکس

ہفت الصبغور

فاطر علی لاہور

س: میری عمر پینتیس سال ہے لیکن ابھی سے میرے چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی ہیں۔ بہت سی کرمیں استعمال کرتی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ میری جلد خشک ہے؟

ج: چہرے پر جھریاں پڑنے کی سب سے بڑی وجہ خشک جلد اور غذا میں عدم توازن ہے۔ متوازن غذا جس میں تمام دٹامن اور کلسیم پر مشتمل شامل ہوں، چہرے کی جلد کو تروتازہ رکھتی ہے۔

دوسری بڑی وجہ جس کا عموماً خواتین خیال نہیں رکھتیں، وہ ہے پانی کا استعمال۔ زیادہ سے زیادہ پانی پئیں۔ آپ کی جلد چمک دار اور خوب صورت رہے گی۔ چہرے پر موچر انڈر کا استعمال باقاعدگی سے کریں۔ عرق گلاب میں چند قطرے گلیسرین یا شہد بہترین موچر انڈر ہے۔

ایک چمچ لیموں کے عرق میں ایک چمچ شہد ملا کر چہرے پر لگانے سے جھریاں دور ہو جاتی ہیں۔

ذیل میں چند ورزشیں دی جا رہی ہیں۔ ورزش کرنے سے پہلے دودھ، کریم یا موچر انڈر ضرور لگائیں۔

1- اچانچہ ادا کریں، بائیں گھما چپے۔ جہاں تک ممکن ہو، اسے حرکت دے کر دور لے جائیں۔ یہ ورزش لگی ہوئی ٹھوڑی کے لیے بہترین ہے۔

2- اپنے ہونٹوں کو اندر کی طرف کھینچ کر منہ کو خوب کھولے۔ ہونٹوں کو دانتوں کی طرف کھینچیں۔ اس انداز میں رہتے ہوئے اپنا منہ کھولتے اور بند کرتی رہیں۔ گویا آپ بغیر دانتوں کے چپا رہی ہوں۔ اس سے بالائی ہونٹ کی کلیئر سسٹمی جائیں گی۔

3- آنکھیں خوب زور سے بند کر کے منہ سکڑے۔ ایک لمحے کے بعد ہونٹوں کو حرکت دیں پھر آنکھیں جتنا

ممکن ہو، پوری طرح کھول دیجیے۔ اس ورزش سے آنکھوں اور اطراف کے عضلات مستحکم ہوتے ہیں اور آنکھوں کے کونوں میں جھریاں جنہیں ”کوئے کے پنچے“ کہتے ہیں، آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں۔

4- انگلیاں آنکھوں کے بیرونی کونوں پر رکھ کر عضلات کو کچلی کی طرف انگلیوں سے کھینچیں۔ اس سے بھی آنکھوں کے کونوں کی جھریاں ختم ہوتی ہیں۔

5- دونوں ہاتھ چہرے پر رکھیے۔ ہاتھوں کو حرکت دے کر بغیر انگلیوں سے آنکھوں کے پنچے کے عضلات کو کھینچیں اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیں۔

6- اپنے انگلیوں کو آنکھوں کے نیچے یعنی گال کی ہڈیوں پر ہلکے دباؤ کے ساتھ گھما دیے۔ اس سے آنکھ کے اطراف دوران خون میں اضافہ ہوگا۔

7- ایک یا تمام انگلیاں چہرے پر دباؤ کے ساتھ چھریے، اس سے کشیدگی یا درد دور ہو جائے گا۔ جب بھی چہرے میں کشیدگی یا دھکن محسوس ہو، یہ عمل دہرائیے۔

8- ہونٹ کھینچ کر جتنا ممکن ہو چمکی کا سامنے بنا کر باہر نکالیں۔ اس کے ساتھ آنکھیں زور سے بند کریں اور اپنے گال اندر کی طرف کھینچ لیں۔ اس ورزش سے پورے منہ کے عضلات تن جائیں گے۔

ان ورزشوں سے چہرے کی جھریاں دور ہو جائیں گی۔ وہ خواتین جن کے چہرے پر زیادہ عمر کی وجہ سے جھریاں پڑ گئی ہیں، ان ورزشوں پر عمل کر کے کم عمر نظر آ سکتی ہیں۔

